جمع القرآن

مولانا محمد علی صاحبؒ کی کتاب 'جمع القرآن' کی اشاعت پہلی مرتبہ 1917 میں ہوئی۔
ذیل میں اسکا نیاء ایڈیشن پیش کردہ ہے، جو آپکی تفسیر 'بیان القرآن' کے USA سے شائع کردہ
2015 کے ایلکٹرونک (electronic) ایڈیشن میں شامل کیا گیا تھا۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝٩

جمع القرآن الکریم

مولف

مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام امریکہ

فہرست جمع قرآن

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	**قرآن کریم کے لیے حفاظت الٰہی کا وعدہ**	I-10
2	حفاظت قرآن کے متعلق عیسائیوں کا اعتراف	I-10
3	وعدۂ حفاظت اور ''الذکر'' سے مراد	I-10
4	حفاظت قرآن پر ابتدا سے اہل اسلام کا ایمان	I-11
5	ایفائے وعدہ کے ثبوت	I-12
6	اَطْوَلُکُنَّ یَدًا کی پیشگوئی اور اس کی تاویل	I-12
7	اہل اسلام کی حق گوئی	I-13
8	عدم تحریف کا یقینی ثبوت	I-14
9	واقعہ حدیبیہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اعتراض	I-14
10	رفع قرآن کا مطلب	I-16
11	**قرآن کریم کا تحریر میں لایا جانا**	I-18
12	قرآن کریم کی ہر آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی	I-18
13	میور کی شہادت	I-18
14	قرآن لکھا جانے پر اندرونی شہادت	I-18
15	کوئی حصہ قرآن کا ایسا نہیں جو لکھا نہ گیا ہو	I-19
16	کفار سے تحدی میں قرآن کے لکھے جانے کی شہادت	I-20
17	احادیث کی شہادت کہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت اپنے اپنے موقع پر لکھوائی	I-21
18	کاتبان وحی	I-21
19	احادیث کے تحریر میں لانے کی ممانعت	I-22
20	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعہ میں قرآن کے لکھا جانے کی شہادت	I-22
21	حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے جمع قرآن میں تحریر کی تلاش	I-23
22	طرز تحریر وہی رہی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھی	I-24
23	**نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حفظ قرآن**	I-26
24	قرآن کریم کا حفظ کرنا	I-26
25	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ رضی اللہ عنہ کو حفظ و تعلیم قرآن کی طرف رغبت دلانا	I-27
26	احادیث میں حفظ قرآن کی تاکید	I-28
27	عہدۂ امامت حاصل کرنے میں تحریص حفظ قرآن	I-29

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
28	کثرت تلاوت قرآن میں آنحضرت ﷺ کا نمونہ	I-30
29	ختم قرآن کی معیاد سے حفظ قرآن کی شہادت	I-31
30	صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حافظانِ قرآن کی کثرت	I-32
31	حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت علم قرآن میں	I-32
32	حافظان قرآن کے نام	I-33
33	قوم خزرج کے چار جامعین قرآن	I-34
34	نماز سے حفظ قرآن میں مدد	I-35
35	**آیتوں اور سورتوں کی ترتیب**	I-38
36	ترتیب نزول اور ترتیب جمع	I-38
37	قرآن کریم کی شہادت کہ ترتیب جمع قرآن وحی الٰہی سے ہوئی	I-38
38	حل طلب سوالات	I-40
39	ولیم میور کا اعتراض اور اس کا جواب	I-40
40	آیات کی ترتیب کی قطعی شہادت	I-42
41	ترتیب آیات، ترتیب نزولی سے جداگانہ تھی	I-43
42	موجودہ ترتیب آیات ترتیب نبوی ہے	I-43
43	احادیث میں حوالہ سے ترتیب کا ثبوت	I-45
44	حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نزول کے مطابق ترتیب دینا	I-46
45	تلاوت وحفظ قرآن بغیر ترتیب سور، ناممکن تھا	I-47
46	قرآن شریف کی سات منزلوں سے ترتیب سور پر دلیل	I-48
47	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شہادت کہ ترتیب نزولی اصل ترتیب قرآنی نہیں	I-49
48	نمازوں میں ترتیب سور ملحوظ نہ رکھی جاتی تھی	I-50
49	تالیف ابن مسعود رضی اللہ عنہ	I-51
50	سیدنا اُبی بن کعب اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما کی ترتیب مرفوعہ	I-52
51	سورۂ انفال اور توبہ کا تعلق	I-53
52	**مصاحف سیدنا ابو بکر و سیدنا عثمان رضی اللہ عنہما**	I-55
53	حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن میں کیا کام کیا	I-55
54	زید رضی اللہ عنہ کا جمع مسودات قرآن پر مامور ہونا	I-56
55	روایت جمع سے چند نتائج	I-57
56	جمع مسودات پر بحث	I-58
57	جمع مسودات کی مشکلات	I-59
58	جمع ابو بکر رضی اللہ عنہ میں اصلی مسودات کو جمع کیا گیا	I-60
59	جمع مسودات میں آنحضرت ﷺ کی جمع کی پیروی کی گئی	I-61
60	حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مجموعہ صحفِ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی پیروی کی	I-62

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
61	حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو کیا ضرورت پیش آئی	I-63
62	حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کو مطابق محاورہ قریش لکھوایا	I-65
63	صحائف عثمانی صحف ابو بکر رضی اللہ عنہ کی محض نقل تھے	I-66
64	حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کارروائی میں صحابہ شامل تھے	I-67
65	ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی عدم شرکت	I-69
66	**اعتراضوں کے جواب**	I-72
67	حفاظت قرآن کریم پر چھ قسم کے اعتراض	I-72
68	بعض فقرات کے نامکمل ہونے کا اعتراض	I-72
69	بحیثیت مجموعی اعتراضات ایک دوسرے کے مؤید نہیں ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں	I-73
70	اُبی رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصاحف	I-74
71	مخالف کا اعتراف کہ مصحف عثمانی ہی اصل ہے	I-75
72	مجنون معترضین	I-76
73	مصحف ابی رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مطابقت صحف عثمانی سے	I-76
74	حدیث کے چار طبقے اور پایہ تصانیف جلال الدین سیوطی	I-77
75	حفد اور خلع	I-79
76	دعائے قنوت قرآن کریم کا حصہ نہیں	I-79
77	ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اختلاف	I-80
78	معوّذتین جزو قرآن ہیں	I-82
79	جمع زید رضی اللہ عنہ میں کمی بیشی کے امکان کا خیال خلاف واقعات ہے	I-83
80	قرآن میں نہ کچھ بڑھایا گیا نہ کچھ گھٹایا گیا	I-84
81	نتائج کی بنیاد احادیث کی مجموعی شہادت پر رکھی جاسکتی ہے	I-85
82	وہ روایات جن میں یہ ذکر ہے کہ فلاں سورت یا آیت قرآن میں تھی اب نہیں ہے	I-86
83	ان پانچ روایات کی تردید دوسری صحیح احادیث سے ہوتی ہے	I-87
84	حدیث ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کے راویوں پر بحث	I-88
85	اس حدیث کے خلاف مسلم کی اپنی شہادت	I-88
86	روایت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ پر اندرونی شہادت	I-90
87	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی روایت رضاع پر بحث	I-91
88	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت رجم	I-92
89	ایسی روایات کس طرح مروج ہوئیں	I-94
90	ایسی سب روایات صرف اکیلے آدمی کی شہادت بیان کرتی ہیں	I-94
91	آیات قرآنی میں ایک آدمی کی شہادت وزن نہیں رکھتی	I-95
92	تعامل اور تواتر قومی ان روایتوں کو غلط ٹھہراتا ہے	I-95
93	بعض شیعوں کا اعتراض اور میور کا جواب	I-97

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
94	محققین اہل تشیع حفاظت قرآن کے قائل ہیں	I-97
95	مابین الدفتین کے اصلی ہونے پر اجماع	I-99
96	ڈاکٹر منگانا کے تین قدیم قرآنوں کے اوراق	I-100
97	کاتبوں کی غلطیاں	I-101
98	مسودات منگانا کے متعلق قیاسات	I-101
99	پڑھنے والوں کا تعصب	I-102
100	ان مسودات کے اختلافات، اختلافات قراءت میں سے نہیں	I-103
101	ان مسودات کے کاتبوں کی ناواقفیت	I-103
102	قسم دوئم کے اختلافات	I-104
103	قسم اوّل کے اختلافات	I-107
104	اختلافات کی قسم سوم	I-107
105	**سبعۂ احرف اور اختلاف قراءت**	I-109
106	اختلاف قرات سے حفاظت قرآن پر دو اعتراض	I-109
107	سبعۂ احرف سے مراد	I-109
108	اختلاف حروف والی احادیث	I-109
109	سات حروف پر قرآن پڑھنے کی اجازت کب ہوئی	I-112
110	اکیس سال تک قرآن شریف ایک ہی حرف پر لکھا اور پڑھا جاتا رہا	I-114
111	بعد کا اختلاف صرف طرز ادا میں تھا	I-114
112	اجازت کی غرض سہولت دینا تھا	I-115
113	اختلافات حروف نہایت خفیف تھے	I-116
114	حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ہشام کا اختلاف	I-117
115	سات حروف سے کیا مراد ہے؟	I-118
116	آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمازوں میں قرآن شریف کو نزول اوّل کے مطابق ہی پڑھتے رہے اور ایک ہی حرف پر لکھواتے رہے	I-119
117	قرآن مجید باوجود اختلاف حروف کے ایک ہی تھا اور ایک ہی رہا	I-120
118	سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی کارروائی مطابق منشائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حفاظت قرآن کے لیے تھی	I-121
119	ایک ہی قرآن پر سب کا اتفاق	I-122
120	دوسری قراءتوں سے مراد	I-123
121	سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد کی قراءتیں	I-124
122	نقطوں اور حرکات کا وجود حافظہ میں	I-125

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

((نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ))

جمع قرآن

قرآن کریم کے لیے حفاظت الٰہی کا وعدہ

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾ [الحجر: 15]

ترجمہ: ''اس قرآن کو ہم نے (محمد ہی پر) اتارا ہے اور اس کی حفاظت ہم خود ہی کریں گے۔''

❀ حفاظت قرآن کے متعلق عیسائیوں کا اعتراف

قرآن کریم کی حفاظت کا وعدۂ الٰہی جو آیت مندرجہ عنوان میں دیا گیا ہے جس عظمت اور صفائی کے ساتھ اس کے پورا ہونے کی حقیقت دنیا پر آج تک ثابت اور ظاہر ہوئی ہے وہ ایسی روز روشن کی طرح چمکتی ہے کہ بڑے بڑے مخالفین قرآن کریم بھی اس کی واقعیت اور حقیقت پر بیساختہ شہادت دے اٹھے ہیں۔ ہم اس جگہ ایک مخالف کے الفاظ ہی نقل کرنے پر کفایت کریں گے جس کا نام سر ولیم میور ہے۔ اور جس نے اسلام کی مخالفت کے لیے کتاب لائف آف محمد لکھی اور شائع کی تھی۔ اس کتاب کے دیباچہ کے صفحہ 21، طبع سوم پر اس نے قرآن کریم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو اس (قرآن کریم) کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو''۔ اور پھر ایک دوسرے عیسائی وان ہیمر کا قول نقل کرتا ہے کہ ''ہم ایسے یقین کے ساتھ قرآن (شریف) کو بعینہٖ محمد (ﷺ) کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ مسلمان اسے اللہ کا کلام سمجھتے ہیں۔ جس میں صاف اعتراف اس بات کا پایا جاتا ہے کہ جو قرآن شریف اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ بلا کم وکاست وہی قرآن کریم ہے جو آنحضرت ﷺ نے دیا تھا۔ اور اس کی کسی عبارت یا کسی لفظ میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی''۔

❀ وعدۂ حفاظت اور ''الذکر'' سے مراد

یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے اسباب اور حالات تھے جن کی وساطت سے یہ مقدس ترین کتاب ہمیں بغیر کسی تحریف اور آمیزش کے ٹھیک اسی طرح پہنچی جس طرح ہمارے سید و مولیٰ حضرت محمد مصطفی ﷺ پر نازل ہوئی تھی۔ ان اسباب کا تعلق مذہب اسلام کی تاریخ کے دو مختلف زمانوں کے ساتھ ہے۔ یعنی اول زمانۂ حیات نبی کریم ﷺ اور دوسرا زمانۂ خلفائے راشدین جنہوں نے کمال دیانت اور امانت کے ساتھ اس مقدس کلام کو آئندہ نسلوں تک ٹھیک اسی طرح پہنچایا جس طرح آنحضرت ﷺ نے اسے چھوڑا تھا۔ 1905ء میں پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی لاہور کی طرف سے ایک کتاب مسمی بہ تاویل القرآن اردو زبان میں شائع ہوئی تھی۔ جس کے

مصنف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ اس کتاب میں گمنام مصنف نے آیت مذکورہ عنوان کے متعلق بھی خامہ فرسائی کرنے کی جرأت کی ہے اور لکھا ہے کہ اس آیت میں ''الذکر'' سے مراد مطلق قرآن شریف نہیں۔ بلکہ تمام کتب سماوی مراد ہیں۔ پس ان اسباب کو بیان کرنے سے پہلے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ''تاویل القرآن'' کی غلطی کو ظاہر کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ لفظ ذکر جیسا قرآن شریف کے لیے بولا گیا ہے۔ دوسری کتب سماوی کے لیے بھی بولا گیا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ آیا اس خاص موقعہ پر جہاں آیت زیر بحث میں یہ لفظ آیا ہے وہاں مراد اس سے قرآن کریم ہے یا جملہ کتب سماویہ۔ سو خود قرآن کریم کے پڑھنے سے اور آیت زیر بحث ما قبل اور مابعد پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ آیت مذکورہ سورۂ حجر کی نویں آیت ہے اور سورۂ شریفہ ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے: ﴿الٓرٰ ۟ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ﴾ اور پھر چھٹی آیت سے آیت زیر بحث تک کلام الٰہی میں یوں وارد ہوا ہے:

﴿وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ [الحجر: 9-6]

''اور کافروں نے کہا کہ اے شخص جس پر الذکر اتارا گیا ہے۔ تو تو دیوانہ ہے۔ اگر تو سچا ہے تو فرشتوں کو ہمارے سامنے کیوں نہیں لا کھڑا کرتا۔ ہم فرشتوں کو نہیں بھیجا کرتے مگر فیصلہ کے لیے اور (جب فرشتے نازل ہوں گے تو) پھر ان کو مہلت بھی نہ ملے گی۔ بیشک ہم ہی نے الذکر اتارا ہے اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت بھی کریں گے''۔

ان چار آیتوں میں دو جگہ لفظ الذکر آیا ہے۔ اور سلسلہ کلام سے ظاہر ہے کہ جو کچھ الذکر سے پہلے یعنی چھٹی آیت میں مراد ہے وہی مراد آخری یعنی نویں آیت یا آیت زیر بحث میں ہے۔ لیکن پہلی جگہ لفظ الذکر سے صاف مراد قرآن شریف ہے۔ وہی قرآن مبین جس کا ذکر شروع سورہ میں ہے۔ کیونکہ کافروں کا خطاب صرف آنحضرت ﷺ سے ہے۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ﴾ سے یقینا محمد رسول اللہ ﷺ مراد ہیں۔ پس الذکر سے مراد قرآن شریف ہی ہوا نہ جملہ کتب سماوی۔ اور یہی مراد اس لفظ سے دونوں جگہ ہے۔ اسی بات کی تائید قرآن کریم کی اور آیات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً: سورۂ حم السجدہ کی آیات 42-41 میں بعینہٖ اسی مضمون کو دہرایا گیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝﴾ [حم السجدة: 42-41]

''جن لوگوں کے پاس الذکر (یعنی قرآن) آیا اور انہوں نے اس کو نہ مانا (وہ بھی اپنا انجام کار دیکھ لیں گے) اور یہ (قرآن) تو بڑے پایہ کی کتاب ہے کہ جھوٹ نہ تو اس کے آگے (ہی کی طرف) اس کے پاس پھٹکنے پاتا ہے۔ اور نہ اس کے پیچھے (کی طرف) سے (کیونکہ) حکمت والے سزاوار حمد (وثنا یعنی اللہ) کی اتاری ہوئی ہے۔''

ایسے ہی اور بھی کئی آیات ہیں جو صاف طور سے اعلان کر رہی ہیں کہ قرآن شریف میں شروع سے ہی یہ الٰہی وعدہ ہے کہ خدا تعالیٰ اس کو ہر قسم کی تحریف، آمیزش، تغیر و تبدل اور بربادی سے ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھے گا۔

❀ حفاظت قرآن پر ابتدا سے اہل اسلام کا ایمان

ابتدائی زمانہ سے ہی مسلمانوں کا یہ اعتقاد چلا آتا ہے کہ ان آیات میں خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کو ہر قسم کے حملوں اور تصرف سے محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ حضرت مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ جو تابعین میں سب سے پہلے مفسر قرآن ہیں۔ وہ بھی اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ آیت ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ [الحجر: 9] اور آیت: ﴿لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ

حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿٤٢﴾ [حم السجدة: 42] سے یہی مطلب ہے کہ اس کلام پاک میں کوئی ایسا لفظ نہیں ڈالا جائے گا جو کلام الٰہی نہ ہو۔ اور نہ ہی کوئی حصہ کلام الٰہی اس میں درج ہونے سے رہ جائے گا یا درج ہونے کے بعد نکالا جا سکے گا۔ ایسا ہی یہ دونوں بزرگ اور ان کے علاوہ تمام مفسرین قرآن کریم اس بات پر متفق ہیں کہ الذکر سے مراد ان دونوں آیات میں قرآن کریم ہی ہے۔[1]

غرض یہ ایک بین اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم کے پہلے اور پچھلے مفسرین حفاظت قرآن کریم کے متعلق وہی اعتقاد رکھتے تھے جو آج کل مسلمانوں میں متفقہ طور پر مروج و مسلم ہے اور اس امر کی کافی شہادت موجود ہے۔ اب ایسی صریح اور ثابت شدہ حقیقت پر جو آفتاب نصف النہار کی طرح چمک رہی ہے۔ بے اعتباری کا پردہ ڈالنا ایک بیہودہ اور احمقانہ کوشش نہیں تو اور کیا ہے؟

❀ ایفائے وعدہ کے ثبوت

مصنف تاویل القرآن نے یہ بھی لکھا ہے کہ کسی وعدے کا وجود اس بات کو ثابت نہیں کر سکتا کہ اس کا ایفاء بھی ہو گیا اور اس کے لیے وہ خود ثبوت نہیں ہو سکتا۔ ان کے اس خیال کے ساتھ تو ہم اتفاق کرتے ہیں۔ لیکن انہیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس وعدے کے ساتھ ایسے واقعات موجود ہیں جن پر نگاہ انصاف ڈالنے سے صاف طور پر عیاں ہوتا ہے کہ اس وعدہ کا ایفاء نہایت صفائی اور عمدگی کے ساتھ ہوا ہے۔ کیونکہ اگر یہ وعدہ پورا نہ ہوا ہوتا اور قرآن کریم میں کسی قسم کا تغیر و تبدل داخل ہو گیا ہوتا۔ تو ان دو باتوں سے ایک ضرور واقع ہوتی یعنی یا تو جن لوگوں نے ان تصرفات و تغیرات کو دیکھا تھا یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین وہ اس کے کلام الٰہی ہونے کا انکار کرتے یا ان آیات بینات کی جن میں حفاظت قرآن کا وعدہ ہے۔ موجودہ تفسیر کے سوا کوئی اور تعبیر و تاویل کرتے۔ لیکن یہ یقینی اور قطعی بات ہے کہ اس وجہ پر کسی نے قرآن شریف کے کلام الٰہی ہونے سے انکار نہیں کیا۔ اول تو ارتداد ہی شاذ و نادر تھا۔ مگر اس بنا پر کہ یہ وعدہ پورا نہیں ہوا کوئی بھی مرتد نہیں ہوا۔ اور نہ کسی صحابی نے آیات وعدہ حفاظت قرآن کی کوئی اور تفسیر یا تاویل کی۔ بلکہ سب کے سب بالاتفاق اسی اعتقاد پر جمے رہے اور ایک صحابی کا نام بھی نہیں بتایا جا سکتا جس نے ان دو شقوں میں سے کوئی ایک اختیار کی ہو۔ بلکہ جن معنوں کا پتہ ہمیں تابعین سے ملتا ہے جن کے معلم اجلہ صحابہ تھے وہ وہی معنی ہیں جو ہم نے اوپر اختیار کیے ہیں۔ اور جن کی بنا پر شروع سے لے کر آج تک تمام مسلمان قرآن کی حفاظت کے الٰہی وعدے کو سچا یقین کرتے چلے آئے ہیں۔ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان لفظوں کے یہی معنی کرتے تھے۔ ان کے سوا کوئی اور مطلب ان الفاظ کا ان سے کہیں ثابت نہیں۔ اگر وہ ان الفاظ کے کوئی اور معنی کر جاتے تو ضرور تھا کہ وہ ہم تک بھی پہنچتے۔

❀ أَطْوَلُكُنَّ يَدًا کی پیشگوئی اور اس کی تاویل

جیسا کہ ایک اور پیشگوئی کی تفسیر اور معنی بیان کرنے میں ہوا۔ اور وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کو مخاطب کر کے فرمایا: «أَسْرَعُكُنَّ لَحَاقًا بِي أَطْوَلُكُنَّ يَدًا». جس کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ ''تم میں سے مجھے وفات پا کر وہی پہلے ملے گی جس کے لمبے ہاتھ ہیں۔'' چنانچہ وہ حدیث جو صحیح مسلم میں بروایت ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا درج ہے ذیل میں نقل کی جاتی ہے:

((عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَسْرَعُكُنَّ لَحَاقًا بِي أَطْوَلُكُنَّ يَدًا». قَالَتْ: فَكُنَّ يَتَطَاوَلْنَ أَيَّتُهُنَّ أَطْوَلُ يَدًا. قَالَتْ: فَكَانَتْ أَطْوَلَنَا يَدًا زَيْنَبُ لِأَنَّهَا كَانَتْ تَعْمَلُ بِيَدِهَا وَتَصَدَّقُ.))[2]

1- تفسیر ابن جریر: (4/6، و24/71-72)

2- صحیح البخاری: 1420؛ صحیح مسلم: 6470؛ واللفظ للمسلم.

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''تم میں سے مجھ کو جلدی وہ ملے گی جس کے ہاتھ لمبے ہیں۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: یہ بات سن کر تمام ازواج مطہرات اپنے اپنے ہاتھ اس بات کے دریافت کرنے کے لیے ناپنے لگیں کہ کس کے سب سے لمبے ہاتھ ہیں۔ پھر آخر کار زینب کے ہاتھ اس کی سخاوت کی وجہ سے اس حدیث کے منشا کے مطابق سب سے لمبے ثابت ہوئے۔

ان مقدس بیبیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بات سن کر اس کے یہی معنی سمجھے کہ گویا اس سے مراد جسمانی طور پر لمبے ہاتھ ہیں۔ اور اسی لیے غلط فہمی سے ایک دوسرے کے ہاتھوں کو ناپنا شروع کر دیا۔ لیکن احادیث کی کتابیں ایسی احتیاط اور امانتداری سے لکھی گئی ہیں کہ کسی قسم کی رعایت کے بغیر تمام امور کو درج کر دیا گیا ہے ان کی یہ غلطی بھی حدیثوں میں صاف طور پر درج ہے اور اس کے صحیح معنی بھی کھلے طور پر لکھے ہوئے موجود ہیں۔ چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کے معنی یہ لکھے ہیں: معنی الحدیث:

"أَنَّهُنَّ ظَنَنَّ اَنَّ الْمُرَادَ بِطُوْلِ الْيَدِ طُوْلَ الْيَدِ الْحَقِيْقَةِ وَهِيَ الْجَارِحَةُ فَكُنَّ يَذْرَعْنَ اَيْدِيَهُنَّ بِقَصَبَةٍ فَكَانَتْ سَوْدَةُ اَطْوَلُهُنَّ جَارِحَةً وَكَانَتْ زَيْنَبُ اَطْوَلُهُنَّ يَدًا فِي الصَّدَقَةِ وَفِعْلِ الْخَيْرِ، فَمَاتَتْ زَيْنَبُ أَوَّلُهُنَّ، فَعَلِمُوْا أَنَّ الْمُرَادَ طُوْلُ الْيَدِ: فِي الصَّدَقَةِ وَالْجُوْدِ. قَالَ أَهْلُ اللُّغَةِ: يُقَالُ: فُلَانٌ طَوِيْلُ الْيَدِ، وَطَوِيْلُ الْبَاعِ، اِذْ كَانَ سَمْحًا جَوَادًا".[1]

یعنی اس حدیث کے یہ معنی ہیں کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں نے یہی سمجھا تھا کہ لمبے ہاتھوں سے مراد فی الحقیقت ظاہری طور پر لمبے ہاتھ ہی ہیں۔ اور اس لیے انہوں نے اپنے ہاتھوں کی لمبائی کو ناپنا شروع کر دیا۔ ناپنے سے معلوم ہوا کہ آنحضرت کی بیوی سودہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ سب سے لمبے تھے۔ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا صدقہ و خیرات میں سب سے کھلا ہاتھ رکھتی تھیں۔ اور وہی سب سے پہلے فوت ہوئیں۔ اس وقت ان کو معلوم ہو گیا کہ اس حدیث کے اصل معنی یہ تھے کہ لمبے ہاتھوں سے مراد سخاوت اور خیرات اور صدقہ میں سب سے سبقت اور فوقیت تھی۔ اہل لغت ایسے فقرات کے یہی معنی کرتے ہیں۔ چنانچہ جب کہتے ہیں کہ [فُلَانٌ طَوِيْلُ الْبَاعِ یا فُلَانٌ طَوِيْلُ الْيَدِ] تو اس سے یہی مراد ہوتی ہے کہ فلاں شخص بہت بڑا سخی اور فیاض طبع ہے۔

ایسا حضرت امام بخاری اور مشہور و معروف صاحب فتح الباری بھی اس امر پر متفق ہیں کہ اس حدیث کے معنی ازواج مطہرات نے پہلے یہی سمجھے تھے۔ لیکن بعد میں ان پر منکشف ہو گیا کہ اس کے معنی وہ نہیں جو انہوں نے سمجھے ہوئے تھے۔ بلکہ سخاوت اور فیاضی میں سبقت مراد تھی۔ (دیکھو بخاری باب صدقات)

❀ اہل اسلام کی حق گوئی

غرض اسلامی لٹریچر میں دین کو ایسا مقدم رکھا گیا ہے کہ کسی شخص نے کسی کی کبھی کچھ رعایت نہیں کی اور نہ ہی کسی امر کی پاس خاطر سے کبھی کسی امر کا اخفا کیا گیا۔ یا کسی امر کو کم و بیش کر کے لکھا گیا۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں نے ایک حدیث کے سمجھنے میں غلطی کھائی۔ تو اکثر معتبر کتابوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک پیشگوئی تھی۔ اگرچہ یہ پیشگوئی قرآن کریم کا کوئی حصہ نہ تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمائی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اپنے صحیح منطوق کے ساتھ پوری ہوئی۔ یعنی ام المومنین زینب رضی اللہ عنہا جو جود و سخا اور کرم و فیض میں سب بیویوں سے بڑھی ہوئی تھیں سب سے پہلے فوت ہوئی اور سودہ رضی اللہ عنہا پہلے فوت نہ ہوئیں۔ جن کے ہاتھ جسمانی طور پر

1- شرح الإمام النووی، تحت حدیث رقم: 2452

لمبے تھے جب کہ ایسی معمولی درجہ کی باتوں کے اختلافات اور معانی احادیث میں اس قدر دیانت داری اور احتیاط کے ساتھ درج ہیں۔ تو قرآن کریم کی حفاظت کے وعدوں کی آیات جو ایک پہلو سے اصول اسلام میں شمار ہوتی ہیں اور ایسی اہم اور ضروری ہیں کہ ہر ایک کو ان کے معانی کے ساتھ بڑا بھاری تعلق ہے۔ تو ایسے اہم امر کی متعلقہ آیات کے لفظی معنوں اور اس عظیم الشان وعدہ کے ظاہری رنگ میں پورا ہونے میں ذرا بھی اختلاف وانحراف واقعہ ہوتا تو نہایت ضروری تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت کثیر اس طرف جاتی اور اس پیشگوئی سے مراد اس کا ظاہری الفاظ میں پورا ہونا نہیں بلکہ اس سے کچھ اور مطلب ہے۔ اور وہ مطلب بیان کرتے اور آئندہ نسلوں کو اس سے مطلع کرتے۔ لیکن حدیث کے اتنے بڑے ذخیرے میں کہیں کسی جگہ صحیح اور مستند تو کیا کوئی ضعیف سے ضعیف حدیث بھی اس بات کی تائید میں نہیں ملتی۔ جس میں صراحت نہ سہی اشارہ ہی ہو کہ یہ وعدہ الٰہی اپنے ظاہری معنوں میں پورا نہ ہوا اور اس کی تاویل یہ کی گئی۔

❀ عدم تحریف کا یقینی ثبوت

کسی حدیث میں اس بات کا صراحتاً یا کنایۃً ذکر نہ ہونا قرآن کریم کے محفوظ رہنے کی ایک ایسی زبردست دلیل ہے کہ اس کے بعد کسی اور دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ اور اس سے قطعی اور یقینی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے اور ان کی زندگیوں میں ایک حرف کی بھی تحریف یا تغیر و تبدل یا کمی زیادتی نہیں ہوئی۔ بلکہ صحابہ کرام کے بعد بھی ہم یہی بات دیکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ بزرگ قوم تابعین جنہوں نے بڑی محنتوں اور مشکلات سے محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور دین کی خاطر صحابہ سے قرآن شریف سیکھا تھا اور احادیث حاصل کی تھیں اور ان کی صحبت سے بہرہ اندوز ہوئے تھے۔ اس امر پر متفق ہیں کہ ان آیات سے یہی مراد ہے کہ قرآن شریف میں کوئی تصرف اور آمیزش کبھی راہ نہ پائے گی۔ اور اللہ اس کی نگہبانی کرتا رہے گا۔ اس تمام تحریر سے یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب قرآن شریف کی حفاظت کی پیشگوئی مندرجہ قرآن کریم کا پورا ہونا ظاہری الفاظ کے موافق مانتے تھے اور اس پر یقین کامل رکھتے تھے کہ یہ کلام الٰہی ہے اور یہ وعدہ الٰہی ہے۔ اگر کسی طرح سے وہ اس وعدۂ الٰہی میں تجاوز محسوس کرتے اور اس بات کو دیکھ پاتے کہ قرآن شریف میں کوئی تصرف اور تحریف کسی طرح سے واقعہ ہو گیا ہے تو ایسے جوانمرد اور راستبازی کے عاشق سچائی کے حامی اور شیدائی کبھی خاموشی اختیار نہ کرتے۔ لیکن ساری تواریخ کے اوراق دیکھ لو کہیں ایک حرف بھی ایسا نہ پاؤ گے کہ جس سے اشارۃً ہی اس کی تائید ہوتی ہو۔ کہیں یہ نہیں دیکھو گے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت بلکہ ان کے کسی ایک فرد متنفس نے بھی اس وجہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت پر حرف رکھا ہو۔

اسلامی تواریخ دوسرے مذاہب کی تاریخ کی طرح مخفی اور تاریک نہیں۔ بلکہ نہایت مکمل اور مفصل اور معتبر تاریخ موجود ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا سراسر غلط اور دھوکا ہو گا کہ ایسا عظیم الشان اور اہم امر واقعہ ہوا ہو اور چھوڑ دیا گیا ہو۔ یا وہ متاخرین کی نظروں سے ہی مخفی رہا ہو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسے لوگ نہ تھے کہ اس پیشگوئی کو بظاہر ناکام دیکھ لیتے اور خاموش بیٹھے رہتے۔ وہ ایسے دلیر اور سچائی کے لیے شجاع تھے کہ اگر کہیں ذرہ سا شک بھی ان کی طبیعت میں کسی امر پر پیدا ہوتا تو وہ بہت آزادی سے بیان کرتے۔ یہاں تک اگر کوئی شبہ یا وسوسہ ان کے دلوں میں کسی وقت رہگیر ہوتا تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں بھی بآزادی تمام پیش کر دیتے تھے اور کبھی نہ رکتے تھے۔

❀ واقعہ حدیبیہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا اعتراض

ہم ان کی اس جرأت ایمانی کے متعلق بطور مثال ایک واقعہ کو پیش کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رؤیا میں دیکھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مع جماعت طواف بیت اللہ کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ رؤیا منجانب اللہ تھا اس لیے چودہ سو سے کچھ زیادہ جماعت صحابہ لے کر

آپ (ﷺ) مدینہ سے مکہ معظمہ کی طرف بارادہ حج روانہ ہوپڑے۔ لیکن جب آپ ﷺ مع جماعت حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو قریش مکہ اپنی جمعیت لے کر مقابلہ کے لیے آگئے اور مزاحم ہوئے اور کہا کہ ہم اس سے آگے تمہیں بڑھنے نہیں دیں گے۔

بہت ساری قیل و قال کے بعد اس مقام پر فریقین کے درمیان صلح تجویز ہوئی جس کا نام صلح حدیبیہ ہے۔ اس صلح کی رو سے نہ صرف آنحضرت ﷺ کو وہیں سے مدینہ کی طرف واپس ہونا پڑا بلکہ اور بھی بعض ایسی باتیں منظور کرنی پڑیں جو صحابہ کو ناگوار گزریں۔ یہ شرائط عام طور پر مسلمانوں پر شاق گزریں کیونکہ انہیں حج کرنے کے بغیر وہیں سے واپس جانا پڑا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمانوں کے خیالات کو بدیں الفاظ پیش کیا:

((فَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: فَأَتَيْتُ نَبِيَّ اللهِ ﷺ فَقُلْتُ: أَلَسْتَ نَبِيَّ اللهِ حَقًّا؟ قَالَ: «بَلَى». قُلْتُ: أَلَسْنَا عَلَى الْحَقِّ وَعَدُوُّنَا عَلَى الْبَاطِلِ؟ قَالَ: «بَلَى». قُلْتُ: فَلِمَ نُعْطِي الدَّنِيَّةَ فِي دِينِنَا إِذًا؟ قَالَ: «إِنِّي رَسُولُ اللهِ، وَلَسْتُ أَعْصِيهِ وَهُوَ نَاصِرِي». قُلْتُ: أَوَلَيْسَ كُنْتَ تُحَدِّثُنَا أَنَّا سَنَأْتِي الْبَيْتَ فَنَطُوفُ بِهِ؟ قَالَ: «بَلَى! فَأَخْبَرْتُكَ أَنَّا نَأْتِيهِ الْعَامَ». قَالَ: قُلْتُ: لاَ. قَالَ: «فَإِنَّكَ آتِيهِ وَمُطَّوِّفٌ بِهِ».))[1]

یعنی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا پس میں رسول اللہ ﷺ کے حضور میں حاضر ہوا اور عرض کیا، یارسول اللہ! کیا آپ اللہ کے برحق رسول نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں بے شک میں اللہ کا رسول برحق ہوں۔'' پھر میں نے عرض کیا، کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں بیشک!'' پھر میں نے عرض کیا، تو پھر کیا وجہ ہے کہ ایسی مضر شرائط قبول کریں جو ہمارے دین کو نقصان پہنچانے والی ہیں؟ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس میں کچھ شک نہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور میں اس کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتا اور وہی میرا مددگار ہے۔'' میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا آپ نے یہ نہ فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ میں پہنچیں گے اور طواف کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! لیکن کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم اسی سال وہاں پہنچیں گے؟'' پھر میں نے جواب دیا نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''بیشک تم بیت اللہ میں پہنچو گے اور طواف کرو گے۔''

اب جائے غور ہے کہ جو جرأت اور استقلال اور ہمت خدا تعالیٰ نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو عطا کی ہوئی تھی اس سے دنیا میں کوئی شخص بے خبر نہیں ہو سکتا۔ اور جس طرح وہ آنحضرت ﷺ کے فدائی خادم تھے وہ بھی تمام جہان کو معلوم ہے۔ ایسا جلیل القدر انسان اپنے آقا اور مخدوم کی خدمت میں صرف اتنی بات پر اتنی بڑی جرأت سے بھرے ہوئے سوال کرتا ہے اور وہ بات ہی کیا تھی۔ صرف یہی کہ آنحضرت ﷺ نے کفار مکہ کے روکنے سے حج کے ارادہ کو سال آئندہ پر ملتوی کر دیا تھا اور صلح کی شرائط منظور کر کے حدیبیہ ہی سے مدینہ کی طرف مراجعت کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ جب ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایمان آنحضرت ﷺ پر دیکھتے ہیں اور ان کی اس بات پر غور کرتے ہیں کہ وہ سچے دل سے آپ ﷺ کو اللہ کی طرف سے سمجھتے تھے اور یہ بھی جانتے اور مانتے تھے کہ وہ جو کام کرتے ہیں اللہ ہی کے حکم سے کرتے ہیں۔ پھر ایسے ایمان کے باوجود ایسے سوالات سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ وہ لوگ حق کے لیے ایسے بہادر تھے کہ ذرا سی بات کو بھی یوں ہی نہ چھوڑتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس وقت تک صبر نہ کیا جب تک کہ ان کی خاطر خواہ تسلی نہ ہو گئی اور امر حق ان کو نہ معلوم ہو گیا کہ حضور سرور کائنات ﷺ کا رؤیا بالکل صحیح اور حق تھا۔ لیکن اس میں یہ شرط نہ تھی کہ حج اسی سال میں ہو گا۔ بلکہ اس میں صرف حج کا وعدہ دیا گیا تھا جس کا وقت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم تھا اور محض حدیبیہ سے لوٹ جانے اور اس سال میں حج کرنے سے قاصر رہنے سے یہ نہیں قرار دیا جا سکتا کہ وہ رؤیا غلط تھا۔ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو یہ ایک ہی حدیث اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے

1- صحيح البخاری: 2731، 2732

کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جب کبھی کسی امر میں شبہ یا وسوسہ پیدا ہوتا تو ان کی عادت تھی کہ نہایت آزادی کے ساتھ اس کو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں پیش کر دیتے۔ اور جب تک تسلی نہ ہوتی خاموش نہ ہوتے۔ اس لیے یہ یقینی بات ہے کہ اگر قرآن شریف میں ذرا تحریف یا تغیر و تبدل واقع ہوتا تو اس پیشگوئی کی صداقت پر بہت زبردست اعتراض ان کی طرف وارد ہوتے۔ اور یہ ضروری تھا کہ ایسے اعتراضات آئندہ نسلوں میں بھی مشتہر اور معروف ہوتے۔ لیکن تمام اسلامی کتب میں کہیں کوئی ایسی روایت موجود نہیں۔ اس سے صاف طور پر پایا جاتا ہے کہ کبھی کوئی وسوسہ قرآن کریم کی تحریف کی بابت پیدا ہی نہیں ہوا اور اس سے یہ بات صریح طور پر ثابت ہوئی ہے کہ قرآن شریف ہر قسم کے تصرفات و تحریفات و تغیرات سے پاک رہا ہے۔ اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحابہ نے سیکھا تھا۔ اسی طرح بلا کم و کاست آج تک موجود ہے جس سے اس پیشگوئی کا منجانب اللہ ہونا اور اس کی صداقت ثابت ہے۔

❀ رفع قرآن کا مطلب

مصنف تاویل القرآن نے محض بے سمجھی سے ابن ماجہ کی ایک حدیث نقل کی ہے جس کا مطلب اس نے یہ لکھا ہے کہ قرآن شریف پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ جب یہ سب کا سب اٹھا لیا جائے گا۔ یہاں تک کہ ایک آیت بھی باقی نہ چھوڑی جائے گی۔ اور پھر اس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جب کہ یہ جائز ہے کہ سارا قرآن شریف اس دنیا سے اٹھ جائے اور ایک آیت بھی اس کی روئے زمین پر باقی نہ رہے تو کیا پھر بھی وعدۂ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ میں کچھ فرق نہیں آ سکتا؟ پھر اگر قرآن شریف کا کوئی حصہ گم ہو جائے یا اس میں کوئی تصرف اور تحریف کر لی جائے تو اس وعدۂ حفاظت میں کیونکر فرق آنا جائز تسلیم ہو سکتا ہے۔

معترض کو یہاں سخت ٹھوکر لگی ہے۔ قرآن شریف کے اٹھائے جانے سے یہ مراد نہیں کہ اس کی عبارت اور الفاظ کسی زمانہ میں دنیا سے اٹھا لیے جائیں گے۔ یہ تو یہاں لغو تعبیر ہے۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ مغز قرآن جہان سے اٹھ جائے گا۔ یعنی ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ جب لوگوں کی زبان پر قرآن ہو گا مگر ان کی عملی زندگیوں سے وہ خارج ہو گا۔ بخاری اور مسلم میں جو احادیث صحیحہ اس مضمون پر آئی ہیں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ علم قرآن علماء کے نہ ہونے کی وجہ سے قبض کر لیا جائے گا۔ نہ کہ اس کے الفاظ قبض کر لیے جانے کی وجہ سے۔ چنانچہ بخاری کتاب العلم میں یہ حدیث آئی ہے:

((عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: «إِنَّ اللهَ لاَ يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا، يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ، وَلَكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ».))[1]

یعنی عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ ''اللہ علم کو لوگوں سے چھین کر نہیں لے جائے گا۔ بلکہ علماء کے قبض کرنے سے علم قبض کرے گا۔''

ایسا ہی بیہقی نے ایک حدیث روایت کی ہے کہ ''ایک زمانہ ایسا آئے گا جب اسلام سے کچھ نہ رہے گا مگر صرف اس کا نام۔ اور قرآن سے کچھ نہ رہے گا مگر اس کے الفاظ۔'' چنانچہ مشکوٰۃ کتاب العلم میں یہ حدیث آئی ہے:

((عَنْ عَلِيٍّ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقَى مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهُ، وَلَا يَبْقَى مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رَسْمُهُ، مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدَى، عُلَمَاؤُهُمْ شَرُّ مَنْ تَحْتَ أَدِيمِ السَّمَاءِ، مِنْ عِنْدَهُمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيهِمْ تَعُودُ ».))[2]

1- صحيح البخاري: 100؛ صحيح مسلم: 6971

2- شعب الإيمان: 1763-(317/3)؛ كنز العمال: 15828-(311/6)

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ ''لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ جب اسلام میں سے کچھ نہ رہے گا مگر اس کا نام۔ اور قرآن میں سے کچھ نہ رہے گا مگر اس کے الفاظ۔ ان کی مسجدیں معمور ہوں گی لیکن ہدایت کے نہ ہونے کے سبب سے حقیقت میں ویران ہوں گی۔ اور ان کے علماء بگڑ کر ایسے خراب ہو گئے ہوں گے کہ پردۂ آسمان کے نیچے ان سے بڑھ کر کوئی برا نہ ہو گا۔ ان سے ہی فتنہ نکلے گا اور انہی میں عود کر کے داخل ہو گا''۔

اب صاف ظاہر ہے کہ قرآن اٹھایا جانے سے یہ مراد نہیں کہ جس قدر قرآن لوگوں کے گھروں میں لکھے اور چھپے پڑے ہیں یا جس قدر قرآن کتب خانوں اور دکانوں اور مسجدوں اور مقدس مقامات میں موجود ہیں اور وہ لاکھوں نہیں کروڑوں کی تعداد میں ہیں وہ سب کے سب کسی روز دنیا سے اٹھا لیے جائیں گے۔ اور جن لوگوں نے بڑی محنتوں سے اس کو کلاً یا جزاً حفظ کیا ہوا ہے ان کے حافظوں سے بھی اس کو سلب کر دیا جائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اسلامی عبادات بھی دنیا سے معدوم ہو جائیں گی۔ اور اس وجہ سے اسلام ہی دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ ایسا کبھی ممکن نہیں اور نہ ہی حدیث ابن ماجہ کا یہ منشا ہے۔

مشکوٰۃ کتاب العلم میں ایک اور حدیث ہے:

((عَنْ زِيَادِ بْنِ لَبِيدٍ قَالَ: ذَكَرَ النَّبِيُّ ﷺ شَيْئًا فَقَالَ: «ذَاكَ عِنْدَ أَوَانِ ذَهَابِ الْعِلْمِ». قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! وَكَيْفَ يَذْهَبُ الْعِلْمُ وَنَحْنُ نَقْرَأُ الْقُرْآنَ؟ وَنُقْرِئُهُ أَبْنَاءَنَا وَيُقْرِئُهُ أَبْنَاؤُنَا أَبْنَاءَهُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ؟ قَالَ: «ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ زِيَادُ! إِنْ كُنْتُ لأَرَاكَ مِنْ أَفْقَهِ رَجُلٍ بِالْمَدِينَةِ، أَوَلَيْسَ هٰذِهِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ يَقْرَءُونَ التَّوْرَاةَ وَالإِنْجِيلَ لاَ يَعْمَلُونَ بِشَيْءٍ مِمَّا فِيهِمَا».))[1]

یعنی زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ کسی امر کے واقع ہونے کے متعلق فرمایا کہ وہ علم کے گم ہو جانے کے زمانہ میں واقع ہو گا۔ میں نے اس پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ علم مفقود ہو جائے جب کہ ہم قرآن پڑھتے ہیں اور اپنے بیٹوں کو پڑھاتے ہیں، اور ہماری اولاد اپنی اولاد کو پڑھائے گی، اور یہ سلسلہ روز قیامت تک چلا جائے گا؟ یہ بات سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے زیاد تیری ماں تجھ سے محروم ہو جائے!! میں تو سمجھتا تھا کہ مدینہ میں تو ایک بڑا دانا آدمی ہے۔ کیا یہ یہود اور نصاریٰ تورات اور انجیل کو نہیں پڑھتے لیکن وہ ان کی کسی بات پر عمل نہیں کرتے''۔

اب اس حدیث سے ہمارے مقصود پر اور بھی زیادہ روشنی پڑتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا کہ کسی زمانہ میں علم گم ہو جائے گا تو معاً ایک صحابی نے خیال کر کے کہ علم کے معنے صرف پڑھنے اور پڑھانے کے ہیں عرض کیا کہ جب ہم خود قرآن کریم پڑھتے ہیں اور اپنی اولاد کو پڑھاتے ہیں اور ہماری اولاد میں یہ سلسلہ تعلیم و تعلم قرآن شریف قیامت تک جاری رہے گا تو پھر علم گم کیونکر ہو جائے گا؟ اس کی تشریح خود آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود اور نصاریٰ کی مثال پیش کر کے فرما دی۔ یعنی علم سے مراد یہ نہیں کہ کتاب الٰہی کو طوطے کی طرح پڑھتے رہیں بلکہ مراد اس سے یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور علم گم ہونے سے یہی مطلب ہے کہ گویا لوگوں میں سے عمل اٹھ جائے گا۔ نہ کہ اس کے الفاظ اور عبارات۔ اس جگہ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حفاظت تورات کا حکم انسانوں کو دیا گیا تھا۔ مگر حفاظت قرآن کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا۔ کیونکہ جو حکم انسانوں کو دیا جاتا ہے ضرور ہے کہ اس میں انسان تجاوز بھی کریں۔ جس طرح احکام شریعت میں۔ یہی وجہ ہے کہ تورات میں تحریف ہوئی مگر قرآن شریف میں نہیں ہوئی۔

1- سنن ابن ماجه: 4048؛ وقال الشيخ الألباني: صحيح.

قُرآن کریم کا تحریر میں لایا جانا

وہ دلائل جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کل قرآن کریم کو آنحضرت ﷺ کی زندگی میں اور آپ کی ہدایت کے مطابق لکھا گیا تھا۔

❀ قرآن کریم کی ہر آیت آنحضرت ﷺ کے سامنے لکھی گئی

اس جگہ ہم وہ ظاہری اسباب بیان کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدہ کو پورا کرنے کے لیے پیدا کر دیئے تھے کہ قرآن کریم محفوظ رہے گا۔ سب سے پہلے اور نہایت ضروری بات یہ تھی کہ جس شخص پر یہ کلام الٰہی نازل ہوتا تھا اس کے سامنے ہی ضبط تحریر میں آجائے تابعد میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہ ہو۔ چنانچہ جب کوئی حصہ قرآن شریف کا نازل ہوتا تھا اسی وقت اس کو حضور سرور کائنات ﷺ لکھوا دیتے اور مشتہر کرا دیتے اور اکثر صحابیوں کو حفظ کرا دیتے۔ یہاں تک کہ اس انتظام کے ساتھ سارے کا سارا قرآن کریم آنحضرت ﷺ کے سامنے لکھا گیا۔

❀ میور کی شہادت

(قبل اس کے کہ ہم قرآن و حدیث سے اس امر پر شہادت پیش کریں۔ ہم سر ولیم میور کی لائف آف محمد کے دیباچہ کے صفحہ 28 سے ذیل کی عبارت کا اقتباس کرتے ہیں جس میں عیسائی مصنف نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ قرآن شریف حضور رسالت پناہ محمد ﷺ کی آنکھوں کے سامنے لکھا جا چکا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"لیکن اس بات کو ماننے کے لیے بہت زبردست وجوہ موجود ہیں کہ (حضرت) رسول (کریم ﷺ) کی زندگی میں متفرق طور پر قرآن شریف کے نسخے لکھے ہوئے صحابہ کے پاس موجود تھے اور ان نسخوں میں سارا قرآن یا قریباً سارا لکھا ہوا موجود تھا۔ اس میں شک نہیں کہ (حضرت) محمد (مصطفی ﷺ) کے دعوے نبوت سے بہت پہلے مکہ میں فن تحریر مروج تھا اور مدینہ میں جا کر تو خود پیغمبر (خدا ﷺ) نے اپنے مراسلات لکھوانے کے لیے کئی صحابی مقرر کیے ہوئے تھے۔ جو لوگ بدر میں گرفتار ہو کر آئے تھے انہیں اس شرط پر وعدہ رہائی دیا گیا تھا کہ وہ بعض مدنی آدمیوں کو لکھنا سکھلا دیں۔ اور اگرچہ اہل مدینہ اہل مکہ کے برابر تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن وہاں بھی بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو اسلام سے پہلے لکھنا جانتے تھے۔"

❀ قرآن لکھا جانے پر اندرونی شہادت

خود قرآن شریف میں بھی بہت صفائی سے اس امر کی شہادت موجود ہے کہ یہ اس وقت لکھا ہوا موجود تھا۔ پہلے تو لفظ کتاب ہی قابل غور ہے جو بار بار مختلف سورتوں میں قرآن کریم کی نسبت آیا ہے اور کتاب کے معنی لکھے ہوئے کے ہیں۔ ایسا ہی قرآن شریف کو مصحف بھی کہا گیا ہے اور صحیفہ کے معنی لکھے ہوئے کاغذ کے ہیں۔ چنانچہ سورۃ البینہ میں ہے:

﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝﴾ [البینة: 3-2]

"اللہ کا رسول مقدس اوراق پڑھ کر سناتا ہے جن میں مضبوط کتابیں موجود ہیں۔"

اب یہ اوراق مقدس قرآن شریف کے اوراق ہیں۔ اور کتب قیمہ اس کی سورتیں ہیں۔ کیونکہ نہ صرف کامل قرآن شریف ہی کو الکتاب کہا گیا ہے۔ بلکہ اس کی ہر ایک سورت کو بھی کتاب کا نام دیا گیا ہے۔ ایسا ہی سورۂ عبس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝١١ فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُۥ ۝١٢ فِى صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝١٣ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ۝١٤﴾ [عبس: 14-11]

''قرآن تو (سراسر) نصیحت ہے۔ پس جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے اور (وہ قرآن) اوراق میں (لکھا) ہے جن کی تعظیم کی جاتی ہے (اور وہ) اونچی جگہ رکھے ہوئے (ہیں اور) پاک ہیں (اور ایسے) لکھنے والوں کے ہاتھوں میں (رہتے ہیں) جو بزرگ (اور) نیکوکار ہیں۔''

لفظ صحف جو یہاں استعمال ہوا ہے وہ صحیفہ کی جمع ہے اور یہ وہی لفظ ہے جو ان تمام مجموعوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ جو سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جمع کیے تھے۔ پس یہ امر نہایت صفائی سے ثابت ہے۔ کہ خود قرآن کریم نے اپنے لیے لفظ کتاب اور صحیفہ استعمال کیے ہیں۔ اور ان دونوں لفظوں کے عربی زبان میں ''لکھی ہوئی کتاب'' معنی ہیں۔ جو ہر ایک لغت عرب سے ثابت ہے اور آج تک عام طور پر لفظ مصحف قرآن کریم کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور وہ بھی صحیفہ سے ماخوذ ہے۔ اور اس کے معنی ایک کتاب ہیں جس میں بہت سے صحیفے جمع ہوں یعنی لکھے ہوئے اوراق ہوں۔

❀ کوئی حصہ قرآن کا ایسا نہیں جو لکھا نہ گیا ہو

قرآن شریف کے دیگر مقامات سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اس کی سورتیں ابتدائی زمانہ میں ہی لکھی ہوئی تھیں۔ چنانچہ سورۃ الواقعہ میں جو ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی نسبت فرماتا ہے:

﴿إِنَّهُۥ لَقُرْءَانٌ كَرِيمٌ ۝٧٧ فِى كِتَٰبٍ مَّكْنُونٍ ۝٧٨ لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلْمُطَهَّرُونَ ۝٧٩﴾ [الواقعة: 79-77]

''یہ (کتاب) بڑی قدر و منزلت کا قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں لکھا ہوا۔ اسے چھوتے نہیں مگر صرف جو پاک ہیں۔''

ان آیات سے دو باتیں پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن ایک محفوظ کتاب ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ جسے کوئی محرف و مبدل نہیں کر سکتا۔ دوسرا یہ قرآن کریم اسی ابتدائی زمانہ سے لکھا جا چکا تھا۔ کیونکہ ناپاکوں کو اسے چھونے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ ایک بڑی موٹی بات ہے کہ ''مس'' کرنے سے کسی شے کا وجود جسمانی رنگ میں ہونا ضروری ہے۔ الفاظ کا ''مس'' نہیں ہو سکتا۔ اگر وہی الفاظ ضبط تحریر میں آ کر کتاب کی صورت بن جائیں تو وہ ایک جسم بن جاتا ہے اور چھوا جا سکتا ہے۔ اس سے صاف ثابت ہے کہ قرآن کریم اسی ابتدائی زمانہ میں لکھا جا چکا تھا اور کتاب کی صورت میں تھا۔ اگر یہ لکھا ہوا نہ ہوتا تو اس پر لفظ مس کا اطلاق ہی نہ ہوتا۔

راڈول ایک یورپین ہے جس نے قرآن شریف کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس نے اپنے انگریزی ترجمہ میں اس موقعہ پر مندرجہ ذیل حاشیہ دیا ہے:

''اس جملہ سے کم از کم اتنا تو پتہ ملتا ہے کہ قرآن شریف کی سورتوں کے لکھے ہوئے نسخے اس وقت عام طور پر زیر استعمال تھے۔ حضرت عمر کی ہمشیرہ فرماتی ہیں کہ جب وہ مسلمان ہونے لگے تو انہوں نے مجھے کہا کہ سورۂ طٰہٰ کا نسخہ میرے ہاتھ میں دے دو۔ آیات 78-77 جن کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ بحکم خلیفہ محمد ابو القاسم بن عبد اللہ قرآن کریم کی تمام جلدوں پر لکھی جانی شروع ہوئیں۔''[1]

یہ بات صحیح نہیں کہ اس جملہ سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ قرآن شریف کے بعض حصے ہی لکھے گئے تھے۔ اس عبارت سے کسی

1- ترجمة القرآن راڈول، صفحہ: 54

طرح یہ نہیں پایا جاتا کہ کوئی حصہ قرآن شریف کا ایسا بھی رہ گیا تھا کہ جو لکھا ہی نہ گیا ہو۔ اس میں صاف لکھا ہے کہ سارا قرآن لکھی ہوئی کتاب ہے نہ کہ بعض حصے اس کے لکھنے سے رہ گئے یا چھوڑے گئے تھے۔ پس ان آیات میں یہ شہادت صریح طور پر موجود ہے کہ سارا قرآن شریف لکھا ہوا تھا اور اگر کوئی شخص اس کے برخلاف یہ کہے کہ بعض حصے لکھے ہوئے تھے اور بعض نہیں تو اس کا فرض ہے کہ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے اس کے مخالف شہادت پیش کرے۔ لیکن ایسی شہادت نہ قرآن شریف سے ملتی ہے نہ حدیث سے پائی جاتی ہے۔ نہ ساری اسلامی تاریخ میں کہیں ایسا واقعہ نظر آتا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ قرآن شریف کی بعض سورتوں کو بعض سے متفاوت اور مختلف سمجھا گیا ہو۔ یا یہ خیال کیا جاسکے کہ بعض سورتیں لکھی گئی تھیں اور بعض کو اس لائق نہیں سمجھا گیا کہ وہ لکھی جاتیں۔ یا یہ کہ ساری سورتوں کی مساوی احتیاط نہیں کی گئی۔ یا یہ کہ قرآن شریف کے ہر ایک لفظ کی حفاظت کے لیے مساوی خواہش آنحضرت ﷺ اور صحابہ بزرگانِ دین نے نہ کی تھی۔ بعض کی کی اور بعض کی نہ کی یا کچھ کم کی۔

❀ کفار سے تحدی میں قرآن کے لکھے جانے کی شہادت

ایک اور دلیل جو قرآن شریف کے لکھا ہوا ہونے پر خود قرآن کریم سے ہی ملتی ہے یہ ہے کہ کفار مکہ کہتے تھے کہ یہ قرآن گویا (نعوذ باللہ منہا) آنحضرت ﷺ نے آپ ہی بنالیا ہوا ہے۔ خدا کی طرف سے وحی نہیں۔ ایسے لوگوں کو چیلنج کیا گیا تھا:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

[هود: 13]

''(اے پیغمبر) کیا (کافر) کہتے ہیں کہ اس (شخص یعنی تم) نے قرآن کو اپنے دل سے بنالیا ہے۔ تو (ان لوگوں سے) کہو کہ اگر تم سچے ہو تو تم بھی (اہل زبان ہو) اسی طرح کی بنائی ہوئی (زیادہ نہیں) دس (ہی) سورتیں لے آؤ اور خدا کے سوا جس کو (مدد کے لیے) تم سے بلانا بن پڑے بلالو۔''

یہ آیتیں سورہ ہود میں ہیں اور سورہ ہود مکہ میں اس وقت نازل ہوئی جب کہ ابھی ہجرت بھی نہ ہوئی تھی۔ ایسے ہی سورۂ بنی اسرائیل جو اس سے بھی پہلے کی نازل شدہ ہے اس کی 91 آیت میں یہ چیلنج درج ہے:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝۸۸﴾

[بنی اسرائیل: 88]

''(اے پیغمبر ان لوگوں سے) کہو کہ اگر آدمی اور جن جمع ہو کر (اس بات پر آمادہ) ہوں کہ اس قرآن کی طرح کا (اور کلام) بنالائیں تو وہ کبھی اس جیسا نہیں بنالا سکتے۔ اگرچہ ان میں سے ایک کی پشت پناہی پر ایک (کیوں نہ) ہو۔''

پھر سورۃ البقرہ کی آیات 22-21 میں یہ تحدی درج ہے:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۲۳ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝۲۴﴾ [البقرة: 24-23]

''اور وہ جو ہم نے اپنے بندے (محمد) پر (قرآن) اتارا ہے۔ اگر تم کو اس میں شک ہو (اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب اللہ کی نہیں بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے) اور (اپنے اس دعوے میں) سچے ہو تو اس جیسی ایک ہی سورت (تم بھی بنا) لاؤ۔ اور اللہ کے سوا جو (تمہاری حمایت کو) آموجود ہوں۔ ان کو بھی بلالو، پس اگر (اتنی بات بھی) نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو (دوزخ کی) آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے جو منکروں کے لیے تیار ہے۔''

یہ آیت مدنی ہے۔ اب ان مکی اور مدنی سورتوں میں کہیں یہ چیلنج ہے کہ اس قرآن جیسا قرآن بنالاؤ، کہیں یہ کہ اس جیسی دس

سورتیں بنالاؤ اور کہیں یہ کہ ایک ہی سورہ اس کے مقابلہ میں بنالاؤ۔ قرآن شریف کی سورتیں لکھی ہوئی موجود نہ ہوتیں تو ایسا چیلنج بے معنی ہوتا۔ کیونکہ ضروری ہے کہ جس چیز کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی کو تحدی کی جائے تو وہ چیز بھی اس کے سامنے رکھی جائے۔ ورنہ وہ مقابلہ ہی کیا کر سکتا ہے اور ایسی صورت میں کفار کی طرف سے یہی جواب دیا جاتا کہ پہلے ہمیں وہ سورتیں دکھاؤ جن کا مقابلہ چاہتے ہو۔

❀ احادیث کی شہادت کہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت اپنے اپنے موقع پر لکھوائی

قرآن شریف کی شہادت کے علاوہ اعلیٰ طبقہ کی صحیح احادیث میں بہت سارے واقعات ایسے درج ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو وحی ہوتی تو وہ اسی وقت لکھ لی جاتی۔ ذیل کی روایت میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن شریف کی آیات کے لکھا جانے کا طریق بیان کیا ہے:

((عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مِمَّا يَأْتِي عَلَيْهِ الزَّمَانُ وَهُوَ تَنْزِلُ عَلَيْهِ السُّوَرُ ذَوَاتُ الْعَدَدِ فَكَانَ إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الشَّيْءُ دَعَا بَعْضَ مَنْ كَانَ يَكْتُبُ فَيَقُولُ: «ضَعُوا هٰؤُلَاءِ الْآيَاتِ فِي السُّورَةِ الَّتِي يُذْكَرُ فِيهَا كَذَا وَكَذَا».))[1]

''آنحضرت ﷺ کا دستور تھا کہ ایسے اوقات میں چند سورتیں ایک ہی وقت میں نازل ہوتی تھیں۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو ان لوگوں میں سے جو قرآن شریف لکھا کرتے تھے کسی ایک کو بلا بھیجتے۔ اور فرماتے کہ ''اسے فلاں سورت میں اس موقعہ پر جہاں ایسا ایسا ذکر ہے رکھ دو۔''

پس یہ امر نہایت صفائی سے ثابت ہے کہ ہر ایک سورہ قرآن شریف کی اور ہر ایک آیت قرآن شریف کی آنحضرت ﷺ کے حکم وہدایت سے آپ کے سامنے اسی وقت لکھ لی جاتی جب کہ وہ نازل ہوتی۔ اور مزید احتیاط آپ یہ فرماتے کہ جب کبھی دو یا دو سے زیادہ سورتیں ابھی غیر مکمل ہوتیں تو جس مقام اور سورت اور موقعہ پر وہ آیت لکھنی چاہیے تھی اسی جگہ لکھنے کی ہدایت فرماتے' تاکہ کاتب ایک ہی سورت کی آیات کو کسی دوسری سورت کی آیات سے مخلوط نہ کر سکیں۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت اس امر پر اکیلی ہی نہیں۔ بلکہ اور بھی بہت ساری روایات صحیح احادیث میں ایسی موجود ہیں جو اس گواہی کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً بخاری کاتب النبی ﷺ میں براء کی روایت سے یہ حدیث ہے:

((قَالَ: لَمَّا نَزَلَتْ: ﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ﴾ [النساء: 95] قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «ادْعُ لِي زَيْدًا وَلْيَجِئْ بِاللَّوْحِ وَالدَّوَاةِ وَالْكَتِفِ -أَوِ الْكَتِفِ وَالدَّوَاةِ-». ثُمَّ قَالَ: «اكْتُبْ ﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ﴾».))[2]

یعنی ''جب آیت ﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ﴾ نازل ہوئی تو حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''زید کو میرے پاس بلا لاؤ۔ اور کہو کہ دوات اور لوح ساتھ لاوے۔'' پھر (جب وہ آپہنچا تو اسے) حکم دیا کہ ''لَا يَسْتَوِي ساری آیت لکھو۔''

کاتبان وحی

ایسے ہی بخاری کے اسی باب میں ایک اور حدیث آتی ہے جس میں لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زید کو مخاطب کر کے

1- جامع الترمذي: 3086؛ سنن أبي داؤد: 786؛ قال الشيخ الألباني: ضعيف.

2- صحيح البخاري: 4990؛ صحيح مسلم: 5020

فرمایا: [اِنَّكَ كُنْتَ تَكْتُبُ الْوَحْيَ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ][1] یعنی بے شک آپ آنحضرت پیغمبر خدا ﷺ کی وحی لکھا کرتا تھا۔ اس مکرم عہدہ کتابت وحی پر حضرت زید تو مامور ہی تھے اور اس ماموریت کی وجہ سے کثیر حصہ مدنی وحی کا انہوں نے ہی لکھا تھا لیکن ان کے سوا اور بھی وحی نبوت لکھنے والے اصحاب موجود تھے جنہوں نے مکی سورتیں مکہ میں لکھیں۔ اور بعض مدنی آیات کو بھی جب کبھی حضرت زید موجود نہ ہوتے تو ان کی غیر حاضری میں اوروں نے لکھا۔ ان معظم اور مقدس بزرگوں کے اسماء کی فہرست میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح (جو ایک وقت میں مرتد بھی ہو گیا تھا اور فتح مکہ کے بعد پھر مسلمان ہوا تھا)، حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ، حضرت خالد و ابان ابنائے سعید، ابی بن کعب، حنظلہ بن الربیع، معیقب بن ابو فاطمہ، عبداللہ بن ارقم، شرحبیل بن حسنہ، عبداللہ بن رواحہ کے نام لکھے ہوئے ہیں۔[2] کاتبان وحی میں بعض مؤرخین نے بیالیس صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نام لکھے ہیں۔

❀ احادیث کے تحریر میں لانے کی ممانعت

ان کے ماسوا بہت سارے ایسے واقعات موجود ہیں جو دوسرے طور پر اس ثبوت کو اور بھی مضبوط کرتے ہیں۔ مثلاً: صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے اصحاب سے مخاطب ہو کر فرمایا: [لَا تَكْتُبُوْا عَنِّيْ شَيْئًا غَيْرَ الْقُرْاٰنِ][3] یعنی ''مجھ سے سوائے قرآن کے کوئی شے مت لکھو۔''

یہ ہدایت اس غرض سے احتیاطاً حفظ ماتقدم کے طور پر دی گئی تھی کہ قرآن شریف کے ساتھ حضور سرور کائنات ﷺ کی اپنی باتیں کہیں لوگ نہ ملا دیں۔ اور یہ بھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قرآن شریف کے لکھا جانے کا حکم دیا تھا اور وہ لکھا بھی جاتا تھا۔ غیر قرآن لکھنے کی ممانعت قرآن کے لکھا جانے میں صریح شہادت ہے۔ بخاری کتاب العلم کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ احتیاط کو ملحوظ رکھ کر احادیث کو لکھنے کی بھی اجازت دی گئی تھی۔

❀ سیدنا عمر کے اسلام لانے کے واقعہ میں قرآن کے لکھا جانے کی شہادت

پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو اس وقت کی سرگذشت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف اس زمانہ میں ہی لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ ابن ہشام میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ آنحضرت ﷺ شرک اور بت پرستی کے مذہب کی بیخ اکھاڑنے کے درپے ہیں تو اس جوش میں آکر یہ ارادہ کیا کہ میں آنحضرت ﷺ کو ہی جان سے مار دوں گا۔

ایک دن یہ بات دل میں ٹھان کر گھر سے ہی تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے آنحضرت کی طرف روانہ ہوئے کہ جہاں کہیں آپ ملیں گے وہیں قتل کر دوں گا۔ راستے میں جاتے ہوئے ان کو یہ خبر ملی کہ ان کی اپنی ہمشیرہ فاطمہ اور اس کا خاوند سعید بن زید مسلمان ہو گئے ہیں۔ یہ بات سن کر وہ اور بھی غصہ میں بھڑکے اور وہیں سے سیدھے اپنی بہن کے گھر پہنچے تاکہ پہلے ان کا کام ہی تمام کیا جائے۔ اس وقت ان کے گھر میں ایک تیسرا آدمی بھی موجود تھا جس کا نام خباب تھا اور جس کو حضرت عمر جانتے تھے کہ وہ مسلمان ہے۔ خباب کے پاس اس وقت ایک جلد موجود تھی جس میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔ اور وہ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ اور اس کے خاوند کو سورۂ طٰہٰ پڑھا رہا تھا۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آرہے تو فوراً خباب رضی اللہ عنہ تو ایک گوشہ میں جا چھپے اور فاطمہ ہمشیرہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ جلد اٹھا کر

1- صحيح البخاري: 4989؛ جامع الترمذي: 3103، 3104؛ قال الشيخ الألباني صحيح.
2- فتح الباری: (19/9) باب كاتب وحی رسول الله ﷺ.
3- صحيح مسلم: 7702؛ مسند الإمام أحمد: 11457

اپنے پاس چھپالی۔ لیکن ان کا چھپنا بالکل بے سود تھا۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے نزدیک ایسے مقام پر پہنچ گئے ہوئے تھے کہ انہوں نے خباب رضی اللہ عنہ کا پڑھانا اور ان کا پڑھنا سن لیا تھا۔

پس جب آپ رضی اللہ عنہ کمرہ کے اندر داخل ہوئے تو اندر قدم رکھنے کے ساتھ ہی پہلا سوال یہ کیا کہ تم کیا پڑھ رہے تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے کچھ نہیں سنا ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا نہیں میں نے سنا ہے اور مجھے یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دین قبول کر لیا ہے۔ یہ بات کہتے ہی انہوں نے اپنے بہنوئی کو پکڑ لیا کہ اس کا کام تمام کریں۔ یہ ماجرا دیکھتے ہی ان کی ہمشیرہ اپنے خاوند کو چھڑانے کے لیے لپٹ گئیں۔ اس ہنگامہ میں فاطمہ کو سخت زخم لگا۔ حضرت سعید اور فاطمہ دونوں میاں بیوی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اب تمہاری مرضی ہے جو چاہو ہم سے سلوک کرو۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی ہمشیرہ کا خون بہتے دیکھا تو اپنی اس حرکت پر بہت پشیمان ہوئے اور انہوں نے کہا کہ جو کتاب تم پڑھ رہے تھے وہ لاؤ اور مجھے بھی دکھاؤ کہ میں بھی دیکھوں تو سہی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کیا لا کر دیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود پڑھے لکھے تھے۔ جب انہوں نے باصرار طلب کیا تو ان کی ہمشیرہ ڈریں کہ مبادا کہیں لے کر وہ اس کتاب کو ضائع ہی نہ کر دیں۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عہد لے لیا اور انہوں نے اپنے بتوں کی قسم کھائی کہ میں یہ کتاب ضائع نہیں کروں گا بلکہ دیکھ کر واپس کر دوں گا۔ پھر اس نے کہا کہ تم مشرک نجس ہو اس لیے اس کو چھونے کے لیے طہارت کی ضرورت ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غسل کیا اور پھر ان کی ہمشیرہ نے وہ جلد ان کے ہاتھ میں دے دی جس میں سورۂ طہ لکھی ہوئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں سے کچھ حصہ پڑھا اور بہت تعجب کیا کہ یہ ایسی عجیب کتاب ہے اور بہت ہی عزت کی۔ پھر خباب رضی اللہ عنہ نے ان کا میلان دیکھ کر کہا کہ آپ اسلام قبول کر لیں۔

یہ ایک لمبا واقعہ ہے، ہم اس کو اسی جگہ تک لکھ کر چھوڑتے ہیں۔ اس سے صاف ثابت ہے کہ ابتدائی زمانہ میں ہی مسلمانوں میں عام طور پر لکھے ہوئے قرآن شریف مستعمل تھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ کا ان کو یہ کہنا کہ نجس ہونے کی حالت میں کوئی شخص قرآن شریف کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ یہ بھی اس بات پر شہادت ہے کہ لکھے ہوئے نسخے قرآن کریم کے اس کثرت سے استعمال میں تھے۔ ایک نئے مسلمان شدہ شخص کو بھی یہ پتہ تھا کہ نجاست کی حالت میں قرآن شریف کو ''مس'' کرنا منع ہے۔ اسی طرح اس حدیث سے کہ [أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى أَنْ يُسَافَرَ بِالْقُرْآنِ إِلَى أَرْضِ الْعَدُوِّ][1] جو صحیح بخاری میں ہے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم لکھا جاتا تھا اور اس کے دشمن کی سرزمین میں لے جانے کی ممانعت تھی تاکہ دشمن کتاب اللہ کو ضائع نہ کریں یا اس کی بے حرمتی نہ کریں۔ ان روایات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن شریف کے لکھے ہوئے نسخے خاص خاص آدمیوں تک محدود نہ تھے اور عام طور پر پائے جاتے تھے۔ اور تاریخ اس امر پر گواہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ میں سے بہت لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ یہاں تک کہ عورتیں بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھی اور بہت لوگوں نے مسلمان ہو کر لکھنا پڑھنا سیکھا۔

❀ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے جمع قرآن میں تحریر کی تلاش

جب سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد قرآن شریف کو جمع کیا تو اس وقت کے واقعات سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے لکھی جا چکی تھی۔ اس وقت سورۂ توبہ کی دو آیتوں کے متعلق یہ واقعہ پیش آیا کہ باوجود حضرت زید رضی اللہ عنہ کو یہ علم ہونے کے وہ آیات قرآن شریف کی ہیں ان کو نہ لیا گیا جب تک وہ لکھی ہوئی نہ ملیں۔ چنانچہ حضرت زید خود یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں جو صحیح بخاری میں موجود ہیں:

1- صحيح البخاري: 2990؛ صحيح مسلم: 4946

((فَقُمْتُ فَتَتَبَّعْتُ الْقُرْآنَ أَجْمَعُهُ ... حَتَّى وَجَدْتُ مِنْ سُورَةِ التَّوْبَةِ آيَتَيْنِ مَعَ خُزَيْمَةَ الأَنْصَارِيِّ، لَمْ أَجِدْهُمَا مَعَ أَحَدٍ غَيْرِهِ ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم﴾ [التوبة: 128] إِلَى آخِرِهِمَا.))[1]

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''میں نے قرآن شریف کو تلاش کر کے جمع کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سورۂ توبہ کا آخری حصہ مجھے ابو خزیمہ انصاری کے پاس سے ملا جو اور کسی کے پاس نہ تھا اور وہ یہ ہے: ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم﴾ سورۂ براءۃ کے آخر تک۔''

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو یہ علم تھا کہ یہ آیتیں سورۂ توبہ کے آخر میں ہیں اور پھر ان کی تلاش کرتے تھے۔ جس سے سوائے اس کے کچھ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ تلاش تحریر کی تھی۔

جس حدیث کا یہ ایک حصہ ہے اس کی تشریح مصنف فتح الباری نے ان الفاظ میں لکھی ہے:

((فَلَمْ يَأْمُرْ أَبُوْبَكْرٍ اِلَّا بِكِتَابَةِ مَا كَانَ مَكْتُوْبًا وَلِذَلِكَ تَوَقَّفَ زَيْدٌ عَنْ كِتَابَةِ الْآيَةِ مِنْ آخِرِ سُوْرَةِ بَرَائَةٍ حَتّٰى وَجَدَها مَكْتُوْبَةً مَعَ اَنَّهُ كَانَ يَتَحَضَّرُها هُوَ وَمَنْ ذَكَرَ مَعَهُ.))

اور پھر لکھا ہے:

((وَكَانَ الْقُرْآنُ مَكْتُوْبًا فِي الصُّحُفِ وَلٰكِنْ كَانَتْ مُفَرَّقَةً فَجَمَعَهَا اَبُوْبَكْرٍ فِيْ مَكَانٍ وَاحِدٍ.))

''حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سوائے اس کے جو لکھا ہوا موجود تھا کسی اور شے کے لکھنے کا حکم نہ دیتے تھے۔ یعنی انہوں نے قرآن شریف جمع کرانے میں اتنی بڑی احتیاط فرمائی کہ جس طرح اور جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں لکھا جا چکا تھا وہی لکھنے دیا۔ اسی وجہ سے زید کو جو سورۂ توبہ کے آخری حصہ کی آیات کو جانتا تھا کہ یہ بھی قرآن کا حصہ ہیں ان کے درج کر لینے میں توقف کیا۔ یہاں تک کہ وہ اسے لکھی ہوئی مل گئیں''۔ ''اور سارا قرآن قلمی لکھا ہوا تھا۔ مگر یہ قلمی لکھے ہوئے حصے متفرق لوگوں کے پاس تھے اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کوشش کر کے انہیں ایک جگہ اکٹھا کر دیا۔''

❀ طرز تحریر وہی رہی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھی

ایک اور روایت ابی داؤد سے یوں آئی ہے:

((قَالَ: قَامَ عُمَرُ فَقَالَ: مَنْ كَانَ تَلَقّٰى مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ شَيْئًا مِنَ الْقُرْاٰنِ فَلْيَأْتِ بِهِ وَكَانُوْا يَكْتُبُوْنَ ذٰلِكَ فِي الصُّحُفِ وَالْاَلْوَاحِ وَالْعَسَبِ. قَالَ: وَ كَانَ لَا يَقْبَلُ مِنْ اَحَدٍ شَيْئًا حَتّٰى يَشْهَدَ شَاهِدَانِ.))[2]

''جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآن شریف کو جمع کرنے کا کام ہاتھ میں لیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عام طور پر اعلان کر دیا کہ جس کسی کے پاس قرآن شریف کا کوئی حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہوا ہے وہ لے آئے۔ ان دنوں لوگ قرآن شریف کو کاغذ اور الواح اور کھجور کی ٹہنیوں پر لکھا کرتے تھے۔ کسی شخص سے کوئی حرف بھی لکھا ہوا منظور نہ کیا جاتا تھا جب تک کہ دو گواہوں کی گواہی نہ ہو۔''

فتح الباری میں ہے:

1- صحيح البخاري: 4679؛ جامع الترمذي: 3103، 3104؛ قال الشيخ الألباني: صحيح.

2- فتح الباری: 14/9 - كتاب المصاحف: 62/1

((وَ كَانَ غَرْضُهُمْ اَنْ لَّا يَكْتُبَ اِلَّا مِنْ عَيْنِ مَا كُتِبَ بَيْنَ يَدَيِ النَبِيِّ ﷺ لَا مِنْ مُجَرَّدِ الْحِفْظِ.))[1]

اس قدر احتیاط سے غرض ان کی یہ تھی کہ سوائے اس کے کچھ نہ لکھا جائے جو آنحضرت ﷺ کی آنکھوں کے سامنے لکھا گیا تھا اور مجرد حافظہ سے کچھ نہ لکھا جائے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے:

((قُبِضَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَالْقُرْاٰنُ فِي الْعَسَبِ وَالْقَضَمِ.))[2]

''آنحضرت ﷺ اس وقت دنیا سے اٹھائے گئے کہ جب قرآن شریف صرف کھجور کے پتوں اور کھالوں پر لکھا ہوا تھا۔''

ان تمام روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت اور ہر ایک سورت آنحضرت ﷺ کی ہدایت کے ماتحت آپ کی زندگی میں اور آپ کے سامنے لکھی گئی تھی۔

1- فتح الباری: 15/9

2- غریب الحدیث لابن الجوزی: 251/2

نبی ﷺ کی زندگی میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا حفظ قرآن

وہ دلائل جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سارا قرآن شریف آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہی صحابہ رضی اللہ عنہم حفظ کر چکے تھے۔

❀ قرآن کریم کا حفظ کرنا

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ جب کبھی کوئی آیت کریمہ نازل ہوتی تو اسی وقت مجلس میں سب حاضرین خواہ وہ دشمن ہوتے یا دوست ضرور سنا دیا کرتے تھے۔ اور آپ ﷺ کی مقدس جماعت رضی اللہ عنہم میں سے بعض تو وہ تھے جو بہ سبب اکثر آپ کی مجلس میں حاضر ہونے کے تازہ وحی الٰہی کو اسی وقت آپ کے دہن مبارک سے سن کر حفظ کر لیتے۔ اور جو حاضر نہ ہوتے وہ دوسروں سے سن کر حفظ کر لیتے یا لکھوا کر اپنے پاس رکھ کر بتدریج حفظ کر لیتے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن کریم صرف چند اخلاقی باتیں اور نیک نصائح یا تمدنی اور فوجداری قوانین کا مجموعہ ہی نہ تھا جس کے مطالب کو یاد رکھنا کافی سمجھا جاتا۔ بلکہ قرآن کریم کے ایک ایک حرف پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اور ان کے بعد آج تک اہل ایمان کا یہ ایمان رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اس پاک کتاب کا ایک ایک لفظ اللہ کے منہ سے نکلا ہوا ہے۔ اس لیے اس کو نہایت محفوظ ترین مقام یعنی قلب میں محفوظ رکھنے کی طرف اس قدر متوجہ رہتے۔

قرآنی آیات ان کی پاک روحوں کی غذا تھی۔ وہ آیات کے نزول کا اس طرح انتظار کرتے رہتے تھے جس طرح ایک سخت پیاسا آدمی پانی کا انتظار کرتا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کی صحبت میں بکثرت اسی لیے رہتے تھے کہ جب کوئی تازہ آیت نازل ہو تو اس کو فوراً سن لیں اور حفظ کرنے میں سبقت کریں۔ چنانچہ اکثر کا تو یہ حال تھا کہ کس قدر کاروبار تجارت وغیرہ بطور حصول معاش کے باقی تمام وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں گزارتے اور جو اپنے مشاغل ضروریہ کی وجہ سے غیر حاضر رہتے تھے ان میں سے بعض نے ایک دوسرے سے مل کر یہ انتظام کیا ہوا تھا کہ باری باری ایک اپنا کام کر آوے اور دوسرا حضور کی خدمت میں حاضر رہے اور اگر کوئی آیت نازل ہو تو اس کو محفوظ کر کے اپنے غیر حاضر بھائی کو پہنچائے۔ اور پھر وہ اپنے کام پر چلا جائے اور دوسرا موجود رہے۔ چنانچہ بخاری میں لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ کے مضافات میں ایسے مقام میں رہتے تھے جہاں ایک انصاری ان کے ہمسایہ تھے۔ جس کے ساتھ انہوں نے یہ انتظام کیا ہوا تھا کہ دونوں نوبت بہ نوبت آنحضرت ﷺ کے دربار میں حاضر رہیں اور جو کچھ سنیں یا دیکھیں اس سے ایک دوسرے کو مطلع کرتے رہیں۔ یعنی ایک روز ایک اپنے معاش کے لیے کام کرتا اور دوسرا دربار نبوت میں حاضر رہتا۔ اور دوسرے روز وہ اپنے کام میں مشغول ہوتا اور اول الذکر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"جب میں نبی کریم ﷺ کے حضور میں رہتا تو اس دن کی وحی وغیرہ کی تمام خبریں اس دوسرے شخص کو لا سناتا اور جس دن وہ حاضر دربار رسالت رہتا تو وہ اخبار مجھے لا سناتا۔" (صحیح بخاری)

اس کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بعض ایسے بزرگ بھی تھے جو اپنا سارا وقت مسجد نبوی ہی میں گزارتے اور ہر وقت اس بات پر آمادہ رہتے کہ جب کوئی آیت آنحضرت ﷺ پر نازل ہو اسی وقت یاد کر لیں۔ ان کا شغل تلاوت قرآن ہی تھا۔

❀ آنحضرت ﷺ کا صحابہ رضی اللہ عنہم کو حفظ و تعلیم قرآن کی طرف رغبت دلانا

خود آنحضرت ﷺ قرآن شریف کے پڑھنے پڑھانے اور یاد کرنے کے لیے بہت سخت تاکید فرماتے رہتے۔ جیسا کہ مسلم کی حدیث ذیل سے ثابت ہوتا ہے:

((عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ: خَرَجَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَنَحْنُ فِي الصُّفَّةِ فَقَالَ: « أَيُّكُمْ يُحِبُّ أَنْ يَغْدُوَ كُلَّ يَوْمٍ إِلَىٰ بُطْحَانَ -أَوْ إِلَى الْعَقِيقِ- فَيَأْتِيَ مِنْهُ بِنَاقَتَيْنِ كَوْمَاوَيْنِ فِي غَيْرِ إِثْمٍ وَلاَ قَطْعِ رَحِمٍ». فَقُلْنَا يَا رَسُولَ اللهِ! نُحِبُّ ذَلِكَ. قَالَ: «أَفَلاَ يَغْدُو أَحَدُكُمْ إِلَى الْمَسْجِدِ فَيَعْلَمَ أَوْ يَقْرَأَ آيَتَيْنِ مِنْ كِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ خَيْرٌ لَهُ مِنْ نَاقَتَيْنِ، وَثَلاَثٌ خَيْرٌ لَهُ مِنْ ثَلاَثٍ، وَأَرْبَعٌ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَرْبَعٍ، وَمِنْ أَعْدَادِهِنَّ مِنَ الإِبِلِ».))[1]

یعنی عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ ایک روز حضرت رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے اور ہم اس وقت صفہ میں تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ ''تم میں سے کون اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ ہر روز بطحان یا عقیق کو جائے اور بڑی کوہان والی دو اونٹنیاں بغیر کسی کو گزند پہنچائے، گناہ کیے اور قطع رحمی کیے کے لائے۔''

ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) ہم سب اس بات سے محبت رکھتے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی صبح کو مسجد میں آکر کتاب اللہ (قرآن کریم) کی دو آیتیں پڑھتا یا پڑھتا نہیں۔ جو اس کے لیے دو اونٹنیوں سے بڑھ کر ہیں۔ اور تین آیتیں تین اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔ اور چار آیتیں چار اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔ جتنی آگے پڑھے گا پڑھائے گا اتنے ہی اونٹوں سے بہتر ہوں گی''۔

ایسے ہی صحیح بخاری میں یہ حدیث آئی ہے:

((عَنْ عُثْمَانَ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ».))[2]

یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہا فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ''تم سب سے بہتر وہی ہے جو قرآن شریف کو سیکھتا اور سکھاتا ہے۔''

ایسے ہی بخاری اور مسلم دونوں میں یہ حدیث صحیح موجود ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے ہے:

((عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «الْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ وَالَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَتَتَعْتَعُ فِيهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهُ أَجْرَانِ».))[3]

یعنی ''قرآن کے ماہر (قراء حضرات) ان کے ساتھ ہیں جو بہت عزت والے اور بزرگ ہیں۔ اور جو شخص قرآن شریف کو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور نہایت مشکل سے اس کے حروف کو ادا کرتا ہے تو اس کے لیے دوچند اجر ہے۔''

ایک اور حدیث یہ ہے:

((عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «لاَ حَسَدَ إِلاَّ فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ يَقُومُ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ، وَرَجُلٌ آتَاهُ اللهُ مَالاً فَهُوَ يُنْفِقُهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ».))[4]

1- صحيح مسلم: 1909؛ شعب الإيمان للبيهقي: 1787

2- صحيح البخاري: 5027؛ جامع الترمذي: 2907، 2908

3- صحيح مسلم: 1898؛ جامع الترمذي: 2904؛ قال الشيخ الألباني: صحيح.

4- صحيح البخاري: 73، 1409، 7141؛ صحيح مسلم: 1930

یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہا: فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ ''رشک دو آدمیوں کے ساتھ کرنا جائز ہے۔ ایک تو اس شخص کے ساتھ جسے اللہ نے قرآن پڑھایا ہو اور وہ دن رات اس کی تلاوت میں مشغول ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ دوسرے اس آدمی کے ساتھ جسے اللہ نے مال دیا ہو اور وہ دن رات اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہو۔''

پھر ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک حدیث آئی ہے:

((عَنْ أَبِي مُوسَىٰ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: «الْمُؤْمِنُ الَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَعْمَلُ بِهِ كَالأُتْرُجَّةِ، طَعْمُهَا طَيِّبٌ وَرِيحُهَا طَيِّبٌ، وَالْمُؤْمِنُ الَّذِي لاَ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَعْمَلُ بِهِ كَالتَّمْرَةِ، طَعْمُهَا طَيِّبٌ وَلاَ رِيحَ لَهَا».))[1]

یعنی ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''مومن جو قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال نارنجی کی طرح ہوتی ہے کہ اس کا ذائقہ بھی خوشگوار اور خوشبو بھی طیب ہوتی ہے اور جو مسلمان قرآن نہیں پڑھتا اس کی حالت کھجور کے مشابہ ہوتی ہے جس کا ذائقہ تو اچھا ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی خوشبو نہیں ہوتی۔''

اب اس آخری حدیث میں آنحضرت ﷺ نے دو گروہوں میں تمیز کر دی ہے یعنی ایک تو وہ گروہ علیحدہ بیان کیا ہے جو صرف قرآن شریف پر عمل ہی کرتا ہے اور اس کی تلاوت میں غفلت کرتا ہے۔ ایسے گروہ کو بے خوشبو کہا ہے۔ اور دوسرا گروہ اس پہلے گروہ سے ممتاز کیا ہے جو عمل بھی کرتا ہے اور تلاوت بھی کرتا رہتا ہے۔ اس گروہ کو خوشبودار ثمر سے مشابہت دی ہے۔ اور اس کی ترجیح بیان فرمائی ہے۔ اس سے اور نیز دوسری حدیثوں سے نہایت صفائی سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ صرف قرآن شریف پر عمل کرنے کی تاکید ہی نہ فرماتے تھے بلکہ تلاوت قرآن شریف کی بھی اسی قدر تاکید فرماتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی تعلیم میں حفظ قرآن کو جس احتیاط اور التزام کے ساتھ ملحوظ رکھا گیا ہے اس سے قرآن پر عمل کرنے کے پہلو کو کہیں جدا نہیں کیا گیا۔ اصل علت غائی حفاظت اور تلاوت کی یہی ہے کہ اس کو عملی زندگی میں ہمیشہ زندہ رکھا جائے اور جذب برکات و نفعات اور کشف و اخذ انوار ربانی اور تزکیہ نفس اور حصول معرفت و قرب الٰہی کے لیے بار بار پڑھ کر اس پر تدبر اور تفکر کیا جائے۔

❀ احادیث میں حفظِ قرآن کی تاکید

ہم نے مشتِ نمونہ از خروارے کے مصداق پر عمل کیا ہے۔ ورنہ جس قدر تاکیدی احکام قرآن شریف کی تلاوت پر مداومت کے متعلق احادیث میں پائے جاتے ہیں اور جتنی اہمیت اس امر کو دی گئی ہے ان صحیح اور مستند روایات کا کتب احادیث میں اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ ان کا یہاں نقل کرنا باعث طوالت و ناظرین کی ملالت کا باعث ہوگا۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں استذکار اور تعاہد قرآن پر ایک علیحدہ باب باندھا ہے۔ اس باب میں بہت سی احادیث اس مضمون کی ہیں کہ جن میں آنحضرت ﷺ نے تلاوت قرآن پر مداومت کی تاکید فرمائی ہے۔ ایسا ہی ایک اور باب بعنوان [تَعْلِيْمُ الصِّبْيَانِ الْقُرْآنَ] قائم کیا ہے۔ جس میں قرآن کریم کے اولاد کو تعلیم کرنے کے احکام ہیں۔ اور ایک تیسرا باب بعنوان [خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَ عَلَّمَهُ] قائم کیا ہے۔ یعنی بہترین انسان وہ ہے جو قرآن شریف پڑھتا اور پڑھاتا ہے اور ایک چوتھا باب [اَلْقِرَائَةُ عَنْ ظَهْرِ الْقَلْبِ] یعنی قرآن شریف کو زبانی یاد کرنے کے احکام اور مراتب کے متعلق باندھا ہے۔

مسلمانوں میں تنقید و تحقیق و صحت روایات کے لحاظ سے بخاری کو [أَصَحُّ الكُتُبِ بَعْدَ كِتَابُ اللهِ] مانا گیا ہے اور اس کتاب

1- صحيح البخاري: 5020، 5059، 5427

میں ہم اس قدر احادیث پاتے ہیں کہ ان سب کا نقل کرنا مشکل ہے۔ اس لیے بنظر اختصار اس جگہ صرف ابواب کے نام لکھ دینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور ان تمام احادیث کا مفصلاً ذکر نہیں کرتے۔ ابواب کے نام ہی اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ آنحضرت ﷺ قرآن حفظ کرنے کی ہر مومن کو تاکید فرماتے رہتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو یاد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ انہی احکام کی تعمیل میں پہلے زمانوں کے مسلمان اگر سارا نہیں تو بعض بعض حصص قرآن شریف کے ضرور یاد کر لیا کرتے تھے۔ اگرچہ اس زمانہ میں بھی ہر ایک اسلامی ملک میں ہزارہا حافظ قرآن شریف کے اور قاری موجود ہیں۔ جو سارا قرآن شریف کمال صحت کے ساتھ حافظہ میں یاد رکھتے ہیں۔ جن کی مثال دنیا کی کسی غیر اسلامی قوم میں موجود نہیں۔ لیکن عرب کے خاص حالات ایسے تھے کہ ان کے لیے قرآن شریف کو ازبر کرنا بہت ہی آسان تھا۔ چنانچہ ولیم میور جیسا معاند اور مخالف اسلام بھی اپنی کتاب لائف آف محمد ﷺ کے دیباچہ کے صفحہ 16 پر اسی خصوصیت کو تسلیم کرتا ہوا لکھتا ہے:

''عرب لوگ نظم کے بہت سرگرم اور جاندادہ مشتاق تھے۔ لیکن ان کے پاس ایسے اسباب موجود نہ تھے کہ جن سے وہ اپنے شاعروں کے کلام کو ضبط تحریر میں لا سکتے۔ اس لیے بہت مدت تک ان میں یہی رواج رہا کہ اپنے شعرا کے کلام اور اپنی قوم اور آباءواجداد کے تاریخی واقعات کو دل کی زندہ الواح پر ہی بہت عمدگی اور صحت کے ساتھ طبع کر لیتے۔ اس طرز سے ان میں قوت حافظہ کمال درجہ ترقی پر پہنچ گئی ہوئی تھی۔ اور یہی قوت حافظہ اس نئی پیدا شدہ روح کے ساتھ پورے اخلاص اور شوق سے قرآن (کریم) کے حفظ کرنے میں کام آئی۔''

❀ عہدۂ امامت حاصل کرنے میں تحریص حفظ قرآن

ہم نے چند احادیث جو اوپر لکھی ہیں ان سے یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ یہ بھی چاہتے تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم علم قرآن میں ایک دوسرے پر فوقیت اور سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی چند ایسے اسباب موجود تھے کہ جن کی وجہ سے قرآن شریف کے حفظ کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کے لیے صحابہ کوشش کرتے رہتے تھے۔ ازاں جملہ ایک یہ بات تھی کہ نمازوں میں امامت کرانے کے لیے وہ شخص ہی معزز عہدۂ امامت کے لیے منتخب کیا جاتا تھا جو دوسروں سے علم قرآن میں بڑھا ہوا ہو۔ چنانچہ اس عزت کو حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے بڑھ کر قرآن شریف کو یاد کرنے میں محنت کرتا۔ تمام صحیح احادیث اسی بات کو ثابت کرتی ہیں۔ یہ امامت دراصل مسلمانوں میں ایک نہایت عزت کا مقام اور اعلیٰ مرتبہ تھا۔ خود حضور ﷺ بھی امام تھے اور شریعت اسلامی میں اس امت کے معزز اور مقتدر عہدہ پر ماموریت کا قرعہ اسی شخص کے حق میں بلالحاظ قومیت و وجاہت و عمر پڑتا۔ جو علم قرآن میں دوسروں سے بڑھا ہوا ہوتا۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے:

((عَنْ عَمْرِو بْنِ سَلَمَةَ قَالَ: كُنَّا بِحَاضِرٍ يَمُرُّ بِنَا النَّاسُ إِذَا أَتَوْا النَّبِيَّ ﷺ فَكَانُوا إِذَا رَجَعُوا مَرُّوا بِنَا، فَأَخْبَرُونَا أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: كَذَا وَكَذَا، وَكُنْتُ غُلَامًا حَافِظًا، فَحَفِظْتُ مِنْ ذٰلِكَ قُرْآنًا كَثِيرًا، فَانْطَلَقَ أَبِي وَافِدًا إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي نَفَرٍ مِنْ قَوْمِهِ، فَعَلَّمَهُمْ الصَّلَاةَ فَقَالَ: «يَؤُمُّكُمْ أَقْرَؤُكُمْ». وَكُنْتُ أَقْرَأَهُمْ لِمَا كُنْتُ أَحْفَظُ، فَقَدَّمُونِي فَكُنْتُ أَؤُمُّهُمْ.))[1]

یعنی عمرو بن سلمہ سے روایت ہے کہ ہم (یعنی ہماری قوم) ایک دفعہ کسی مقام پر ڈیرہ افگن ہوئی جو پانی کے قریب تھا۔ اور جو لوگ آنحضرت ﷺ کے حضور میں جاتے وہ اسی راہ سے جاتے تھے جو ہمارے پاس سے گزرتا تھا۔ جب وہ واپس آتے تو ہمیں تمام وحی جو حضور ﷺ سے تازہ سن کر آتے سنا جاتے تھے۔ میں ابھی بچہ ہی سا تھا (قریب آٹھ سال کی عمر تھی) پر میری قوت

1- صحيح البخاري: 4302؛ سنن أبي داود: 585؛ وقال الشيخ الألباني: صحيح.

حافظ بہت تیز تھی۔ جو جو میں سنتا جاتا تھا حفظ کرتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اکثر حصہ قرآن شریف کا اسی طرح ان لوگوں سے ہی میں نے یاد کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد میرا باپ اپنی قوم کے ساتھ بہت سارے عمائد کو ساتھ لے کر اسلام قبول کرنے کے لیے سرور کائنات ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں آنحضرت ﷺ نے انہیں داخل اسلام فرمایا اور ان کو نماز کی تلقین فرمائی اور حکم دیا کہ ''تم میں نماز میں امامت وہ شخص کرایا کرے جو سب سے زیادہ قرآن جانتا ہو۔'' چونکہ میں نے قرآن کا بہت حصہ پہلے حفظ کیا ہوا تھا۔ اس لیے امامت کا حق میرا ہی تھا۔ پس مجھے ہی سب نے امام منتخب کیا۔ اور میں ہی نمازوں میں ان کا امام ہوتا رہا۔''

یہ حدیث ابوداؤد میں درج ہے اور بخاری اور دوسرے محدثین نے بھی اس کو لکھا ہے۔ ایسا ہی جب کبھی کوئی نئی قوم اسلام میں داخل ہوتی تو ان میں امامت کے فرائض ادا کرنے اور مسائل اسلام کی تلقین دینے کے لیے وہی شخص بھیجنے کے لیے منتخب کیا جاتا تھا جو علم قرآن میں فائق اور سابق ہوتا تھا۔

❀ کثرتِ تلاوت قرآن میں آنحضرت ﷺ کا نمونہ

خود آنحضرت ﷺ خلوت و جلوت میں قرآن شریف کی اکثر تلاوت فرماتے رہتے اور اپنا نمونہ پیش کرتے رہتے تھے۔ ناظرین یہ خیال نہ کریں کہ آنحضور ﷺ صرف نمازوں ہی میں لمبی لمبی سورتیں پڑھنے پر اکتفا کیا کرتے تھے۔ بلکہ ہمارے سامنے ایسے کئی واقعات موجود ہیں کہ سفر کو جاتے ہوئے اونٹ پر سواری کی حالت میں کئی سورتیں پڑھ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ بخاری میں یہ روایت ہے:

((عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ وَهُوَ يَقْرَأُ عَلَى رَاحِلَتِهِ سُورَةَ الْفَتْحِ.))[1]

یعنی میں نے رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ کے روز دیکھا کہ آپ اپنے اونٹ پر سوار تھے اور آپ ﷺ سورۂ فتح تلاوت فرما رہے تھے۔

آنحضور ﷺ کو دوسروں سے قرآن سننے سے بھی بڑی محبت تھی۔ اور یہ محبت ایسی بڑھی ہوئی تھی کہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر بھی صحابہ کا قرآن کریم پڑھنا سنا کرتے تھے۔ چنانچہ بخاری [باب نِسْيَانِ الْقُرْآنِ] میں اس قسم کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ رات کو جب ایک شخص نماز میں قرآن پڑھ رہا تھا تو آپ سن رہے تھے۔ اسی طرح بخاری میں یہ روایت بھی درج ہے:

((عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ: قَالَ لِيَ النَّبِيُّ ﷺ: «اقْرَأْ عَلَيَّ». قُلْتُ: آقْرَأُ عَلَيْكَ وَعَلَيْكَ أُنْزِلَ؟ قَالَ: «فَإِنِّي أُحِبُّ أَنْ أَسْمَعَهُ مِنْ غَيْرِي». فَقَرَأْتُ عَلَيْهِ سُورَةَ النِّسَاءِ حَتَّى بَلَغْتُ ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾﴾ [النساء: 41] قَالَ: «أَمْسِكْ». فَإِذَا عَيْنَاهُ تَذْرِفَانِ.))[2]

یعنی عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کہا رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ مجھے فرمایا کہ ''کچھ قرآن سناؤ۔'' میں نے جواب میں عرض کیا کہ میں حضور! کیا میں آپ کو سناؤں اور آپ پر تو نازل ہوا ہے؟ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''ہاں'' (اور دوسری روایت میں ہے کہ ''مجھے یہ اچھا لگتا ہے کہ دوسروں کو پڑھتا سنوں۔'') یہ بات سن کر میں نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی یہاں تک کہ جب میں اس آیت پر پہنچا ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا﴾ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس وقت بس کرو۔'' جب میں نے آپ کی طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو چل رہے تھے۔

1- صحيح البخاري: 5034، 4281، 4835؛ صحيح مسلم: 1890

2- صحيح البخاري: 4582، 5049، 5050، 5055، 5056

ختم قرآن کی معیاد سے حفظِ قرآن کی شہادت

تلاوت میں کثرت کا صحابہ کو اتنا شوق تھا کہ بعض صحابی ہر رات قرآن شریف ختم کرلیا کرتے تھے اور یہ حالت دیکھ کر آنحضرت ﷺ نے انہیں ایسا طریق اختیار کرنے کی ہدایت دینی پڑی کہ جو ان پر بار نہ ہو۔ چنانچہ بخاری میں ایک باب اس مضمون پر ہے کہ کتنے دنوں میں قرآن ختم کرنا چاہئے۔ اس باب میں ایک حدیث وارد ہوئی ہے کہ ایک صحابی کی نسبت آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا کہ وہ ہر رات قرآن شریف کا ختم کرتا ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے اسے بلا کر ہدایت فرمائی کہ قرآن پڑھنے میں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ آہستگی سے تلاوت کرنی چاہئے۔ ایک رات نہیں بلکہ سات دنوں میں یا پانچ دنوں میں یا کم از کم تین دنوں میں ختم کرنا چاہیے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ایسے بزرگ بھی موجود تھے جنہیں قرآن شریف کے حفظ پر اتنی دسترس تھی کہ وہ ایک رات میں ہی سارا قرآن ختم کرلیا کرتے تھے۔ اور آنحضرت ﷺ کے اس حکم دینے سے کم از کم تین دنوں میں قرآن ختم کرنا چاہیے یہ منشا تھی کہ قرآن کو طوطے کی طرح بلا مطلب سمجھے نہیں پڑھتے رہنا چاہئے۔ بلکہ اس کو غور و خوض اور تدبر و تفکر سے پڑھنا چاہئے۔ ایک اور حدیث میں جو مسند دارمی میں ہے یوں ہے:

((عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! فِي كَمْ أَخْتِمُ الْقُرْآنَ؟ قَالَ: «اخْتِمْهُ فِي شَهْرٍ». قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ إِنِّي أُطِيقُ. قَالَ: «اخْتِمْهُ فِي خَمْسَةٍ وَعِشْرِينَ». قُلْتُ: إِنِّي أُطِيقُ. قَالَ: «اخْتِمْهُ فِي عِشْرِينَ». قُلْتُ: إِنِّي أُطِيقُ. قَالَ: «اخْتِمْهُ فِي خَمْسَ عَشْرَةَ». قُلْتُ: إِنِّي أُطِيقُ. قَالَ: «اخْتِمْهُ فِي عَشْرٍ». قُلْتُ: إِنِّي أُطِيقُ. قَالَ: «اخْتِمْهُ فِي خَمْسٍ». قُلْتُ: إِنِّي أُطِيقُ. قَالَ: «لاَ».))[1]

یعنی عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس نے حضور ﷺ سے عرض کیا یارسول اللہ! میں کتنے عرصہ میں قرآن ختم کیا کروں۔ فرمایا کہ ''ایک ماہ میں۔'' اس نے عرض کیا کہ میں اس سے جلدی ختم کر سکتا ہوں۔ فرمایا: ''پچیس دنوں میں ختم کیا کرو۔'' اس نے عرض کیا کہ میں تو اس سے بھی جلدی ختم کر سکتا ہوں۔ فرمایا: ''بیس دنوں میں ختم کیا کرو۔'' اس نے عرض کیا میں اس سے بھی جلدی ختم کر سکتا ہوں۔ فرمایا: ''پندرہ دنوں میں ختم کیا کرو۔'' اس نے عرض کیا کہ میں اس سے بھی جلدی ختم کر سکتا ہوں۔ فرمایا: ''دس دنوں میں ختم کیا کرو۔'' اس نے عرض کیا کہ میں اس سے بھی جلدی ختم کر سکتا ہوں۔ فرمایا: ''پانچ دنوں میں ختم کیا کرو۔'' اس نے عرض کیا کہ میں اس سے بھی جلدی ختم کر سکتا ہوں۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''بس۔'' یعنی اب اس سے کم میعاد نہیں ہو سکتی۔

ایسا ہی فتح الباری شرح صحیح البخاری جلد 9 صفحہ 53 پر یہ حدیث منقول ہے:

((قَالَ ابْنَ مَسْعُودٍ: اقْرَءُوا الْقُرْآنَ فِي سَبْعٍ، وَلاَ تَقْرَءُوهُ فِي أَقَلَّ مِنْ ثَلاَثٍ.))

یعنی قرآن کریم کو سات دنوں میں پڑھا (ختم کیا) کرو اور تین دنوں سے کم مدت میں ہر گز ختم نہ کرو۔

ایسا ہی اسی کتاب میں ایک اور حدیث منقول ہے جو یہ ہے:

((عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يَخْتِمُ الْقُرْاٰنَ فِيْ اَقَلَّ مِنْ ثَلٰثٍ.))

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی ﷺ قرآن شریف کو تین دنوں سے کم عرصہ میں ختم نہیں کیا کرتے تھے۔

1- صحيح مسلم: 2787، 2799

❀ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حافظانِ قرآن کی کثرت

اکثر معتبر اور صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے صحابہ کی کثیر جماعت کو قرآن کریم حفظ تھا۔ چنانچہ قراء کی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔ قراء کا اصل مفہوم یہ ہے ''قرآن شریف اوروں کو سکھانے کے لیے حفظ کرنے والے لوگ''۔ چنانچہ صاحب فتح الباری نے لفظ قراء کے یہی معنی کیے ہیں۔ قراء کے معنی یہ ہیں:

((اَلَّذِيْنَ اشْتَهَرُوْا بِحِفْظِ الْقُرْاٰنِ وَالتَّصَدِّيْ لِتَعْلِيْمِهِ.))

''وہ لوگ جو قرآن شریف کو حفظ کرنے اور دوسروں کو قرآن شریف سکھلانے کے لیے مشہور تھے''۔

اس میں شک نہیں کہ اس لفظ کے ذیل میں آنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ انہیں کامل طور پر علم قرآن بھی ہو۔ احادیث سے ثابت ہے ستر قراء کو کفار نے آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بئر معونہ کے قریب قتل کر دیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حافظان قرآن کی صحابہ میں کیسی کثرت تھی۔ [بَابُ الْقُرَّاءِ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ] کی ذیل میں حضرت امام بخاری نے بہت سی احادیث بیان فرمائی ہیں۔ ازاں جملہ ایک یہ ہے:

((ذُكِرَ عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْعُودٍ عِنْدَ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو فَقَالَ: ذَاكَ رَجُلٌ لاَ أَزَالُ أُحِبُّهُ، سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: «خُذُوا الْقُرْآنَ مِنْ أَرْبَعَةٍ؛ مِنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ، وَسَالِمٍ مَوْلَى أَبِي حُذَيْفَةَ، وَمُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ، وَأُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ».))[1]

یعنی عبداللہ بن عمر نے عبداللہ بن مسعود کا ذکر کرتے ہوئے کہا میں ہمیشہ اس آدمی سے محبت کرتا رہوں گا۔ کیونکہ میں نے نبی ﷺ کو یہ بات فرماتے سنا کہ ''چار آدمیوں عبداللہ بن مسعود، سالم و معاذ و ابی بن کعب سے قرآن سیکھو۔''

اس حدیث سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کا علم اور قرآن کی تعلیم دینا انہیں چار بزرگوں تک محدود تھا اور دوسرے صحابہ میں یہ قابلیت پیدا نہ ہوئی تھی۔ اور نہ ہی اس حدیث کے الفاظ میں یہ بات موجود ہے کہ گویا ان چاروں کے سوائے کوئی دوسرا صحابی قرآن کو یاد نہ رکھتا تھا اور اس کو پڑھا نہ سکتا تھا۔ یہ بات ثابت ہے کہ تمام صحابہ قرآن شریف کا کچھ نہ کچھ حصہ جانتے تھے۔ اور یہ امر بھی عیاں ہے کہ ان میں کثیر التعداد ایسے لوگ تھے جو قرآن شریف کے حافظ تھے۔ لیکن قرآن شریف کا معلم بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس شخص میں فہم قرآن بھی اعلیٰ درجہ کا ہو اور علم قرآن بھی بہت بڑھ کر ہو۔ اس حدیث میں ان لوگوں کی معلمیت کی حیثیت کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی اس قابلیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی وہ لوگ اچھی طرح قرآن سکھانے کی قابلیت رکھتے تھے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ قرآن شریف کی تمام سورتوں کو اچھی طرح سکھا سکتے تھے۔ اس لیے خود پورے قرآن شریف کے حافظ تھے اور ایک یہ وجہ بھی ہے کہ صحابہ کی جماعت بہت کثیر تھی۔ اس لیے ہر ایک آدمی کو یہ موقعہ میسر نہیں آسکتا تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ ہی سے آیات قرآنی سن سکتا۔ اکثر نے اگر کچھ حصہ آنحضرت ﷺ سے سنا بھی ہوگا تو کثیر حصہ بالواسطہ سیکھا۔ پس شاید ان چار کا نام اس واسطے لیا کہ انہوں نے اکثر حصہ قرآن شریف کا آنحضرت ﷺ کے دہن مبارک سے بلاواسطہ سنا اور سیکھا تھا۔ چنانچہ ان میں سے ایک عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اگلی حدیث میں کہتے ہیں کہ میں نے ستر سے زیادہ سورتیں آنحضرت ﷺ سے بلاواسطہ حاصل کیں۔

❀ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت علم قرآن میں

غرض اسی قسم کی کئی خصوصیتیں ہوں گی جن کی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے ان چاروں کا نام اس حدیث میں لیا ہے۔ ورنہ

1- صحيح البخاري: 3758، 3760، 3806، 3808، 4999؛ صحيح مسلم: 6488

احادیث صحیحہ معتبرہ سے ثابت ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بکثرت ایسے لوگ موجود تھے جن کو نہ صرف قرآن شریف از بر یاد ہی تھا بلکہ ان کو فہم قرآن بھی اعلیٰ درجہ کا عطا کیا گیا تھا۔ ان لوگوں میں سے بطور مثال ہم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہی نام نامی پیش کرتے ہیں۔ حضرت صدیق صاحب کمالات ظاہری و باطنی یار غار رسول کریم ﷺ تھے اور خود آنحضرت ﷺ نے ان کی قرآن دانی اور قرآن فہمی کا سب سے فائق ہونا کئی موقعوں پر بیان فرمایا۔ مثلاً: آپ کے آخری ایام کے ہی چند واقعات لے لو۔ آخری ایام کے واقعات ہم اس لیے لیتے ہیں کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ شاید بعد میں دوسرے صحابہ نے فوقیت حاصل کر لی ہو۔ ان واقعات میں سے ایک واقعہ تو یہ ہے کہ جب سورۃ النصر نازل ہوئی تو ذکر ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ رو پڑے۔ جب بعض لوگوں نے تعجب کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابو بکر تم سے بہتر قرآن سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس سورہ میں یہ اشارہ تھا کہ اب آنحضرت ﷺ کے اس دنیا سے کوچ کر جانے کا وقت قریب آگیا ہے اور اسی لیے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ رو بھی پڑے تھے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ مسجد میں جس قدر دریچے ہیں وہ سب بند کر دیئے جائیں۔ سوائے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دریچہ کے۔ اس میں بھی یہ اشارہ تھا کہ جو دسترس آپ کو علم قرآن میں حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نہیں۔

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آخری بیماری کے دنوں میں آنحضرت ﷺ نے انہی کو امام مقرر فرمایا۔ اب یہ بات صحیح اور معتبر احادیث سے ثابت ہے کہ نمازوں کے لیے امام وہی شخص منتخب ہونا چاہیے جو سب سے بڑھ کر علم قرآن میں فوقیت رکھتا ہو۔ جب کہ امامت کے لیے قرآن شریف کے علم میں برتری ایک شرط اولیٰ آپ نے ہمیں بتلائی۔ تو جس شخص کو آپ نے امامت کے لیے منتخب کیا ضرور ہے کہ اس کو علم قرآن میں تمام جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم پر ہر طرح کی فوقیت آپ کے نزدیک مسلم ہو۔ یہاں تو ابو بکر رضی اللہ عنہ کو سب صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بڑھ کر قرآن جاننے والا مانا گیا۔ لیکن وہاں اس حدیث میں جہاں چاروں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا اسم گرامی بیان نہ کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس حدیث میں جن ناموں کا ذکر ہے وہ حصر کے طور پر نہیں بلکہ کسی خصوصیت کی وجہ سے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ قرآن شریف کے حافظ بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے گھر کے صحن میں ایک مسجد بھی بنا رکھی تھی جس میں وہ ہر روز بلا ناغہ بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ بلکہ کفار نے ان کو ایک دفعہ اس سے روکا بھی تھا اور یہ کہا تھا کہ اس طرح قرآن شریف سنا کر تم ہماری عورتوں اور بچوں کو مسلمان کر لوگے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضور سرور کائنات ﷺ کے حضور میں ہر وقت کی حاضر باشی کا شرف ان کو سب سے بڑھ کر نصیب ہوا۔ ان امور سے صاف طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ قرآن شریف کے حافظ بھی تھے۔ اور فہم و علم قرآن میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بڑھے ہوئے تھے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آنحضرت ﷺ ان کو منصب امامت اور جادہ خلافت پر ممتاز نہ فرماتے۔

❀ حافظانِ قرآن کے نام

اسی طرح عبداللہ بن عمرو نے ایک حدیث بیان کی ہے جو نسائی میں موجود ہے اور جس کے راوی معتبر تسلیم کیے گئے ہیں۔ اور وہ یہ ہے:

((عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: جَمَعْتُ الْقُرْآنَ فَقَرَأْتُ بِهِ فِيْ كُلِّ لَيْلَةٍ فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ لِيْ: «اِقْرَأْ بِهِ فِيْ كُلِّ شَهْرٍ».))[1]

یعنی عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ میں نے سارا قرآن اپنے حافظہ میں جمع کر لیا یعنی از بر کر لیا۔ اور میری عادت تھی کہ ہر رات ایک

1- سنن النسائي الكبرى: 8064-(24/5)؛ مسند الإمام أحمد: 6516-(163/2)؛ قال الشيخ شعيب الأرنؤوط: صحيح لغيره؛ سنن ابن ماجه: 1346؛ قال الشيخ الألباني: صحيح.

قرآن ختم کر چھوڑا کرتا تھا۔ اس امر کی اطلاع حضرت سرور کائنات ﷺ کو ہو گئی تو آپ نے مجھے ہدایت فرمائی کہ ''ایسا مت کیا کرو بلکہ قرآن شریف کو ایک مہینے میں ختم کیا کرو۔''

غرض اسی طرح صحابہ کبار کی جماعت میں بہت سے صحابی ایسے ثابت ہوتے ہیں جن کو قرآن شریف ازبر تھا اور چاروں خلفاء یعنی حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان، حضرت علی اور طلحہ، سعد، ابن مسعود، سالم رضی اللہ عنہم اجمعین کے نام حافظان قرآن میں صحیح روایات میں موجود ہیں۔ مرد تو خیر قرآن شریف کے حافظ اور عالم تھے ہی صحابہ رضی اللہ عنہم میں عورتیں بھی اس کے حفظ کرنے کی عزت سے محروم نہ رہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا وغیرہ کے گرامی اسماء تاریخ کی اس فہرست کو زینت دے رہے ہیں۔ مہاجرین کے علاوہ انصار میں بھی قرآن شریف کے لیے ایسی ہی محبت اور شوق تھا۔ لیکن اس جگہ فہرست دینے سے طول ہوتا ہے۔ یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں بے سمجھی سے کام لینے والے متعصب لوگ یہی نہ سمجھ لیں کہ قرآن کریم کے حافظ صرف اتنے لوگ ہی تھے جن کے نام لکھے گئے ہیں۔ ایسا گمان واقعات سے بہت بعید ہو گا۔ کیونکہ ابھی ہم دکھلا آئے ہیں کہ صرف ایک ہی موقع پر کفار نے ستر قراء کو قتل کر دیا تھا جس سے کثرت قراء کا ثبوت کافی طور پر ملتا ہے۔ ان کے علاوہ غزوۂ یمامہ میں جو آنحضرت ﷺ سے تھوڑے دن بعد واقعہ ہوا قریباً اسی قدر قراء شہید ہوئے جن میں مذکورین کے زمرہ سے حضرت سالم تھے۔ جب جنگ یمامہ کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا کہ جنگ یمامہ میں ہمارے اکثر قراء کام آ گئے اس لیے اب ضروری ہے کہ قرآن شریف ایک ہی جلد میں جمع کر دیا جائے۔ تو اس موقع پر انہوں نے صرف سالم کا نام نہ لیا تھا بلکہ کہا تھا کہ

((قَالَ أَبُو بَكْرٍ: إِنَّ عُمَرَ أَتَانِي فَقَالَ: إِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ يَوْمَ الْيَمَامَةِ بِقُرَّاءِ الْقُرْآنِ.))[1]

یعنی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ غزوہ یمامہ میں قرآن شریف کے بہت سے قراء قتل ہو گئے ہیں۔

اگر صرف وہی لوگ حافظ اور قراء قرآن ہوتے جن کے نام لکھے گئے ہیں تو حضرت عمر کو چاہیے تھا کہ صرف سالم کا ہی نام لیتے۔ کیونکہ نامزد لوگوں سے تو صرف ایک سالم ہی وہاں کام آئے تھے۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہاں کثرت سے حافظ شہید ہو گئے۔ جس سے یہ بات بین طور پر ثابت ہوتی ہے کہ قراء و حفاظ قرآن بکثرت تھے۔

❀ قوم خزرج کے چار جامعین قرآن

بخاری میں ایک یہ حدیث منقول ہے:

((عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: مَاتَ النَّبِيُّ ﷺ وَلَمْ يَجْمَعِ الْقُرْآنَ غَيْرُ أَرْبَعَةٍ؛ أَبُوالدَّرْدَاءِ وَمُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَأَبُوزَيْدٍ.))[2]

یعنی انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ وفات پا گئے اور سوائے چار اشخاص ابودرداء و معاذ بن جبل و زید بن ثابت و ابوزید رضی اللہ عنہم کے کسی نے قرآن جمع نہ کیا۔

اور ایک روایت میں جو بخاری ہی میں ہے بجائے ابودرداء کے اُبی بن کعب کا نام ہے۔ جمع کے عام معنی تو احادیث میں کتاب کی صورت میں جمع کرنے کے ہی آئے ہیں۔ پس اگر یہی معنی اس حدیث سے مراد لیے جائیں تو اس سے قرآن شریف کے حافظوں کی تعداد کا حصر نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی تعارض ان احادیث صحیحہ سے واقع ہوتا ہے جو اوپر نقل کی گئی ہیں۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر چار آدمی قرآن

1- صحيح البخاري: 4986؛ جامع الترمذي: 3103

2- صحيح البخاري: 5004

شریف کو ایک جا جمع کر چکے تھے اور کتاب کی صورت میں کلام ان کے پاس موجود تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اتنا خوف کیوں ظاہر کیا۔ اور حضرت زید نے اس کام کو اتنا مشکل کیوں سمجھا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور زید رضی اللہ عنہ کا منشا ان اصل مسودات کو جمع کرنا تھا جو آنحضرت ﷺ کی ہدایت کے مطابق آپ کے کاتبوں نے لکھے تھے۔ اس لیے ان کا مطلب اسے حل نہ ہوتا تھا کہ کسی کا اپنے طور پر جمع کیا ہوا قرآن شریف ان کو مل جائے۔ اور یہی معنی اس حدیث کے کرنے پڑیں گے جس میں یہ لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ وفات پا گئے اور قرآن شریف کسی چیز میں جمع نہ تھا۔ یعنی مطلب اس کا یہ ہوگا کہ وہ مسودات جو آنحضرت ﷺ کی ہدایت کے مطابق لکھے گئے تھے وہ ایک جگہ جمع نہ کیے گئے تھے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ اس سے صحیح اور معتبر احادیث میں کسی قسم کا تعارض باقی نہیں رہتا۔ اور اگر لفظ جمع کے دوسرے معنے مراد لیے جاویں یعنی کل قرآن شریف کا حفظ کرنا تو اس صورت میں حدیث کے معنی سمجھنے کے لیے پہلے واقعات کو دیکھنا چاہیے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ یثرب میں (جو آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری سے مدینہ منورہ ہو گیا) دو قومیں خزرج اور اَوس رہتی تھیں۔ ان دو قوموں میں عرب جاہلیت کے زمانہ کی طرح باہمی سخت عداوت اور بغض تھا۔ پھر جب یہ دونوں قومیں مسلمان ہو گئیں تو ان میں دشمنی دور ہو گئی۔ اور سب ایک دوسرے کے بھائی ہو گئے۔ لیکن ترقیات دینی میں رشک ضرور رہا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ قوم خزرج میں سے تھے۔ ایک موقعہ پر قوم اَوس کے بعض افراد نے اپنے چار آدمیوں کی نسبت بڑے فخر سے ذکر کیا اور ان کی شہرت اور عظمت پر بڑا ناز ظاہر کیا۔ اس فخریہ بات کا جواب دوسری رقیب قوم کی طرف سے بھی ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اپنی قوم کے چار آدمیوں کے نام لے کر ان کی ایک بہت بڑی خدمت اسلام اور بڑا نمایاں کام بیان کیا۔ یعنی قوم خزرج میں سے یہ چار ایسے بزرگ ہوئے ہیں کہ جنہوں نے قرآن شریف کو جمع کیا۔ جس کا مطلب یا تو یہ ہے کہ ان کو قرآن شریف ازبر تھا اور یا یہ کہ انہوں نے متفرق مسودوں کو خود قرآن شریف سے نقل کر لیا ہوا تھا۔

بہر حال حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ بیان تو صرف ایک رقیب قوم کے مقابل میں بطور جواب تھا۔ جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ یہ چاروں بزرگ جن کا نام حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اپنی روایت میں لیا ہے ان کی ہی قوم میں سے تھے۔ تو اس بات کے ثبوت پر زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے۔ ورنہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو عبداللہ بن مسعود اور سالم اور کئی دوسرے مشہور انصار و مہاجرین کے ناموں کو چھوڑ کر انہی چاروں پر حصر کر لینا کہاں درست ہو سکتا تھا۔ وہ تو ایسے بزرگ تھے کہ جن کی قرآن دانی آفتابِ عالمتاب کی طرح مسلم اور روشن ہے۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ ایسے ناواقف نہ تھے کہ اگر کلی طور پر روایت کرتے تو مشاہیر قرآن دانوں اور جامعانِ قرآن کے اسماء کو ناواقفیت کی وجہ سے چھوڑ دیتے۔ پس ظاہر ہے کہ یہ کلمات ان کے اپنی قوم کی عظمت قوم اَوس کے مقابلہ پر ظاہر کرنے کے لیے تھے۔

❀ نماز سے حفظ قرآن میں مدد

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ قرآن شریف کا یاد کرنا بعض اغراض کے لیے ہر مسلمان کے لیے لازمی تھا خواہ اس کا تھوڑا حصہ یاد کرے یا بہت یا سارا ہی کرے۔ کیونکہ ہر مسلمان پر نماز ایک ضروری فرض ہے اور نماز میں قرآن شریف ضروری طور پر پڑھا جاتا ہے۔ بغیر قرآن شریف کے بعض حصص پڑھنے کے نماز ہوتی ہی نہیں۔ گویا نماز پڑھنے کا حکم من وجہ قرآن کے کل یا جزو کے حفظ کرنے کا حکم ہے۔ جو ہر مسلمان پر مسلمان رہنے کے لیے فرض ہے۔ اور نماز صرف ایک دفعہ ہی نہیں بلکہ دن میں کم از کم پانچ دفعہ پڑھی جاتی ہے۔ اور ہر دفعہ کی نماز میں کئی کئی رکعتیں ہوتی ہیں۔ اور عموماً ہر رکعت میں علاوہ معینہ سورہ قرآن یعنی فاتحہ کے کوئی نہ کوئی حصہ قرآن شریف کا ضرور پڑھنا پڑتا ہے۔ صحابہ کی نسبت یہ ثابت ہے کہ وہ عموماً نمازیں دل کے سچے لگاؤ سے پڑھا کرتے تھے اور خشوع و خضوع سے اپنے اس فرض کو ادا کیا کرتے تھے اور نماز کو اپنا ہتھیار اور خدا سے قرب کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ ان کی نسبت یہ ثابت ہے کہ وہ نمازوں میں دیر تک قیام

کیا کرتے اور زیادہ لمبے عرصہ تک قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ان پانچوں نمازوں کے علاوہ ایک اور نماز ہے جو رات کے آخری حصہ میں پڑھی جاتی ہے اور جس کو نماز تہجد کہتے ہیں۔اس نماز تہجد میں خصوصیت کے ساتھ وہ لوگ جو بڑے بڑے حصص قرآن شریف کے پڑھا کرتے تھے۔بلکہ خود آنحضرت ﷺ بھی نماز تہجد میں بہت قرآن شریف پڑھا کرتے۔ یہاں تک کہ آپ کی نسبت بعض احادیث میں آیا ہے کہ بعض دفعہ ایک ہی رکعت میں قرآن شریف کے آٹھ نو پارے یعنی 3/1 حصہ قرآن شریف کے قریب آپ نے پڑھا تھا اور صحابہ کی طرز زندگی یہی تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کے عمل و فعل کو اپنے مسلک کے لیے نمونہ سمجھتے تھے اور آپ ہی کے نمونہ پر چلتے تھے۔اور اس لیے وہ بھی تہجد میں بہت قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔

چنانچہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے تہجد میں قرآن شریف پڑھنے کا جو ذکر آگیا ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ایک صحابی کی نسبت لکھا ہے کہ انہوں نے ایک ہی رکعت میں سورۃ البقرہ کو پڑھا اور یہ سورہ قرآن شریف کا بارہواں حصہ یعنی اڑھائی پارے ہیں۔ تہجد کی نماز کے متعلق آنحضرت ﷺ کو تو یہ حکم تھا کہ ﴿قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ﴾ [المزمل: 3-2] ''یعنی نصف رات یا اس کے قریب قیام کرو''۔اور اسی حکم الٰہی کی تعمیل میں آپ اس قدر کھڑے ہوا کرتے تھے کہ صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے پاؤں بھی سوج جاتے تھے۔ مگر صحابہ کو بھی یہ حکم تھا کہ ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ [المزمل: 3-2] اور سارے معذوریت کے اسباب گن کر کہ خدا یہ بھی جانتا ہے کہ بعض تم میں سے بیمار ہوں گے اور بعض جہاد کریں گے اور بعض سفر میں ہوں گے پھر بھی حکم دیا کہ قرآن شریف تہجد میں پڑھا ضرور کرو۔ہاں بیمار مسافر مجاہد کے لیے اجازت ہے کہ بہت نہیں تو تھوڑا ہی پڑھ لے۔

قرآن شریف میں اس تاکید کو پاکر صحابہ کہاں غافل رہ سکتے تھے۔ کثرت سے روایات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا حصہ قرآن شریف کا رات کو تہجد میں پڑھا کرتے تھے۔بلکہ بعض تو اس قدر مبالغہ اس میں کرتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کو یہ ہدایت دینی پڑی کہ اتنے وقت سے کم میں قرآن شریف ختم نہ کیا جائے۔ آنحضرت ﷺ کا یہ نمونہ صرف تہجد ہی کی نمازوں تک محدود نہ تھا بلکہ آپ جماعت کی نمازوں میں بھی بہت قرآن کریم پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جماعت کراتے وقت پہلے سورۃ النساء پڑھی اور پھر اس کے بعد سورۂ آل عمران پڑھی۔ یہ دونوں سورتیں قرآن شریف کا آٹھواں حصہ ہوتی ہیں۔اب ظاہر ہے کہ جب کہ صرف ایک ہی نماز میں قرآن شریف کا اتنا بڑا حصہ پڑھا گیا تو کس قدر تکرار کا قرآن شریف کے پڑھے جانے میں ثبوت ملتا ہے۔

بہت ساری حدیثیں اس بات کی گواہ ہیں کہ صبح کی نماز کی ایک رکعت میں سورۃ البقرہ جیسی لمبی سورتیں پڑھی جاتی تھیں شام کی نمازوں کے لیے اتنا وقت نہیں مل سکتا کہ لمبی سورتیں ان میں پڑھی جا سکیں۔ مگر آنحضرت ﷺ سورۃ الطور جیسی سورتیں ان میں بھی پڑھا کرتے تھے۔اور یہ بھی لمبی سورہ ہے جس میں پچاس کے قریب آیات ہیں۔اسی طرح جب کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی کہیں نماز میں امامت کا موقعہ ملتا تو آنحضرت ﷺ کے نمونہ پر وہ بھی عمل کرتے اور ان کی طرح نمازوں میں لمبی لمبی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ کئی دفعہ ان کی لمبی سورتیں پڑھنے کی شکایتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔

ایک دفعہ ایک صحابی نے عشاء کی نماز میں سورۃ البقرہ تمام کی۔ مقتدیوں میں ایک شخص تھے جو دن کی محنت کے تھکے ماندے تھے اور وہ جلد آرام کرنے کے واسطے جانا چاہتے تھے۔ان کو اس لمبی قراءت کی وجہ سے تکلیف ہوئی اور اس پر انہوں نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کی۔ایسا ہی یہ بھی ثابت ہے کہ وہ لوگ اپنی تنہائی کی نمازوں میں بھی لمبی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔بلکہ ان نمازوں میں تو جی کھول کھول کر وہ لوگ قراءت لمبی پڑھتے تھے۔اب اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ وہ لوگ صرف قرآن شریف کو ایک دفعہ یاد ہی نہ کر لیا کرتے تھے بلکہ جتنا قرآن ان کو یاد ہوتا تھا اس پر نمازوں میں اور نمازوں سے باہر اس کثرت سے تکرار کی مواظبت اور مداومت

کرتے رہتے تھے کہ وہ ہمیشہ حافظہ میں تازہ رہتا تھا۔ اگر قرآن شریف کی ایک آیت بھی لکھی نہ جاتی تو حافظوں کے الواح قلب پر اس کے نقش ایسے کندہ تھے کہ ایک نقطہ بھی اس کا ضائع نہ ہونے پاتا۔ قرآن شریف نمازوں میں اور نمازوں سے باہر پڑھنے کی اس قدر کثرت سے آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی عادت تھی کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ بعض سورتیں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے نمازوں میں بار بار پڑھیں جاتی سن کر ہی یاد کرلی تھیں۔ کون سی الہامی کتاب دنیا میں ایسی ہے جس کی حفاظت کے لیے ایسے اسباب قویہ پیدا ہوئے ہوں۔ تمام دنیا کی الہامی کتابوں میں نہ کسی کا ایسا دعویٰ ہے اور نہ ہی کسی کے پاس حفاظت کے ایسے ثبوت ہیں۔

آیتوں اور سورتوں کی ترتیب

❀ ترتیب نزول اور ترتیب جمع

ہم نے پہلے دلائل قویہ سے یہ بات ثابت کر دکھائی ہے کہ قرآن شریف آنحضرت ﷺ کی حیات میں ہی لکھا گیا اور آپ کی زندگی میں ہی قراء اور حفاظ نے کام و کمال حفظ کر لیا تھا۔ لیکن یہ مسلم بات ہے کہ اس مقدس اور مہیمن کتاب الٰہی کا نزول تدریج کے ساتھ ہوتا رہا اور تیئیس سال کے عرصہ میں پورا ہوا۔ چنانچہ بعض سورتیں تو ایسی ہیں جو ایک ہی دفعہ اکٹھی نازل ہوئیں اور بہت سی اس قسم کی ہیں کہ جن کا نزول تدریجی ہوا۔ اور بہت لمبے عرصہ میں پوری ہوئیں۔ ایسا بھی ہوتا رہا کہ ابھی ایک سورہ مکمل نہ ہونے پاتی تھی کہ دوسری سورہ نازل ہونی شروع ہو جاتی۔ بعض وقت ایسا بھی ہوتا کہ دو مختلف سورتوں کی آیات ایک ہی وقت میں نازل ہو جاتیں۔ غرض قرآن شریف ایک جلد اور ایک وقت میں اکٹھا نازل نہیں ہوا بلکہ آیات اور سورتیں تیئیس سال کے عرصہ میں تدریج کے ساتھ نازل ہوئیں۔ اور ترتیب نزولی ایسی نہ تھی کہ جس سے ہر ایک سورہ کی آیات علی التواتر نازل ہو کر اس کو پورا کرنے کے بعد دوسری سورت شروع ہوتی حسب اقتضائے منشائے الٰہی مختلف سورتوں کی آیات مختلف اوقات میں نازل ہوئیں۔ اور اس وقت جو قرآن شریف مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اس کی ترتیب آیات ترتیب نزولی کے موافق نہیں بلکہ یہ وہ ترتیب ہے جو آنحضرت ﷺ نے اپنی حین حیات بلکہ عین نزول آیات کے موقعہ پر بہ اشارہ وحی الٰہی سے کی تھی۔

اس موقعہ پر ایک معترض یہ سوال کرے گا کہ یہ ترتیب قرآنی جو نزولی ترتیب کے مطابق نہیں ہے کس نے کی تھی؟ کیا خود آنحضرت سرور کائنات ﷺ نے ہی قرآن شریف کو اس طرح ترتیب دیا تھا یا کسی اور نے ترتیب دی تھی؟ پھر اگر قرآن شریف کی کوئی ترتیب حضور سرور کائنات ﷺ نے خود فرمائی تھی تو کیا یہ موجودہ ترتیب قرآنی وہی ترتیب ہے یا اس سے مختلف؟ ہر قسم کی اندرونی اور بیرونی شہادتیں اس بات کو قطعی طور پر ثابت کرتی ہیں کہ قرآن شریف کی سورتوں اور آیتوں کی موجودہ ترتیب سوائے آنحضرت ﷺ کے کسی دوسرے کا کام نہ تھا بلکہ خود آنحضرت ﷺ کے بھی اپنے خیال کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ بلکہ آپ نے یہ ترتیب قرآنی وحی الٰہی کی ہدایت کے مطابق دی تھی اور موجودہ قرآن شریف بعینہٖ وہی ہے جو آنحضرت ﷺ نے ترتیب دیا تھا۔ اگرچہ اس امر پر اندرونی شہادت موجود ہے مگر اس مضمون میں اس شہادت کے لیے گنجائش نہیں۔ اس لیے ہم صرف خارجی شہادت کو یہاں پیش کریں گے۔ مگر اتنی بات ضرور کہیں گے کہ یہ محض ایک جھوٹا خیال ہے کہ قرآن شریف میں ترتیب نہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ اس سے بہتر ترتیب قطعاً ناممکن ہے۔ ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ ربط و ضبط کلام کے لحاظ سے ایسے اعجازی نظام سے رکھا ہوا ہے کہ ایک لفظ کا تغیر و تبدل بھی ممکن نہیں۔ وہ شخص جو اس نظام قرآنی پر کسی قسم کا حرف رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ بعض آیات ماقبل و مابعد میں مضمون کا ربط نہیں یا کوئی مضمون چھوٹا ہوا ہے وہ صرف ناواقفیت سے ایسی بات منہ سے نکالنے کی جرأت کرتا ہے۔

❀ قرآن کریم کی شہادت کہ ترتیب جمع قرآن وحی الٰہی سے ہوئی

خارجی شہادت اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ قرآنی آیتوں اور سورتوں کی موجودہ ترتیب نہ تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور نہ زید نے

کی تھی بلکہ یہ وہی ترتیب ہے جو آنحضرت ﷺ نے وحی الٰہی کی ہدایت سے کی تھی۔ خود قرآن شریف بھی اس پر شاہد ہے:

﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ○﴾

[القيامة: 18-17]

یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''قرآن کا جمع کرنا اور اس کا تجھ کو (نبی کریم ﷺ) پڑھا دینا ہمارا کام ہے۔ پس جب ہم اسے پڑھ چکیں تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کیا کرو۔''

اس آیت کریمہ سے یہ بات پورے طور سے پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ جمع قرآن شریف مع ترتیب آیات و سور صرف اللہ تعالیٰ کی وحی سے عمل میں آئی۔ قرآن شریف نہ صرف اسی بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ کلام الٰہی ہے بلکہ یہ دعوی بھی کرتا ہے کہ اس کا جمع کرنا اور اس کی ترتیب دینا سب امر الٰہی سے ہوا ہے۔ گویا یہ قرآن شریف جیسا کہ اللہ کا کلام ہے اسی طرح اللہ ہی نے اس کو مرتب اور جمع کیا۔ واضح رہے کہ اس آیت میں لفظ ''جمع'' جو وارد ہوا ہے اس سے مراد ترتیب اور جمع دونوں ہیں۔ کیونکہ بغیر کسی خاص ترتیب کے جمع ممکن نہیں۔ جمع سے مراد ہی یہ ہے کہ ترتیب دے کر جمع کیا گیا۔ اور اس لفظ کے اس جگہ واقع ہونے سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ قرآن شریف اس ترتیب سے نازل نہیں ہوا تھا جس ترتیب سے وہ جمع کیا گیا یعنی اصل ترتیب قرآنی ترتیب نزولی سے مختلف ہے۔ کیونکہ اس آیت میں جمع اور نزول کو دو الگ الگ امر بتایا گیا ہے۔

اگر ترتیب نزولی سے ہی وحی الٰہی کا منشا ہوتا تو جمع اور نزول کو الگ الگ بیان نہ کیا جاتا۔ کیونکہ پھر نزول کے ساتھ ساتھ ہی جمع کا کام بھی ہوتا جاتا اور جمع کی کوئی الگ ضرورت نہ رہتی۔ مگر آیت موصوفہ میں اللہ تعالیٰ نے جمع کو ایک الگ فعل بیان فرمایا ہے اور پڑھنے یعنی نزول کو الگ۔ پس اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وحی الٰہی نے ترتیب جمع اور ترتیب نزول کو الگ الگ رکھا اور نزول اور جمع دونوں کو اپنے ذمہ لیا۔ پس جس طرح وحی الٰہی کا نزول آنحضرت ﷺ کی زندگی میں سارا ہو چکا۔ اسی طرح اس کی جمع اور ترتیب کا کام بھی ضروری تھا کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہی تکمیل کو پہنچ جاتا اور ایسا ہی ہوا۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات قرآن شریف کی صاف صاف اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ترتیب قرآنی وحی الٰہی سے ہوئی۔ جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿٣٢﴾﴾

[الفرقان: 32]

''یعنی کافر کہتے ہیں کہ سارا قرآن مکمل اور مرتب ایک دفعہ نازل کیوں نہ کر دیا گیا۔ ان کو کہہ دو کہ مصلحت الٰہی یہی ہے، تاکہ کلام الٰہی کو جزءاً جزءاً نازل کرنے سے ہم تمہارے دل کو تسکین دیتے رہیں۔ اور ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر اتارا اور اس کی تالیف بھی نہایت عمدہ کی۔''

ترتیل کے معنی میں تالیف بھی شامل ہے۔ لسان العرب میں ہے: [رَتَّلَ الْقُرْاٰنَ اَحْسَنَ تَالِيْفَهُ وَ اَبَانَهُ تَمَهَّلَ فِيْهِ.]

''یعنی ترتیب کو نہایت عمدہ کیا اور اسے کھول کھول کر اور ٹھہر ٹھہر کر بیان کیا''۔

بلکہ سیاق و سباق عبارت خود بتا رہا کہ یہاں ترتیب کا ذکر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تھوڑا تھوڑا نازل کرنے میں بہت سے مصالح الٰہی ہیں۔ اور یہ بھی کلام الٰہی کے نزول سے نبی کریم ﷺ کے دل کو تسکین ہوتی رہے۔ اور یہ جو تم کہتے ہو کہ مرتب کیوں نہیں۔ سو ترتیب و تالیف بھی ہم ہی کر رہے ہیں اور کریں گے۔ اور اخیر پر اسی کو مکمل اور مرتب بنا دیں گے۔ ایسا ہی آیت (وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ) سے بھی یہ پایا جاتا ہے کہ اجزائے قرآنی کی ترتیب کا کام بموجب دعویٰ قرآن کریم وحی الٰہی سے ہی ہوا۔

❀ حل طلب سوالات

اب ہم حدیث صحیح کی طرف رجوع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا تاریخ یا حدیث صحیح سے یہ بات ثابت ہوتی ہے یا نہیں کہ موجودہ قرآن شریف آنحضرت ﷺ سے اسی ترتیب الٰہی کے ساتھ جس کا ذکر آیات مذکورہ بالا میں ہے، ہمارے ہاتھوں تک محفوظ پہنچا ہے۔ اس امر کے لیے سب سے پہلے یہ بات دیکھنی ضروری ہے کہ آیا آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد قرآن شریف اسی طرح جمع مرتب اور منتظم چھوڑا گیا یا نہیں۔ اس امر کے ثبوت میں صحیح روایات اور معتبر احادیث کا بڑا ذخیرہ موجود ہے اور ہم پہلے آیتوں کی ترتیب اور پھر سورتوں کی ترتیب پر غور کریں گے اور ہر ایک امر تحقیق طلب میں امور ذیل پر بحث کریں گے :

① کیا آنحضرت ﷺ کی حیات میں خود آنحضرت ﷺ اور صحابہ کبار رضی اللہ عنہم نے قرآن شریف کو کوئی ترتیب دی ہوئی تھی ؟

② کیا قرآن شریف جس نہج سے نازل ہوا تھا اسی طرح اس کو ترتیب دیا گیا یا ترتیب جمع ترتیب نزول سے مختلف تھی۔

③ کیا موجودہ ترتیب قرآن شریف اس ترتیب سے مختلف ہے یا وہی ہے جو آنحضرت ﷺ نے اس کو دی تھی۔

❀ ولیم میور کا اعتراض اور اس کا جواب

یہ ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں مسلمان نمازیں پڑھتے تھے اور نمازوں میں بڑا حصہ صرف قرآن شریف ہی کا پڑھا جاتا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ نمازوں کے علاوہ بھی قرآن شریف کی تلاوت پر مداومت اس وقت سے ہی مسلمانوں میں مروج ہے۔ پھر جب کہ اتنی بڑی کتاب جس میں اتنے مختلف مضامین ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آنحضرت ﷺ کی حیات میں حفظ کر لی تھی اور باقاعدہ طور پر نمازوں میں پڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو پڑھاتے اور سکھاتے تھے۔ تو کس طرح ممکن ہے کہ یہ سارے کام بغیر جمع قرآن کے عمل میں لائے جا سکتے تھے۔ معترضین نے اس واضح حقیقت پر کبھی غور نہیں کیا۔ مثال کے طور پر ہم ذیل میں میور صاحب کی لائف آف محمد کے دیباچہ سے ایک جملہ نقل کرتے ہیں:

> ''بہر حال ہم یہ بات مان نہیں سکتے کہ اس زمانہ میں کامل قرآن شریف کسی معین ترتیب سے پڑھا جاتا تھا۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ موجودہ قرآن شریف کی نسبت مسلمانوں کا ایمان ہے کہ یہ اسی ترتیب کے موافق ہے جو آنحضرت محمد مصطفی ﷺ نے خود کی تھی۔ لیکن ہم اس کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر کسی معین ترتیب کا آنحضرت (ﷺ) خود فیصلہ کر دیتے اور اس پر آپ عمل کرتے تو ضروری تھا کہ وہی ترتیب آئندہ محفوظ رکھی جاتی۔ مگر جو قرآن شریف ہمارے زمانہ تک محفوظ چلا آیا ہے وہ مضامین اور زمانہ کے لحاظ سے اپنے مختلف حصوں میں کسی معقول اور قابل فہم ترتیب کا متبع نہیں۔ اور یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ آنحضرت (ﷺ) اس موجودہ ترتیب کے ساتھ اس کے پڑھنے کا حکم کرتے ہوں۔ ہمیں اس بات پر شبہ ہے کہ جتنی تعداد قرآنی سورتوں کی اس وقت موجود ہے ان کی یہ تعداد آنحضرت (ﷺ) نے خود مقرر کی تھی یا نہیں۔ بہر حال اتنا تو ضرور ہے کہ اکثر سورتوں کی اندرونی ترتیب آنحضرت (ﷺ) کی ہدایت سے نہیں۔''

سر ولیم میور نے اس مضمون پر کچھ حاشیے لکھے ہیں۔ ان حواشی کے پڑھنے سے مصنف کے دل کا وہ اضطراب ظاہر ہو رہا ہے جو مذہبی تعصب اور تاریخ کے صحیح ثبوت کی موجودگی کے جھگڑے سے پیدا ہو رہا ہے۔ مثلاً: جہاں اس نے آنحضرت ﷺ کی حیات میں قرآن شریف کی معین ترتیب کے موجود ہونے سے انکار کیا ہے وہاں ساتھ ہی تسلیم کیا ہے کہ

> ''یہ بات لکھی ہوئی موجود ہے کہ بعض صحابہ سارے قرآن شریف کی معین وقت میں تلاوت کر سکتے تھے۔ جس سے یہ بات قرار دینی پڑتی ہے کہ اس میں بعض حصص قرآنی کا باہمی تعلق اور رابطہ ضرور تھا۔''

ایک اور حاشیہ میں اس نے یہ بات مانی ہے کہ

''آنحضرت (ﷺ) کی حیات میں چار پانچ تو ایسے صحابی موجود تھے جو کامل قرآن شریف کو نہایت صحت کے ساتھ از بر رکھتے تھے اور اکثر ایسے موجود تھے جو قریباً سارا قرآن از بر رکھتے تھے۔''

علاوہ ازیں جہاں اس نے سورتوں کی تعداد کا آنحضرت ﷺ کے خود مقرر کرنے سے انکار کیا ہے۔ تو تردید کے خیال سے معاً ذیل کا حاشیہ لکھ دیا ہے:

''لیکن اس بات کو ماننے کے وجوہ ہیں کہ بڑی بڑی سورتیں اور ان کی آیات جو زیادہ تر مستعمل تھیں وہ معین ہو چکی تھیں۔ اور اپنے اپنے ناموں اور خاص نشانوں سے معروف و موسوم تھیں۔ اور صحیح حدیثوں سے حضرت محمد (ﷺ) کا خود یوں بعض سورتوں کا موسوم اور معروف کرنا ثابت ہے مثلاً جب غزوہ حنین میں بعض لوگ بھاگے تو اس وقت ان کو آنحضرت ﷺ نے اصحاب بقر کر کے پکارا تھا۔''

اور پھر حاشیہ میں لکھتا ہے کہ

''احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت (ﷺ) کی حیات میں اکثر صحابیوں نے قرآن شریف کی بعض سورتیں حفظ کر لی ہوئی تھیں۔ چنانچہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کے دہن مبارک سے قرآن شریف کی ستر سورتیں سیکھیں تھیں۔ اور آنحضرت ﷺ نے آخری مرض کے ایام میں ستر سورتیں تلاوت فرمائی تھیں۔ جن میں سات لمبی سورتیں تھیں۔ ان حدیثوں سے کم از کم قرآنی سورتوں میں ایک حد تک معین تقسیم ضرور ثابت ہوتی ہے۔ البتہ سورتوں کی ترتیب کا اس سے پتہ نہیں لگ سکتا۔''

اور پھر لکھتا ہے کہ

''جبکہ یہ بات ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ سورتہائے قرآنی کا استعمال کیا کرتے تھے تو اس سے یہ بات صاف طور پر عیاں ہوتی ہے کہ سورتوں کی ترتیب کا کسی حد تک آپ نے ضرور فیصلہ کر دیا ہوا تھا۔''

اسی امر کے متعلق آگے چل کر ایک اور حاشیہ میں ولیم میور صاحب لکھتے ہیں:

''حدیث مذکورہ بالا جس میں سورتوں کی وہ تعداد لکھی ہے جو بعض صحابہ کو یاد تھیں اور نیز وہ تعداد جو خود آنحضرت ﷺ نے آخری وقت میں پڑھی تھیں مذکور ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورتیں اس وقت مکمل اور مرتب صورت میں موجود تھیں۔''

ولیم میور صاحب کے دیباچہ کے متن اور مذکورہ بالا حواشی کو پڑھنے سے صاف پتہ ملتا ہے کہ ان کے دلی بغض و تعصب نے مجبور ہو کر وہ سطور لکھوادیں جن میں متن میں انہوں نے انکار ترتیب کیا ہے۔ لیکن تاریخ کی سچی شہادت نے ان حواشی کو اسی کے ذیل میں قلمبند کرنے پر اسے مجبور کیا جن سے متن کی تردید ہوتی ہے۔ اگرچہ حواشی لکھنے میں میور صاحب نے تعصب کی وجہ سے بخل سے کام لیا ہے۔ لیکن ان کا تضاد ایسا عیاں ہے کہ ہر ایک احتیاط اور غور سے پڑھنے والا اسے آسانی سے دیکھ سکتا ہے۔ اور مصنف کے دل کے اضطراب کی حالت سے ناواقف نہیں رہ سکتا۔ متن میں تو لکھا ہے کہ قرآن شریف آیتوں اور سورتوں میں کوئی معین ترتیب اور ربط موجود نہیں تھی اور حواشی میں تاریخی شہادت اس کے موجود ہونے کے ثبوت میں پیش کی گئی ہے۔ متن میں لکھا ہے کہ نہ تو آنحضرت ﷺ نے سورتوں کے نام ہی مقرر کیے اور نہ ہی ان کی تعداد معین فرمائی۔ لیکن حاشیے میں صاف لکھا ہے کہ اس بات کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ سورتوں کی تعیین و تقسیم آنحضرت ﷺ نے فرمادی تھی اور ان کی صورتوں کو بھی آپ نے معین فرمادیا تھا۔ بعض کلمات تعصب کی وجہ سے مصنف نے ان کے ساتھ حاشیہ میں بڑھادیئے ہیں۔ جیسے ''بعض حصص'' اور ''کسی حد تک'' وغیرہ۔ یہ غور کا مقام ہے کہ جبکہ

حاشیہ میں صاف طور پر اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ قرآن شریف کی ستر سورتیں آنحضرت ﷺ کی حیات میں مرتب اور منتظم موجود تھیں۔ جن میں وہ لکھتے ہیں کہ سات لمبی سورتیں بھی شامل تھیں تو پھر باقی چوالیس سورتوں کی نسبت جو نمازوں میں عام طور پر پڑھی جاتی تھیں کیونکر گمان ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت اس حالت میں موجود نہ تھیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود مصنف نے ان باقی چوالیس سورتوں میں ترتیب کے نہ ہونے کے متعلق کوئی شہادت پیش نہیں کی۔ پس اگر اور کوئی شہادت ترتیب وسور وآیات پر نہ بھی ہوتی تو ایک مخالف معترض کے اس بیان سے ہی یہ یقین کرنے کے لیے کافی وجوہات پیدا ہوتے ہیں کہ سورتیں اور آیات منتظم اور مرتب صورت میں آنحضرت ﷺ کے وقت میں موجود تھیں۔ اور پھر اسی نتیجہ کے مؤید اس مخالف مصنف کا یہ اقبال ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے بھی موجود تھے جو نہ صرف بعض حصص کو حافظہ سے دہرا سکتے تھے بلکہ کل کے کل قرآن شریف کو اسی طرح دہرا سکتے تھے اور اعلیٰ درجہ کی ''احتیاط صحت'' کے ساتھ وہ یہ کر سکتے تھے۔

❀ آیات کی ترتیب کی قطعی شہادت

یہ دعویٰ کہ ایک ایک آیت جب نازل ہوتی تھی تو اسے یونہی بلا ترتیب رہنے دیا جاتا تھا اور کوئی نہ جانتا تھا کہ کونسی آیت کس سورت کی ہے اور کہاں رکھی جاوے گی۔ بدیہی طور پر ایک لغو دعویٰ ہے اور کسی تردید کا محتاج نہیں۔ جب کہ یہ بات ثابت ہے کہ قرآن شریف حفظ کیا جاتا تھا اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کم و بیش کچھ نہ کچھ حصہ حفظ کرتے جاتے تھے۔ تو اگر آیات کی ہی کوئی ترتیب نہ تھی تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ کوئی معین حصہ کوئی شخص حفظ کر لیتا۔ کیا یہ قیاس میں آسکتا ہے کہ ہر ایک شخص بجائے خود ایک ترتیب دے کر قرآن شریف کو حفظ کرتا ہو۔ اور اس طرح جتنے صحابی حفظ کرنے والے ہوں اسی قدر مختلف ترتیبیں آیات کی مروج ہوں؟ پھر یہ بھی ثابت ہے کہ قرآن شریف لکھا بھی جاتا تھا اور بعض سورتوں کے مکمل نسخوں کا عام طور پر استعمال میں ہونا بھی تاریخ صحیح سے ثابت ہے۔

پس ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ہر ایک نسخہ ایک جداگانہ ترتیب سے لکھا جاتا تھا؟ یہ کیسا پر از حماقت دعویٰ ہے کہ ایک ہی ترتیب سب صحابی ملحوظ نہیں رکھتے تھے کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ ہر ایک حفظ کرنے والا ایک الگ ترتیب کا پیرو ہو اور ہر ایک نسخہ جو لکھا جاتا ہو وہ جداگانہ ترتیب سے لکھا جاتا ہو اور نہ کوئی دو پڑھنے والے اور کوئی دو نسخے ایک ہی سورت کے باہم کسی ایک ترتیب پر متفق ہوں اور نہ ہی حافظہ اور تحریر کا باہم کسی ایک ترتیب پر اتفاق ہو۔ گویا ایک ایک سورت کی ہزارہا الگ الگ ترتیبیں موجود تھیں۔ پھر ہم پوچھتے ہیں کہ جب نمازوں میں قرآن شریف پڑھا جاتا تھا تو کیا ہر ایک پڑھنے والا ایک الگ ترتیب سے کوئی حصہ پڑھ دیا کرتا تھا؟ ایسی صورت میں کوئی مقتدی یہ کب کہہ سکتا تھا کہ اس نے کون سا حصہ قرآن شریف کا پڑھا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ایسی ضخیم کتاب جو اس طرح شب و روز عام مجمعوں اور گھروں کے اندر پڑھی جاتی تھی۔ وہ ایک ایسی بے ترتیب صورت میں تھی کہ کسی فقرہ کے متعلق کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ کہاں کا فقرہ ہے اور ہزارہا آدمی جو شب و روز اس کی تلاوت کرتے تھے وہ سب جس طرح کسی کا جی چاہا کوئی فقرہ آگے اور کوئی فقرہ پیچھے پڑھ دیتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہر ایک سورت کی آیات تو معین تھیں اور اس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ علم تو دیا گیا تھا کہ فلاں سورت میں فلاں فلاں آیات ہیں۔ مگر ہر ایک سورت کی آیات کی بجائے خود کوئی ترتیب نہیں تھی۔ تو یہ دعویٰ بھی اس دلیل سے مردود ثابت ہوتا ہے جس سے وہ پہلا دعویٰ کہ سارا قرآن شریف ایک بے ترتیبی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ غلط ثابت ہوتا ہے۔ ان دعاوی کی لغویت کو ثابت کرنے کے لیے اگر اور کوئی دلیل ہمارے ہاتھ میں نہ بھی ہوتی تو صرف یہی ایک دلیل جس کی بنا معتبر سے معتبر روایات پر ہے کافی تھی کہ قرآن شریف حفظ کیا جاتا تھا کیونکہ بغیر ایک ترتیب کی پیروی کے حفظ کرنا محال تھا۔ مثلاً: اسی دعویٰ پر غور کرو کہ ہر ایک سورت میں آیات تو معین تھیں مگر ان کی ترتیب معین نہ تھی۔ اب سو سو آیات کی بہت سی سورتیں موجود ہیں۔ پس اگر ان سو آیتوں میں کوئی ایک ترتیب نہ تھی اور ہر ایک لکھنے والا اور پڑھنے والا ایک الگ ترتیب کی پیروی کرتا تھا۔ تو سو آیات کی جداگانہ ترتیبیں اس قدر تعداد تک پہنچتی ہیں کہ

لاکھوں آدمیوں میں سے کوئی دو بھی ایک ترتیب پر متفق نہ ہو سکتے تھے۔ اس صورت میں ہر ایک سورت گویا لاکھوں الگ الگ سورتیں تھیں اور قرآن کریم بھی ایک نہ تھا بلکہ لاکھوں الگ الگ قرآن شریف تھے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اگر کوئی شخص حق طلبی اور خدا ترسی کو دل میں لے کر غور کرے تو وہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ یہ بالکل محال تھا کہ بغیر ایک ترتیب کی پیروی کے قرآن شریف کی تعلیم اور تعلم کا سلسلہ جاری رہ سکتا تھا۔ نہ ہی ہزارہا صحابیوں میں سے ایک دوسرے کی نسبت یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے، کون سا حصہ یا کون سی سورت پڑھ رہا ہے۔ اور واقعی صحیح پڑھ رہا ہے یا غلط۔ علاوہ ازیں صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ جب ایک شخص کوئی سورت یا کوئی حصہ کسی سورہ کا پڑھتا اور اس سے کوئی غلطی ہو جاتی یا کوئی آیت درمیان سے رہ جاتی تو سننے والے معاً اس کی غلطی کو نکال دیتے۔ حالانکہ اگر ترتیب آیات کوئی نہ ہوتی تو یہ محال تھا۔ کیونکہ کسی دوسرے کی نسبت کسی شخص کو کیا علم ہو سکتا تھا کہ وہ کس آیت کو پڑھتا ہے۔ ایسی صورت میں غلطی کا نکالنا قطعاً ممکن نہ تھا۔

❀ ترتیب آیات، ترتیب نزولی سے جداگانہ تھی

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہوتی ہے کہ قرآن شریف کی آیات میں ضرور کوئی خاص ترتیب ملحوظ رکھی جاتی تھی۔ جس کے موافق لوگ اسے پڑھتے تھے اور حفظ کرتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ ترتیب نزولی کے موافق تھی یا اس سے الگ کوئی اور ترتیب تھی۔ اس کا جواب معتبر تاریخی شہادت سے ہمیں یہی ملتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ترتیب نزولی سے الگ ایک ترتیب آیات کو دیا کرتے تھے۔ نزول آیات کے لحاظ سے ایسا ہوتا کہ بعض وقت ایک سورت کے کسی حصہ کے نزول کے بعد دوسری کسی سورت کا حصہ نازل ہو جاتا۔ پس ایسی حالت میں نزولی ترتیب ممکن نہ تھی۔

علاوہ ازیں صحیح روایات سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ جب کبھی کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو خود آنحضرت ﷺ ہی ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں جگہ رکھا جائے۔ جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے:

((قَالَ عُثْمَانُ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ مِمَّا يَأْتِي عَلَيْهِ الزَّمَانُ يُنْزَلُ عَلَيْهِ مِنَ السُّوَرِ ذَوَاتِ الْعَدَدِ وَكَانَ إِذَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ الشَّيْءُ يَدْعُو بَعْضَ مَنْ يَكْتُبُ عِنْدَهُ يَقُولُ: «ضَعُوا هٰذَا فِي السُّورَةِ الَّتِي يُذْكَرُ فِيهَا كَذَا وَكَذَا».))[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا یہ ہمیشہ کا معمول تھا کہ جب کئی سورتوں کی آیتیں نازل ہوتیں تو آپ صریح طور پر اس موقعہ کی ہدایت فرما دیا کرتے تھے جہاں کوئی آیت بلحاظ ترتیب رکھی جانی ضروری ہوتی۔ پس اس صریح اور بین شہادت سے بھی یہ ظاہر ہے کہ آیات کی ترتیب خود آنحضرت ﷺ کی طرف سے تھی۔ ایسی شہادت کی موجودگی میں کوئی سمجھدار آدمی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ آنحضرت ﷺ ضرور آیات کو ترتیب دیتے تھے اور وہ ترتیب ترتیب نزولی سے جداگانہ تھی۔

❀ موجودہ ترتیب آیات ترتیب نبوی ہے

اب دو باتیں حل ہو چکیں، یعنی ایک یہ کہ آنحضرت ﷺ قرآنی آیات کو ترتیب دیتے تھے اور دوسری یہ کہ وہ ترتیب، ترتیب نزولی سے الگ تھی۔ اس لیے اب صرف یہ تیسرا سوال حل کرنے کے قابل باقی ہے کہ کیا وہ ترتیب جو آنحضرت ﷺ نے دی اسی کے موافق موجودہ ترتیب آیات قرآنی کی ہے؟ یا یہ موجودہ ترتیب، ترتیب نبوی سے الگ ہے؟ یہ امر تو بین ہے کہ موجودہ ترتیب بھی ترتیب

1- جامع الترمذي: 3086؛ سنن أبي داود: 140؛ قال الشيخ الألباني: ضعيف؛ مسند الإمام أحمد: 399، 499؛ قال الشيخ شعيب الأرنؤوط: إسناد ضعيف ومتنه منكر.

نزولی سے الگ ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے ترتیب نزولی سے الگ ترتیب دی تھی۔ پس اگر کوئی شہادت اس امر کی نہ پائی جائے کہ قرآن کریم کی تاریخ میں کسی وقت آیات کی ترتیب کو بدلا گیا تھا تو نتیجہ قطعی اور یقینی ہوگا کہ موجودہ ترتیب بعینہٖ وہی ہے جو آنحضرت ﷺ نے دی تھی۔

اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہم تاریخ قرآن کو دو زمانوں پر تقسیم کر لیتے ہیں۔ یعنی اول حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پہلے اور دوئم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ اور آپ کے بعد۔ ان میں سے ایک زمانہ کے متعلق یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے بعد جو زمانہ گزرا ہے اس کے متعلق اسلام کے کسی سخت سے سخت دشمن اور اندھے سے اندھے نکتہ چین نے بھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ جو ترتیب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت میں اور آپ کے شائع کردہ صحیفوں میں موجود تھی اس میں آج تک سر مو کا فرق بھی نہیں آیا ہے۔ پس اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ قرآن کریم کی ترتیب آج تک نہیں بدلی اور وہی ترتیب سورتوں اور آیتوں کی اس وقت قرآن کریم میں موجود ہے جو آنحضرت ﷺ کے وقت میں آپ کی ہدایت کے ماتحت دی گئی تھی۔ اب صرف یہ دکھانا باقی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات سے لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک کسی موقعہ پر اصلی ترتیب کو تبدیل نہیں کیا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صحیفوں میں وہی ترتیب ملحوظ رکھی گئی جو آنحضرت ﷺ کے وقت میں تھی۔ ایک موٹی سے موٹی سمجھ کا آدمی بھی اتنی بات آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ترتیب بدلنے کے لیے کوئی چیز محرک نہ تھی۔ یہ بات کہ آنحضرت ﷺ ایک خاص ترتیب قرآن شریف کی تلاوت میں ملحوظ رکھتے تھے اور اس ترتیب پر صحابہ نے قرآن شریف کو حفظ کیا۔ ہم اوپر دکھا چکے ہیں اور یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ یہ ترتیب ترتیب نزولی سے الگ تھی۔ اب جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت عثمان نے یا کسی اور شخص نے اس ترتیب کو جس پر (صحابہ اور حافظان قرآن کریم قائم ہو چکے تھے) تبدیل کر دیا تھا۔ یہ بار ثبوت اس پر ہے کہ وہ ایسی تبدیلی کی شہادت پیش کرے اور جب تک کوئی ایسی شہادت نہ ہو اس کا دعویٰ یقینی اور قطعی طور پر باطل ثابت ہوگا۔ مگر ہم جب حدیث صحیح کی ورق گردانی کرتے ہیں تو پھر ایک شمہ بھر بھی ایسی شہادت ہمیں نہیں ملتی اور نہ ایسا یقین کرنے کے کوئی وجوہات پائی جاتی ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت تک اتنا زمانہ نہیں گزرا تھا کہ سارے صحابہ کے بالمقابل ایک آدمی کو یہ جرأت ہو سکتی کہ وہ اس ترتیب کو بدل دے جس پر سب قائم تھے۔ آنحضرت ﷺ کو فوت ہوئے ابھی بارہ سال ہی گزرے تھے اور ہزارہا صحابہ اس وقت زندہ تھے۔ جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے منہ سے قرآن شریف سنا ہوا تھا۔ اگر کوئی تبدیلی ترتیب میں اس وقت وقوع میں آتی تو ایسا واقعہ خاموشی سے نہ گزر سکتا تھا؟ بلکہ ایک ایسا شور برپا ہوتا جس کے ذکر سے تاریخ کے صفحوں کے صفحے بھر جاتے اور اول تو یہی بات سوچنے کی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو غرض کیا تھی کہ وہ ترتیب بدلتے اور کونسی ضرورت پیش آئی تھی کہ ترتیب بدلی جاتی۔ نہ کوئی ضرورت پیش آئی نہ کوئی غرض کسی کو تھی نہ ہی اس امر کا کہ ترتیب بدل دی گئی تھی کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی ذکر پایا جاتا ہے۔ پس ایسا دعویٰ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ترتیب آیات کو بدل دیا تھا۔ سراسر حماقت اور لغویت سے پُر ہے۔

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو صحیفے نقل کرائے وہ سارا ان کا اپنا یا زید کا کام نہ تھا بلکہ دیگر صحابی بھی اس میں شامل تھے اور وہ تمام صحابہ جو حفظ قرآن میں خاص شہرت رکھتے تھے انہی کی زیر نگرانی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ کام کرایا تھا۔ اس کو بھی چھوڑو۔ ہم کہتے کہ ہم کم از کم کوئی یہی دکھا دے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اس وقت کسی نے یہ الزام دیا تھا کہ آپ نے قرآن شریف کی سورتوں یا آیتوں کی ترتیب بدل دی ہے۔ ہاں اگر کوئی الزام آپ پر دیا گیا وہ یہ تھا کہ آپ نے مسلمہ قراءت کے سوا بعض اور قراءتوں کو روکا۔ مگر اس کی اصلیت کیا تھی ہم آگے چل کر دکھائیں گے۔ بہر حال آیتوں کی ترتیب کے بدل دینے کی ایک ذرہ بھر بھی شہادت موجود نہیں۔ اور ایسی شہادت کی عدم موجودگی میں یہ ماننا پڑے گا کہ قرآن شریف کی ترتیب آیات وہی رہی ہے جو آنحضرت ﷺ کے وقت میں تھی۔

❀ احادیث میں حوالہ سے ترتیب کا ثبوت

ایک امر کے قطعی ثبوت کے لیے دو ہی قسم کی شہادتیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ اس کے خلاف کوئی شہادت موجود نہ ہو۔ دوسری یہ کہ اس کی تائید میں زبردست شہادت موجود ہو۔

قسم اول کی شہادت ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ دکھا چکے ہیں کہ قرآن کریم کی تاریخ میں کوئی وقت بھی ایسا نہیں آیا کہ جس میں اس کی آیتوں کے موجودہ انتظام میں کوئی ذرہ بھر بھی تغیر و تبدل واقع ہوا ہو۔ اس قسم کے ثبوت کے علاوہ کثرت سے دلائل بدیہیہ یقینیہ قسم ثانی کے بھی موجود ہیں جو اور بھی وضاحت سے اس امر کو پایۂ ثبوت پہنچاتے ہیں۔ یہ وہ دلائل ہیں جو احادیث صحیحہ سے مستنبط ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ نے [باب فضل سورة البقرة] کے ضمن میں ایک حدیث نقل کی ہے:

((عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: «مَنْ قَرَأَ بِالآيَتَيْنِ مِنْ آخِرِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ فِي لَيْلَةٍ كَفَتَاهُ».))[1]

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''حضرت سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی رات میں سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھے تو یہ اس کے لیے کافی ہیں۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر ایک سورت میں آیات کو ایک ترتیب دیتے تھے اور اسی ترتیب سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن شریف پڑھاتے تھے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کسی سورت کی آخری دو آیتوں کی طرف اشارہ نہ فرماتے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے اس اشارہ کو سمجھ سکتے۔ یہ حدیث اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ ہر ایک آیت قرآن کے لیے ابتدا ہی سے ایک معین اور معروف مقام قرآن شریف میں تھا۔ اسی کی تائید میں ایک دوسری حدیث میں یوں آیا ہے کہ سورہ بقرہ کی آیت: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ﴾ سے شروع ہو کر اخیر سورت ﴿وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة: 86-85] تک پڑھے۔ اور آج بھی انہی دو آیات پر اس سورت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوا کہ وہی ترتیب جو آنحضرت ﷺ نے آیات کو دی آج تک قرآن شریف میں چلی آتی ہے۔ گویا ایک ہی حدیث سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک یہ کہ شروع سے ہر سورت کی آیت کو ایک خاص ترتیب دی جاتی تھی۔ دوسری یہ کہ وہی ترتیب آج تک قرآن کریم میں موجود ہے۔

ایسا ہی ایک اور حدیث صحیح میں آنحضرت ﷺ نے زمانہ خروج دجال میں سورۃ الکہف کی پہلی دس آیتیں پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اور ایک حدیث میں آخری دس آیات کے پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ تو جب تک سورت کی آیات میں خاص ترتیب موجود نہ ہو پہلی یا پچھلی دس آیتوں کے الفاظ بے معنی ہوتے۔ صحیح بخاری میں ایک اور حدیث ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نماز میں سورۃ انفال کی چالیس آیتیں پڑھیں۔ اور محدث عبدالرزاق نے دوسرے سلسلہ رواۃ سے اس کو یوں بیان کیا ہے کہ (وَنِعْمَ النَّصِيْرُ) تک سورۂ انفال کو پڑھا۔ اور آج بھی چالیس آیتیں انہی الفاظ پر ختم ہوتی ہیں۔ اس سے بھی صاف معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے بھی ایک ترتیب آیتوں کو دی تھی اور وہی ترتیب آج بھی قرآن شریف میں موجود ہے۔

ایسا ہی ایک اور حدیث بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ تہجد کے وقت اٹھتے تو سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھا کرتے تھے اور چونکہ وہی دس آیات مسلمان بھی آپ کے اتباع میں پڑھتے تھے جو درجہ بدرجہ ہم تک پہنچیں اور ہم انہی دس آیتوں کو آج بھی سورۂ آل عمران کے آخر پر پاتے ہیں۔ یہ صرف چند ایک مثالیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ آیات کی ترتیب سورتوں میں نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں موجود تھی اور وہی ترتیب آج قرآن شریف میں ہے۔ ان کے ماسوا اور بھی بہت سی حدیثیں اس مضمون پر موجود ہیں۔ لیکن ہمارے

1- صحيح البخاري: 4008، 5008، 5009؛ صحيح مسلم: 1914، 1916

نزدیک اس بات کا قطعی فیصلہ کرنے کے لیے اسی قدر کافی ہیں۔ ایک طرف کوئی روایت ایسی نہیں جس میں ترتیب کے بدلنے کا ذکر ہو۔ دوسری طرف ایسی روایات موجود ہیں جو بتاتی ہیں کہ ہر ایک آیت کا ایک خاص مقام تھا جہاں آنحضرت ﷺ نے اسے خود رکھوایا تھا۔

❀ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا نزول کے مطابق ترتیب دینا

اس میں کچھ شک نہیں کہ ایک روایت میں یہ ذکر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قرآن شریف کو ترتیب نزولی کے موافق جمع کیا تھا۔ لیکن اول تو یہ روایت ہی ماننے کے قابل نہیں کیونکہ آیات کی ترتیب نزولی ناممکن تھی۔ ایک ایک وقت میں کئی کئی سورتیں اکٹھی نازل ہوتی تھیں اور کبھی ایک سورت کی کچھ آیتیں نازل ہوتی تھیں تو کبھی دوسری کی۔ پس سورتوں کے تقسیم معین ہونے کی وجہ سے یہ ناممکن تھا کہ آیات کی ترتیب نزولی پر قرآن شریف جمع ہو سکتا۔

اب باقی صرف ایک صورت رہ جاتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سورتوں کی کوئی ترتیب نزولی قرار دی ہو۔ سو وہ بھی درست نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ایک سورت کا صدر مثلاً: اگر ایک وقت نازل ہوتا ہے تو کچھ حصہ بہت وقت بعد نازل ہوتا ہے اور اس درمیان میں کئی اور سورتیں نازل ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس بات کو اگر مان بھی لیا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سورتوں کی کوئی علیحدہ ترتیب دی تھی تو یہ محض تاریخی رنگ کی ایک شہادت تھی کہ کس سورت کا بیشتر حصہ کس زمانہ میں نازل ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اس نزولی ترتیب کو کبھی مشتہر کرنے کا منشا نہ تھا اور نہ ہی ان کا یہ منشا تھا کہ اس ترتیب سے قرآن شریف کی تلاوت کی جاوے۔ ان کا منشا صرف اس قدر ہو گا کہ ایک تاریخی شہادت نزول کی موجود رہے۔ ہاں اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی تیسری ترتیب بھی موجود ہوتی تو ضرور تھا کہ اس کا ذکر بھی کہیں نہ کہیں کسی پیرایہ میں موجود ہوتا۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نعوذ باللہ اسے ترتیب نبوی ﷺ کے مقابل پر جاری کرنا نہ چاہتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا اور یہ تجویز کیا گیا کہ قرآن شریف کے نسخے خاص نگرانی کے ساتھ لکھ کر لوگوں میں تقسیم کیے جائیں اور اس کام کا اہتمام ایک منتخب مجلس کے سپرد کیا گیا تو ان متہم حضرات کی مجلس کے اراکین عظام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ انہوں نے اس وقت اس ترتیب کا ذکر بھی نہیں کیا۔ جو انہوں نے وحی الٰہی کی تاریخ محفوظ کرنے کے لیے کی تھی۔ اور نہ ہی کسی اور ترتیب کا سوائے اس موجودہ ترتیب کے کوئی تذکرہ کیا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خیال میں کوئی اور ترتیب ہوتی تو یہ بات ان کی شان سے بعید تھی کہ وہ خاموشی سے اسی ترتیب موجودہ سے قرآن شریف لکھتے اور لکھواتے اور اس کو عام طور پر مسلمانوں میں رواج دینے کی کوشش کرتے۔ کم سے کم وہ اس مجلس میں شریک ہونے سے انکار کر دیتے۔ برخلاف اس کے کہ جس ترتیب پر تمام جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق اور عمل تھا۔ جو موجودہ ترتیب قرآن کریم کی ہے اس کے مؤید اور معاون حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ ہاں قرآن شریف کے نزول کی ترتیب کو بغرض حفظ تاریخ اگر انہوں نے محفوظ کر لیا ہو تو اس میں کچھ ہرج بھی نہیں۔ سوال تو صرف یہ ہے کہ آیا انہوں نے اس ترتیب کو ترتیب قرآنی کے نام سے موسوم کر کے عام طور پر مروج کرنے کی کوشش یا ارادہ بھی کبھی کیا؟ پھر انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہی ترتیب نبوی پر عمل پیرا ہونے اور اس کے رواج دینے میں مدد نہیں کی بلکہ جب اپنی خلافت کا زمانہ آیا تو بھی اسی ترتیب کو قائم رکھا۔ حالانکہ اگر قرآن شریف کی مسلمہ و مروجہ ترتیب میں ان کو کوئی اختلاف ہوتا تو فوراً سب سے پہلے اس کی اصلاح کرنا ان کا فرض تھا۔ پس اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے تو صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے طور پر تاریخ نزول کو کسی قدر محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ باوجودیکہ بعض صحابہ کو دوسرے سے کئی مسائل میں اختلاف تھا لیکن ترتیب آیات قرآنی کے متعلق صحابہ میں قطعاً کوئی اختلاف نظر نہیں آتا۔

❀ تلاوت وحفظ قرآن بغیر ترتیب سور، ناممکن تھا

اس کے بعد دوسرا مسئلہ جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ سورتوں کی ترتیب ہے اس مسئلہ پر بحث کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ بتادینا ضروری ہے کہ سوائے اس حال کے جب کہ سارے قرآن شریف کی تلاوت کرنا منظور ہوتا۔ نمازوں یا نمازوں کے باہر قرآن کریم پڑھنے کے لیے یہ امر ضروری نہیں خیال کیا جاتا تھا کہ سورتوں کی ترتیب کو ملحوظ رکھا جائے۔ یعنی اگر ایک رکعت میں ایک سورت پڑھی ہے تو دوسری میں اس سے اگلی سورت پڑھی جائے۔ ہم نے اوپر احادیث کی سند سے ثابت کیا ہے کہ صحابہ میں بہت سارے ایسے بزرگ موجود تھے جن کو سارا قرآن شریف ازبر تھا۔ اور وہ لوگ اسے اپنے حافظوں میں تروتازہ اور ضبط رکھنے کے لیے ہمیشہ تلاوت کرتے رہتے اور مقررہ مدت میں ختم کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس پر صحیح بخاری میں ایک باب باندھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ ''کتنی مدت میں قرآن شریف ختم کرنا چاہیے''۔ اس باب کے ضمن میں آنحضرت ﷺ کی حدیثیں دی ہیں جن میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک صحابی کو تین دن سے کم عرصہ میں قرآن شریف کا ختم کرنا منع فرمایا تھا۔ اور ایک دوسرے صحابی کو سات دنوں سے کم عرصہ میں قرآن شریف کا ختم کرنا منع کیا۔ ان حدیثوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل ظاہر ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو سارا قرآن شریف حفظ تھا وہ ہمیشہ اس کی تلاوت کرتے رہتے تھے اور معمولاً سات دنوں میں ختم کیا کرتے تھے۔ قرآن شریف جتنی بڑی کتاب حافظہ میں جب ہی محفوظ رہ سکتی تھی کہ اس کی تلاوت پر مداومت کی جائے۔ چنانچہ خود سرور کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ''قرآن شریف کو یاد رکھنے کے لیے اس کی ہمیشہ تلاوت کرتے رہنا چاہیے ورنہ یہ یاد نہیں رہے گا۔'' اس لیے بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن شریف کی تلاوت پر مداومت کرتے تھے۔

اب اس بات کا سمجھنا بہت آسان ہے کہ قرآن شریف کو بار بار پڑھنا اور ہر دفعہ ایک مہینہ مدت کے اندر ختم کرنا اس امر کا متقاضی ہے کہ اس کی سورتوں کی کوئی ترتیب اور تقسیم موجود ہو۔ والاّ مداومت کے ساتھ پڑھنا اور ختم کرنا ناممکن نہ تھا۔ اس کے علاوہ صریح شہادت بھی موجود ہے کہ سورتوں میں ایک ترتیب مقرر تھی۔ احمد، ابوداؤد وغیرہم نے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے صاف ظاہر ہورہا ہے کہ سورتوں کی تقسیم آنحضرت ﷺ نے خود فرمائی تھی۔ ہم اس جگہ اس حدیث کو نقل کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے:

((عَنْ اَوْسِ بْنِ اَبِیْ اَوْسٍ حُذَیْفَةَ الثَّقَفِیِّ قَالَ: کُنْتُ فِی الْوَفْدِ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا مِنْ ثَقِیْفَ .... فَقَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: «إِنَّهُ طَرَأَ عَلَیَّ حِزْبِی مِنَ الْقُرْآنِ فَکَرِهْتُ أَنْ أَخْرُجَ حَتّٰی أُتِمَّهُ». قَالَ أَوْسٌ: فَسَأَلْتُ أَصْحَابَ رَسُولِ اللّٰہِ ﷺ کَیْفَ تُحَزِّبُونَ الْقُرْآنَ؟ قَالُوا: ثَلَاثٌ وَخَمْسٌ وَسَبْعٌ وَتِسْعٌ وَإِحْدَی عَشْرَةَ وَثَلَاثَ عَشْرَةَ وَحِزْبُ الْمُفَصَّلِ.))[1]

اوس فرماتے ہیں کہ ثقیف کے اس وفد میں جو اسلام قبول کرنے والے تھے میں بھی موجود تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ہمیں کہا کہ ''میں نے اپنی قرآن شریف کی منزل کو پورا کرنا ہے۔ اس لیے میں ارادہ کرتا ہوں کہ جب تک ختم نہ کرلوں اس وقت تک باہر نہ نکلوں۔'' اس پر ہم نے اصحاب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کس طرح قرآن شریف کو حصوں میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ تین سورتوں اور پانچ سورتوں اور سات سورتوں اور نو سورتوں اور گیارہ سورتوں اور تیرہ سورتوں اور ق سے شروع ہوکر اخیر قرآن تک جس کو مفصل کہتے ہیں''۔

1- مذکورہ بالا حدیث احادیث کی مختلف کتب (شعب الإیمان للبیهقي، سنن أبي داود، سنن ابن ماجه) ودیگر میں وارد ہوئی ہے مگر تمام اسناد کا مرجع ایک شخص عبداللہ بن عبدالرحمن بن یعلی الطائفی ہے جو کہ ضعیف ہے۔ (ابوسیف اللہ)

❀ قرآن شریف کی سات منزلوں سے ترتیب سور پر دلیل

پس یہ سات حصے ہوئے جنہیں سات منزلیں کہا جاتا ہے۔ یہ ہر منزل ایک دن میں پڑھی جاتی ہے اور اس طریق سے سارا قرآن شریف سات دنوں میں ختم ہوتا ہے۔ دوسری معتبر صحیح حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بعض صحابہ کو تاکید فرمائی کہ قرآن شریف کو سات دنوں میں ختم کیا کریں۔ اس حدیث کے راوی پہلی حدیث کے راویوں سے جدا ہیں۔ ان دونوں مضمون واحد کی حدیثوں کا مختلف راویوں کی روایت سے بیان ہونا ایک دوسرے کی صداقت کی دلیل ہے۔

مذکوہ بالا حدیث سے سورتوں کی ترتیب کا وجود واضح طور پر ثابت ہے۔ کیونکہ وہی منزلیں جن میں قرآن شریف کے اس حدیث کی رو سے حصے کیے ہوئے ہیں آج تک مسلمانوں میں مروج ہیں۔ اور ساری اسلامی دنیا اسی پر کاربند اور عامل ہے۔ پس اس تعامل سے بھی صاف شہادت اس حدیث کی صداقت کی ملتی ہے۔ ان سات حصوں کو مسلمانوں کی اصطلاح میں سات منزلیں کہتے ہیں۔ اور ہر ایک منزل میں اسی قدر سورتیں ہیں جو اس حدیث میں مذکور ہیں۔ جیسے کہ حدیث شریف میں لکھا ہے۔ ساتویں منزل ٹھیک اس کے مطابق سورۃ ق سے شروع ہوتی ہے۔ پہلی چھ منزلوں میں کل اڑتالیس سورتیں ہیں اور یہی وہ تعداد ہے جو احادیث سے ثابت ہے

اس جگہ ایک بات ناظرین کو یاد رکھنی چاہیے کہ حدیث مذکورۃ الصدر میں سورۂ فاتحہ جو قرآن شریف میں سب سے پہلے لکھی ہوئی ہے شمار نہیں کی گئی اور یہ امر کسی غلطی پر مبنی نہ تھا۔ پس سورۂ بقرہ سے شروع کرکے تین سورتوں کی ایک منزل۔ پھر اس کے بعد کی پانچ سورتوں کی دوسری منزل۔ پھر اس کے بعد سات سورتوں کی تیسری منزل۔ پھر اس کے بعد نو سورتوں کی چوتھی منزل۔ پھر اس کے بعد گیارہ سورتوں کی پانچویں منزل۔ پھر اس کے بعد تیرہ سورتوں کی چھٹی منزل اور ق سے (جو انچاسویں سورت ہے) شروع ہو کر اخیر تک ساتویں منزل ہوئی۔ اگر فاتحہ کو شامل کرکے شمار کیا جائے تو اس حساب سے سورت ق پچاسویں سورۂ ہوتی ہے۔ اور اگر اس کو شامل نہ کیا جاوے تو پھر سورۂ ق انچاسویں سورت شمار ہوتی ہے اور اس حدیث میں مؤخر الذکر حساب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یعنی پہلی چھ منزلوں میں اڑتالیس سورتیں اور پھر انچاسویں سورۂ ق سے ساتویں منزل شروع ہوتی ہے۔ جس طرح ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں کہ آیات قرآن کی ترتیب خود آنحضرت ﷺ نے کی تھی اسی طرح اس حدیث سے ثابت ہے کہ قرآن کریم کی سورتوں کی ترتیب بھی آنحضرت ﷺ نے خود کی تھی۔ اور آج تک اسی ترتیب پر مسلمان قائم ہیں۔ یعنی موجودہ ترتیب جو مسلمانوں میں مروج اور جاری ہے۔ وہ بجنسہٖ اور بلا تفاوت وہی ترتیب ہے جس میں سر مو فرق نہیں آیا۔

ممکن ہے کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب کہ قرآن شریف آنحضرت ﷺ کی وفات تک پورے طور پر نازل نہیں ہو چکا تھا اور آپ ﷺ کے آخری زمانہ تک آیتیں اور سورتیں نازل ہوتی رہی تھیں تو پھر کسی ترتیب کا وجود کیونکر ممکن ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جب تک مورد وحی (ﷺ) زندہ رہے اس وقت تک قرآن شریف کا نزول مکمل نہیں سمجھا جاسکتا۔ لیکن اس بات سے آیتوں اور سورتوں کی ترتیب میں کوئی ہرج واقعہ نہیں ہوتا۔ جتنا حصہ قرآن شریف کا نازل ہو چکتا تھا اس کو بھی قرآن ہی کہا جاتا تھا۔ اور لفظ قرآن کے معنوں میں یہ بات آسکتی ہے۔ لیکن اس حدیث میں بنی ثقیف کے اسلام لانے کا حال درج ہے۔ اور یہ ثابت ہے کہ ثقیف ہجری کے نویں سال مسلمان ہوئے تھے اور اسی سال میں سورۂ توبہ نازل ہوئی تھی۔ جو تاریخی سلسلہ میں نزول میں سب سے آخری سورت تھی۔ پس جس زمانہ کا ذکر اس حدیث میں ہے اس زمانہ میں قریباً سارا قرآن شریف نازل ہو چکا تھا۔ اور جو آیات بعد میں نازل ہوئی وہ اپنے اپنے موقعہ پر سورتوں میں داخل ہو گئیں۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ ایک چھوٹی سی سورت جس کا نام سورۃ النصر ہے اس کے بعد نازل ہوئی۔ جو آخری منزل میں شامل ہے۔ اور اس حدیث میں صرف چھ پہلی منزلوں کی سورتوں کی تعداد بیان کی گئی ہے لیکن آخری منزل کی سورتوں کی

تعداد نہیں بیان کی۔ اس کی نسبت صرف اتنا کہا گیا ہے کہ ق سے شروع ہو کر خاتمہ تک ساتویں منزل ہے۔ پس اس سورہ کے نزول اور ساتویں منزل میں شمول سے اس شمار میں ہر گز کوئی فرق نہیں آیا جو پہلی چھ منزلوں کے متعلق بیان ہوا ہے۔

❀ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی شہادت کہ ترتیب نزولی اصل ترتیب قرآنی نہیں

اس بات کی بھی کوئی شہادت موجود نہیں کہ سورتوں کی ترتیب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر یا عثمان رضی اللہ عنہ نے کسی طرح تبدیل کر دیا ہو۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بر خلاف تو کبھی کسی نے کوئی اعتراض اس قسم کا نہیں کیا۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کے نقش قدم پر چلے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جو نقلیں قرآن شریف کی گئی تھیں وہ ان بزرگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی نگرانی اور اہتمام میں تیار کرائی گئی تھیں جن کو علم قرآن میں زیادہ ماہر اور واقف مانا گیا تھا۔ اور اکثر ان میں ایسے بزرگ تھے جن کو قرآن شریف ازبر تھا۔ علاوہ ازیں جو دلائل ہم نے اوپر قرآنی آیات کی ترتیب کے متعلق پیش کیے ہیں وہی دلائل مناسب تغیر کے ساتھ قرآن شریف کی سورتوں کی ترتیب پر حاوی ہوتے ہیں لیکن چونکہ بعض حدیثوں میں سورتوں کی ترتیب میں کچھ اختلاف کا بھی ذکر ہے۔ اس لیے اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان احادیث پر بھی نظر ڈالی جائے۔ اس بارہ میں سب سے پہلے صحیح بخاری کے باب تالیف القرآن کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔ اس باب میں جو احادیث درج ہیں ان میں سب سے پہلی حدیث یوں ہے:

((عَنْ يُوسُفَ بْنِ مَاهَكٍ قَالَ: إِنِّي عِنْدَ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ جَاءَهَا عِرَاقِيٌّ فَقَالَ: أَيُّ الْكَفَنِ خَيْرٌ؟ قَالَتْ: وَيْحَكَ وَمَا يَضُرُّكَ؟ قَالَ: يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ! أَرِينِي مُصْحَفَكِ. قَالَتْ: لِمَ؟ قَالَ: لَعَلِّي أُوَلِّفُ الْقُرْآنَ عَلَيْهِ فَإِنَّهُ يُقْرَأُ غَيْرَ مُؤَلَّفٍ. قَالَتْ: وَمَا يَضُرُّكَ أَيَّهُ قَرَأْتَ قَبْلُ، إِنَّمَا نَزَلَ أَوَّلَ مَا نَزَلَ مِنْهُ سُورَةٌ مِنَ الْمُفَصَّلِ فِيهَا ذِكْرُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ حَتَّى إِذَا ثَابَ النَّاسُ إِلَى الإِسْلاَمِ نَزَلَ الْحَلاَلُ وَالْحَرَامُ، وَلَوْ نَزَلَ أَوَّلَ شَيْءٍ لاَ تَشْرَبُوا الْخَمْرَ. لَقَالُوا: لاَ نَدَعُ الْخَمْرَ أَبَدًا. وَلَوْ نَزَلَ: لاَ تَزْنُوا. لَقَالُوا: لاَ نَدَعُ الزِّنَا أَبَدًا. لَقَدْ نَزَلَ بِمَكَّةَ عَلَى مُحَمَّدٍ ﷺ وَإِنِّي لَجَارِيَةٌ أَلْعَبُ ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ ۝﴾ [القمر: 46] وَمَا نَزَلَتْ سُورَةُ الْبَقَرَةِ وَالنِّسَاءِ إِلاَّ وَأَنَا عِنْدَهُ. قَالَ: فَأَخْرَجَتْ لَهُ الْمُصْحَفَ فَأَمْلَتْ عَلَيْهِ آيَ السُّوَرِ.))[1]

یوسف بن ماہک سے روایت ہے کہ میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا جب ایک عراق کا رہنے والا ان کے پاس آیا۔ اور کہا کون سا کفن بہتر ہے؟ فرمایا تجھے (کسی خاص کفن) سے کیا تکلیف ہوتی ہے؟ کہا ام المومنین! مجھے اپنا قرآن شریف دکھایئے۔ فرمایا کیوں؟ کہا تا کہ میں اس پر قرآن کی ترتیب کروں وہ بلا ترتیب پڑھا جاتا ہے۔ فرمایا: تجھے اس سے کیا نقصان پہنچتا ہے کہ کون سا حصہ پہلے پڑھا جاتا ہے؟ اس کا جو حصہ پہلے نازل ہوا تھا وہ مفصل سورتوں میں سے ایک سورت تھی جس میں بہشت اور دوزخ کا تذکرہ تھا۔ لیکن جب اسلام کا چرچا بڑھا اور لوگ داخل ہونا شروع ہوئے تو پھر جواز اور ممانعت کے احکام نازل ہونے لگے۔ اگر سب سے پہلے یہی حکم نازل ہوتا کہ شراب مت پیو تو لوگ کہتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اور اگر سب سے پہلے یہ نازل ہوتا کہ زنا مت کرو تو وہ کہتے ہم زنا کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ مکہ میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اور اس وقت میں ایک لڑکی تھی جو کھیلا کرتی تھی ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ﴾ اور سورہ بقرہ اور نساء نازل نہیں ہوئیں مگر میں آپ کے گھر میں تھی۔ پھر آپ اپنا مصحف نکال لائیں اور اس پر سورتوں کی آیتیں پڑھیں۔

1- صحيح البخاري: 4993، 4876؛ شعب الإيمان للبيهقي: 2108

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ ترتیب قرآن کے متعلق ایک عراقی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے اپنا اعتراض پیش کیا۔ یہ شخص صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت میں سے نہ تھا بلکہ ایک نو مسلم تھا۔ جسے ابھی قرآن شریف سے چنداں واقفیت بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اسی حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جواب بھی درج ہے۔ عراقی کی یہ بات کہ قرآن شریف کی کوئی ترتیب تلاوت میں ملحوظ نہیں رکھی جاتی محض ایک بیہودہ بات تھی اور اس کی نادانی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اسی لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسے ملامت کرنے پر مجبور ہوئیں۔ پھر اسے اس بات کی ضرورت کو سمجھایا کہ کیوں ترتیب نزولی کے مطابق قرآن شریف نہیں لکھا گیا بلکہ اس سے مختلف ترتیب رکھی گئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل نے یہ سوال کیا تھا کہ کیوں قرآن شریف نزولی ترتیب کے مطابق نہیں لکھا جاتا۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کے سوال کا جواب یہ دیا کہ اس میں کوئی ہرج کی بات نہیں کہ کوئی آیت جو پہلے نازل ہو چکی ہو کسی مابعد کی آیت کے پیچھے رکھی جائے۔ جو جلد قرآن شریف کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس عراقی کو دکھائی تھی اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب نزولی ترتیب سے مختلف تھی۔ اور یہ بات اس امر سے بھی زیادہ واضح ہوتی ہے کہ اپنی بات کی تائید میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کئی سورتوں میں سے مختلف آیتیں اس کو پڑھ کر سنائیں۔ اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قرآن شریف کو دوسرے قرآنوں کے موافق پا کر چلا گیا۔

❀ نمازوں میں ترتیب سور ملحوظ نہ رکھی جاتی تھی

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن شریف کی سورتوں کی ترتیب جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے صرف سارے قرآن کی تلاوت کے موقع پر ملحوظ رکھی جاتی تھی۔ اور نمازوں میں قرآن شریف پڑھنے کے وقت یا نمازوں کے باہر جب تھوڑا تھوڑا حصہ پڑھنا منظور ہوتا تھا تو اس وقت اس ترتیب کے ملحوظ رکھنے کی چنداں ضرورت نہ سمجھی جاتی تھی۔ مثلاً: نمازوں میں اس ترتیب کی نگہداشت کی ضرورت نہیں۔ اگر پہلی رکعت میں کوئی سورت یا کسی سورت کا کوئی حصہ پڑھا جائے تو دوسری رکعت میں اسی حصہ سے آگے کا حصہ مسلسل طور پر پڑھا جائے۔ بلکہ جہاں کہیں سے بھی جس سورت یا سورت کے حصہ کو چاہے پڑھ لے۔ حدیثوں میں اس کی شہادت موجود ہے۔ اسی طرح دو یا دو سے زیادہ سورتیں کسی ایک رکعت میں پڑھ لی جاتی تھیں اور بعض حالات میں نمازوں میں پڑھنے کے لیے ایسی سورتوں کو جمع کر لیا جاتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تہجد کی نماز میں عموماً بیس سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ جن میں سے اٹھارہ تو آخری منزل قرآن کی چھوٹی چھوٹی سورتیں تھیں جن کو مفصل کہتے ہیں۔ یہ مفصل سورتیں سورۂ ق سے شروع ہوتی ہیں اور دو سورتیں حٰمٓ سے شروع ہوتی ہیں۔ یعنی تہجد کی دس رکعتوں میں یہ بیس سورتیں اس طرح پڑھا کرتے تھے کہ ہر رکعت میں دو دو سورتیں پڑھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خاص تالیف فرمائی تھی جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے ذریعہ ہم تک محفوظ ہو کر پہنچی ہے اور جس کو تالیف ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تالیف کو قرآن شریف کی سورتوں کی ترتیب سے کوئی واسطہ نہ تھا اور نہ ہی اس پر ہمیشہ عملدرآمد کیا جاتا تھا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس ترتیب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تہجد کی نماز میں ایک یا ایک سے زیادہ مرتبہ ان سورتوں کو پڑھا۔ اور چونکہ صحیح حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نمازوں میں قرآن شریف کی معمولی ترتیب کو ملحوظ نہ رکھا کرتے تھے۔ تو اس خاص تالیف سے اس اصل ترتیب قرآنی کی قدر و منزلت میں کچھ بھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کا ذکر ہی اس لیے کیا گیا کہ یہ اصل ترتیب سے علیحدہ تھی۔ نہ صرف تہجد کی نمازوں تک ہی یہ بات محدود تھی بلکہ عام نمازوں میں بھی سورتوں کی ترتیب معمولہ کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ جیسے مثلاً: ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن شریف کی چوتھی سورت یعنی سورۃ النساء پہلی رکعت میں پڑھی اور دوسری رکعت میں تیسری سورت یعنی آل عمران پڑھی۔ اس واقعہ کے درج کتب ہونے کی بھی یہی وجہ ہے کہ اصل ترتیب سے

اختلاف کی مثال محفوظ رہے اس کی اور مثالیں بھی ہیں۔

❀ تالیف ابن مسعود رضی اللہ عنہ

ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ تالیف ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیس سورتیں جنہیں مفصل کہا جاتا ہے کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تہجد کی نماز میں پڑھا کرتے تھے۔ اس بات کو دیکھ کر بعض لوگوں نے بے سمجھی سے یہ خیال کر لیا کہ گویا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس جو نسخہ قرآن شریف کا تھا اس میں سورتوں کی ترتیب دوسرے نسخوں سے مختلف تھی۔ اس بات کی تائید میں صرف یہی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے اور جس میں بیس چھوٹی چھوٹی سورتوں کے نماز تہجد میں پڑھے جانے کی تالیف کا ذکر ہے۔ لیکن جب ہمیں اس بات کا ثبوت صاف صاف ملتا ہے کہ سورتوں کی ترتیب مروجہ کا لحاظ نمازوں میں ضروری نہیں سمجھا گیا تھا تو اس شہادت کا کچھ اثر اصل ترتیب قرآنی پر نہیں پڑتا۔ اور اگر بفرض محال اس بات کو مان بھی لیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کسی اور ترتیب کے مطابق اپنا قرآن شریف لکھا ہوا تھا تو اس سے یہ بات نہیں پائی جاتی کہ وہ ترتیب صحیح تھی اور جو قرآن شریف عام طور پر مسلمانوں میں مروج تھے ان میں غلط ترتیب سے سورتیں لکھی ہوئی تھیں۔ اگر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی کوئی جدا ترتیب تھی تو وہ انہیں تک محدود رہی۔ کسی صحابی نے اس کی طرف کبھی التفات بھی نہیں کیا۔ بلکہ سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت نے اسی بات پر اکتفا کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو نسخے قرآن کریم کے لکھوائے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں جمع کیے ہوئے صحیفوں سے نقل کیے گئے تھے وہ اس ترتیب کے مطابق ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی تھی اور اصل میں تو اس قضیہ کا فیصلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر ہوتا تھا نہ کہ شخصی آراء پر۔ اب اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ مذکورہ بالا تالیف ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے قرآن شریف کی باقی سورتوں کو کسی اور طریق سے ترتیب دیا تھا اور ان چند سورتوں میں بھی انہوں نے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تہجد کی نمازوں میں پڑھتے سن کر خیال کر لیا کہ یہی صحیح ترتیب ہے۔ مگر یہ خیال ان کا غلط تھا۔ نہ تو یہ ہی ثابت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بات کو تحقیق ہی کیا اور نہ کسی اور صحابی سے ہی پوچھا۔ صرف اپنے خیال سے ایک بات کا یکطرفہ فیصلہ کر لیا اور اسی لیے ان کے نام سے ہی یہ تالیف منسوب ہے۔ لیکن اس قیاس میں انہوں نے غلطی کھائی ہے۔ صحیح احادیث موجود ہیں جن میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک رکعت میں کسی سورت کا کوئی حصہ پڑھ لیا کرتے تھے اور پھر اس کے بعد دوسری رکعت میں کسی اور سورت کا کوئی اور حصہ پڑھ لیتے تھے خواہ وہ ترتیب قرآنی میں اس سے پہلے ہی آئی ہو۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کسی ایسی ترتیب پر ایک جدا تالیف کی بنا رکھ دی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بعض وقت کی نمازوں میں ظاہر ہوئی۔ انہوں نے اپنے فیصلہ کی اس کو بنا ٹھہرانے میں سخت غلطی کھائی۔ لیکن عام اصولی لحاظ سے ان کی ترتیب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآن کی ترتیب سے کچھ چنداں مختلف نہ تھی۔ جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآن میں طوال یعنی لمبی سورتیں ابتدا میں لکھی ہوئی تھیں۔ اسی طرح انہوں نے بھی ان کو پہلے ہی لکھا ہوا تھا۔ البتہ اتنا فرق بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے سورۃ النساء کو سورۂ آل عمران سے پہلے رکھا تھا۔ گویا تیسری سورت کو چوتھے اور چوتھی سورت کو تیسرے نمبر پر لکھا۔

اب یہ بھی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز میں سورۃ النساء کو آل عمران سے پہلے پڑھا تھا۔ سو غالباً اسی سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے رائے قائم کر لی ہو گی۔ اب صرف یہی دو اختلاف ہیں جو ان کی ترتیب میں پائے جاتے ہیں جن پر معترض شور مچاتے ہیں۔ امام بخاری نے ایک حدیث کو نقل کیا ہے جس میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے سورۂ بنی اسرائیل، الکہف، طٰہٰ، مریم اور انبیاء کو درمیان قرآن شریف میں ٹھیک اسی ترتیب سے بیان فرمایا جس ترتیب سے یہ سورتیں اصل ترتیب قرآنی میں واقع ہیں۔ اس قسم کی شہادتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے نسخوں کی ترتیب ایک ہی تھی اور اگر کوئی اختلاف

تھا تو وہ نہایت ہی خفیف اور چھوٹا سا تھا۔ اور اس کی وجہ صرف حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی غلط فہمی تھی۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کی ترتیب کو قبول نہ کر کے اس غلطی کی حقیقت کو کھول دیا۔

❀ سیدنا اُبی بن کعب اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ترتیب مرفوعہ

ترتیب سور کے اختلاف میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ دو اور بزرگوں کا نام لیا جاتا ہے یعنی اُبی بن کعب اور حضرت علی رضی اللہ عنہم۔ لیکن اعتبار کے قابل کوئی شہادت موجود نہیں۔ جس سے اس امر کا ادنی سا ثبوت بھی مل سکے کہ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کسی مختلف ترتیب کے قائل تھے۔ ان کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ چوتھی سورۃ النساء کی جگہ آل عمران کو جو تیسری سورت ہے رکھتے تھے۔ اور تیسری کی جگہ چوتھی رکھتے تھے۔ اگر یہی اختلاف تھا تو یہ نہایت خفیف سی بات تھی اور ممکن ہے کہ انہوں نے بھی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نماز میں پڑھتے سن کر ایسا سمجھ لیا ہو۔ لیکن ہم آگے چل کر ثابت کریں گے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اس اختلاف کے مرتکب نہیں ہوئے۔ اور اگر کبھی انہوں نے اس قسم کا اختلاف کیا بھی تھا تو واقعات پر مطلع ہوتے ہی وہ اس پر قائم نہ رہے اور اپنے ہی عمل سے ثابت کر دیا کہ ترتیب نبوی وہی ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صحیفوں میں ملحوظ رکھی گئی۔

ایسا ہی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے قرآن شریف کو نزولی ترتیب کے موافق جمع کیا تھا۔ چنانچہ اس کی تائید میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے جس میں ان کا قول اس مضمون کا نقل کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد انہوں نے اس وقت تک آرام نہ کیا جب تک کہ سارے قرآن شریف کی سورتوں کو تاریخی یعنی نزولی ترتیب دے کر جمع نہ کر لیا۔ لیکن یہی حدیث مجروح ہے کیونکہ باوجودیکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد مسندِ خلافت پر بھی رونق افروز ہو گئے پر کوئی ایسا قرآن جس کا اس حدیث میں ذکر ہے نہ شائع ہوا اور نہ آئندہ نسلوں کے ہاتھوں میں پہنچایا گیا۔ اس کے علاوہ صحیح احادیث سے اس واقعہ کی صحت کے خلاف ثبوت ملتا ہے۔ فتح الباری میں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک حدیث درج ہے:

((عَنْ عَبْدٍ خَيْرَةٍ قَالَ: سَمِعْتُ عَلِيًّا يَقُوْلُ: اَعْظَمُ النَّاسِ فِي الْمَصَاحِفِ اَجْرًا اَبُوْبَكْرٍ رَحْمَةُ اللهِ عَلَىٰ اَبِيْ بَكْرٍ هُوَ اَوَّلُ مَنْ جَمَعَ كِتَابَ اللهِ.))[1]

یعنی ''قرآن شریف کے جمع کرنے والوں میں سے سب سے بڑے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہی سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن جمع کیا۔''

تو حضرت علی رضی اللہ عنہ خود تسلیم کرتے ہیں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی وہ شخص ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قرآن کریم کو جمع کیا۔ اس کے مقابل کسی دوسرے کی روایت کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بعد وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آرام نہیں کیا جب تک کہ قرآن شریف کو جمع نہیں کر لیا مردود ٹھہرتی ہے۔ اور یہ حدیث اپنے ثبوت میں اکیلی نہیں بلکہ دوسرے تاریخی واقعات اس کے مؤید اور مصدق ہیں جن میں ایک بات تو یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں بھی کسی دوسری ترتیب کا نہ ذکر ہی کیا اور نہ ہی موجودہ مسلمہ ترتیب سے مختلف ترتیب والا قرآن کسی کو دکھایا۔ لیکن اس کے ماسوا بھی ایک اور ایسی زبردست بات ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور نہ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ اس ترتیب سے مخالف کسی دوسرے ترتیب پر عملدرآمد رکھتے تھے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صحیفوں میں ملحوظ رکھی گئی تھی۔ کیونکہ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں بزرگوں کی سرپرستی میں قرآن کریم کی نقلوں کا کام بعہد خلافت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سرانجام پایا تھا اور اس وقت ان کو اس کام میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے برابر دسترس حاصل تھی اور جس طرح

1- فتح الباری: 12/1

انہوں نے ہم کو موجود قرآن مجید پہنچایا۔ اسی طرح اگر کوئی اور ترتیب ان کے خیال میں ہوتی تو بجائے اس کے اس کو بآسانی ہم تک پہنچا سکتے تھے اور کوئی مانع نہ تھا۔

❀ سورۂ انفال اور توبہ کا تعلق

اس موقعہ پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت پر نظر ڈالی جائے جو قرآن شریف کی سورتوں کی ترتیب کے برعکس نتائج کے ساتھ پیش کی جاتی ہے اور وہ روایت یہ ہے:

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قُلْتُ لِعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ: مَا حَمَلَكُمْ أَنْ عَمَدْتُمْ إِلَى الأَنْفَالِ وَهِيَ مِنَ الْمَثَانِي وَإِلَى بَرَاءَةَ وَهِيَ مِنَ الْمِئِينَ، فَقَرَنْتُمْ بَيْنَهُمَا وَلَمْ تَكْتُبُوا بَيْنَهُمَا سَطْرَ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ، وَوَضَعْتُمُوهُمَا فِي السَّبْعِ الطُّوَلِ؟ مَا حَمَلَكُمْ عَلَى ذٰلِكَ؟ فَقَالَ عُثْمَانُ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مِمَّا يَأْتِي عَلَيْهِ الزَّمَانُ وَهُوَ تَنْزِلُ عَلَيْهِ السُّوَرُ ذَوَاتُ الْعَدَدِ فَكَانَ إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الشَّيْءُ دَعَا بَعْضَ مَنْ كَانَ يَكْتُبُ فَيَقُولُ ضَعُوا هَؤُلَاءِ الآيَاتِ فِي السُّورَةِ الَّتِي يُذْكَرُ فِيهَا كَذَا وَكَذَا، وَإِذَا نَزَلَتْ عَلَيْهِ الآيَةُ فَيَقُولُ: ضَعُوا هٰذِهِ الآيَةَ فِي السُّورَةِ الَّتِي يُذْكَرُ فِيهَا كَذَا وَكَذَا، وَكَانَتِ الأَنْفَالُ مِنْ أَوَائِلِ مَا أُنْزِلَتْ بِالْمَدِينَةِ وَكَانَتْ بَرَاءَةُ مِنْ آخِرِ الْقُرْآنِ وَكَانَتْ قِصَّتُهَا شَبِيهَةً بِقِصَّتِهَا، فَظَنَنْتُ أَنَّهَا مِنْهَا فَقُبِضَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَلَمْ يُبَيِّنْ لَنَا أَنَّهَا مِنْهَا.))[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ کیوں سورہ انفال کو جو مثانی میں سے ہے سورۂ براءت کے ساتھ جو طوال میں سے ہے ایسے اتصال سے لکھا ہے کہ ان کے درمیان [بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ] نہیں لکھی۔ اور اس طرح ان دونوں سورتوں کو سات لمبی سورتوں میں شامل کر دیا ہے۔ حضرت عثمان نے کہا کہ آنحضرت ﷺ کی عادت تھی کہ جب ایک ہی وقت بہت سی سورتیں آپ پر نازل ہوتیں اور ان میں کسی سورت کی آیت کا نزول ہوتا تو کسی کاتب وحی کو بلا لیتے اور اس کو حکم دیتے کہ ''وہ آیت فلاں سورت کے فلاں موقع پر لکھ دو۔'' سورۂ انفال مدینہ میں ابتدائی زمانہ میں آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی۔ اور براءت کا نزول آخری زمانہ میں ہوا اور ان دونوں کا مضمون باہم ملتا جلتا تھا۔ اس لیے میں نے یہ خیال کیا کہ دوسری سورت پہلی سورت میں سے ہی ہے۔ آنحضرت ﷺ وفات پا گئے اور انہوں نے ہمیں واضح طور پر یہ نہ فرمایا تھا کہ یہ سورت اسی میں سے ہے۔

بعض لوگ غلط فہمی سے اس روایت سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ گویا جمع اور ترتیب قرآن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے اختیار اور سمجھ کے موافق کی ہے اور اس لیے حدیث کو اس دعویٰ کی تائید میں بطور ثبوت پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس سے قطعاً یہ بات مستنبط نہیں ہوتی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے کو ترتیب قرآنی میں کوئی دخل تھا۔ بلکہ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن شریف کی آیات کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی آنحضرت ﷺ نے ہی کی ہوئی تھی۔ اور اس کے علاوہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی وہ کمال درجہ کی احتیاط ثابت ہوتی ہے کہ جس سے انہوں نے آنحضرت ﷺ کے فرمان اور عمل کو نہایت امانت کے ساتھ اس کام میں برتا۔ حالانکہ ساری سورتوں کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنے کا عام طور پر قاعدہ تھا۔ مگر اس سورت کے ساتھ بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھنے کی سند رسول اللہ ﷺ سے نہ پا کر اپنی رائے کو اتنا بھی دخل نہ دیا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ہی اس پر لکھ دیتے۔ الفاظ روایت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

1- جامع الترمذي: 3086؛ سنن أبي داود: 140؛ قال الشيخ الألباني: ضعيف؛ مسند الإمام أحمد: 399، 499؛ قال الشيخ شعيب الأرنؤوط: إسناد ضعيف ومتنه منكر.

کے ترتیب دینے پر کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ صرف ایک امر کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنا اطمینان کرنا چاہا ہے۔ ان کا سوال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا ان کی مزعومہ ترتیب پر نہیں ورنہ واحد میں خطاب کرتے۔ (حَمَلَكُمْ، عَمَدْتُّمْ، قَرَنْتُمْ) نہ فرماتے۔

علاوہ ازیں ان بارہ آدمیوں میں جن کے سپرد حضرت عثمان نے نقل مصاحف کا کام کیا تھا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا نام بھی ہے۔ پس جب وہ خود نقل کرنے اور کرانے والے تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ کیونکر کہہ سکتے تھے کہ تم نے ایسا ایسا کیوں کیا؟ مطلب ان کا صرف یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جواب اس حقیقت کو کھلے طور پر واضح کر دیتا ہے۔ وہ جواب میں کہتے ہیں:

((فَظَنَنْتُ أَنَّهَا مِنْهَا فَقُبِضَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَلَمْ يُبَيِّنْ لَنَا أَنَّهَا مِنْهَا.))[1]

''میرا خیال تھا کہ سورہ براءت سورۂ انفال کا ہی حصہ ہے۔ سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوت ہو گئے اور آپ نے کھول کر نہیں فرمایا کہ وہ اس کا حصہ ہے۔''

تو اس کا مطلب تو صاف یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں میرا ایسا خیال تھا کہ سورۂ براءۃ سورۂ انفال کا ہی حصہ ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کھول کر بیان نہیں فرمایا اور اس سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی سوال کے جواب میں بوضاحت بیان کیا کہ آیات اور سورتوں کی ترتیب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے تھے۔ پس بات اصل میں یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اس کی وجہ دریافت کرتے ہیں کہ انفال اور براءۃ کو ملا کر کیوں رکھا گیا۔ وہ جواب میں فرماتے ہیں کہ آیتوں اور سورتوں کو جب نازل ہوتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود خاص خاص مقامات پر رکھواتے جس کا مطلب صاف ہے کہ آپ کی ہدایت سے ہی یہ دونوں بھی اسی طرح رکھی گئیں۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنا خیال بیان کرتے ہیں کہ میرا خیال یہ تھا کہ انفال اور براءۃ ایک دوسرے کا حصہ ہی ہیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوت ہو گئے اور آپ نے ایسا نہیں فرمایا۔ اس لیے میں ان کو ایک دوسرے کا حصہ نہیں کہتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ خیال کیوں ہوا کہ سورہ براءۃ انفال کا ہی حصہ ہے اور یہ خیال بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ہی پیدا ہوا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سوال پر کہ ان سورتوں کی یہ ترتیب کیوں ہے کہ ایک چھوٹی اور بڑی سورت اکٹھی رکھی گئی ہیں اور ان کے درمیان بسم اللہ بھی نہیں لکھی گئی۔ وہ اس خیال کو ظاہر کرتے ہیں۔ جواب اس کا ظاہر ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اس طرح اکٹھا رکھوایا اور درمیان میں بسم اللہ نہ لکھوائی تو حضرت عثمان کو یہ خیال ہوا کہ انفال اور براءۃ ایک ہی سورت ہیں۔ لیکن چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا تھا اس لیے انہوں نے اس خیال پر حزم نہیں کیا اور جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اور جس حد تک فرمایا اسی پر قائم رہے۔ پس یہ روایت ایک مضبوط اور زبردست شہادت اس بات پر ہے کہ آیتوں اور سورتوں کی تمام ترتیب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی اور جو کچھ آپ نے کیا یا فرمایا اس سے صحابہ نے بال برابر بھی انحراف نہیں کیا۔

1- نفس المرجع السابق.

مصاحف سیدنا ابو بکر و سیدنا عثمان رضی اللہ عنہم

❀ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن میں کیا کام کیا

اس مرحلہ پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس کا جواب ہم نے آئندہ دینے کا وعدہ کیا تھا کہ اگر کل قرآن کریم ضابطہ تحریر و حافظہ میں معہ ترتیب سور و آیات کے آچکا تھا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وقت میں جیسا کہ صحیح حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کو جمع کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور اس کا کیا مطلب تھا؟ جاننا چاہیے کہ اصل بات جیسا کہ معتبر روایات اور صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے یہی ہے کہ جمع قرآن کریم کا اصل کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کے ماتحت پورا کیا۔ خود قرآن کریم اس بات پر شاہد ہے جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے جو پہلے بھی نقل کی جا چکی ہے:

﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ○﴾

[القيامة: 18-17]

یہ سورۂ قیامہ کی آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھلے طور پر یہ وعدہ موجود ہے کہ جیسا قرآن کریم کا پڑھنا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھانا ہمارا یعنی خداوند قدوس کا کام ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی جمع بھی ہمارا یعنی باری تعالیٰ کا کام ہے۔ پھر ایک دوسرے موقعہ پر جب کفار نے یہ اعتراض کیا کہ قرآن شریف ٹکڑے ٹکڑے کر کے کیوں نازل کیا گیا اور سارا اکٹھا نازل کیوں نہیں ہوا۔ اعتراض کو نقل کر کے اس کا جواب یوں فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝۳۲﴾ [الفرقان: 32]

یعنی ٹکڑے ٹکڑے نازل کرنے میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً وحی الٰہی کے نزول سے مورد وحی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تسکین ملتی رہے (مگر کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ان ٹکڑوں میں جوڑ کیونکر ہوگا۔ اور ان کی ترتیب کیا ہوگی کیونکہ) ان کو ترتیب اور تدریج سے پڑھنا یہ بھی ہمارا ہی کام ہے۔ غرض یہ ہے کہ ایسی ایسی آیات اور ان واقعات سے جو ہم تفصیل کے ساتھ پہلے بیان کر چکے ہیں نہایت صفائی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جمع قرآن کا اصل کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں خود ہی کیا تھا۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ سوائے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جو کل قرآن شریف کو حفظ رکھتے تھے دوسروں کو جمع کی ترتیب کے ساتھ قرآن کے حفظ رکھنے کی ضرورت پیش نہ آسکتی تھی۔ پس قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں پوری ترتیب کے ساتھ جمع تو تھا لیکن یہ جمع شدہ قرآن کریم صرف حفاظ قرآن کے حافظوں میں ہی محفوظ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کتاب یا ایک جلد کی صورت میں قرآن شریف کو جمع نہیں کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ایک آیت اور ہر ایک سورت نزول کے وقت تحریر میں بھی فی الفور محفوظ کر لی جاتی تھی۔ مگر جب تک مہبط وحی علیہ الف الف صلوٰۃ والسلام موجود تھے اور وحی کا نزول جاری تھا یہ سب تحریریں ایک جلد کی صورت میں جمع نہ ہو سکتیں تھیں۔

وجہ اس کی یہ تھی کہ بعض سورتیں جو ابتداءً مدنی زندگی میں نازل ہوئیں ان کی بعض آیات اخیر زمانہ نبوی تک نازل ہوتی رہیں۔ پس اگر سورتوں اور آیات کو ترتیب دے کر ایک مجلد میں جمع کر دیا جاتا تو یہ مشکل پیش آتی کہ ایک سورت جو ساری لکھی جا چکی تھی اس کی کوئی آیت جب بعد میں نازل ہو اور بلحاظ ترتیب کے اس کا کسی سورت کے درمیان میں آنا ضروری ہو تو اسے کیا کیا جائے۔ حافظہ میں تو ایسی

ترتیب کا دینا ہر وقت ایک آسان امر تھا۔ مگر تحریر میں جب درمیان کوئی جگہ نہ چھوڑی گئی ہو جو قبل اس وقت چھوڑی نہ جاسکتی تھی تو یہ دقت پیدا ہوتی کہ بعد کی نازل ہوئی ہوئی آیات جو ترتیب کے لحاظ سے کسی سورت کے اندر آنی چاہئیں اپنے موقعہ پر رکھی نہ جاسکتیں۔ اسی مصلحت کے لحاظ سے آنحضرت ﷺ نے اس بات کو کافی سمجھا کہ جمع شدہ قرآن پوری ترتیب کے ساتھ حافظوں میں محفوظ رہے۔ مگر جب آنحضرت ﷺ فوت ہو گئے تو پھر قرآن شریف کے ایک کتاب کی صورت میں جمع کرنے کی جو دقتیں تھیں وہ جاتی رہیں۔ چنانچہ یہی ضرورت قرآن کریم کو ایک مجلد کی صورت میں جمع کرنے کی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں محسوس کی گئی اور اسی کو پورا کرنے کے لیے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے زید کو جمع قرآن پر مامور کیا تاکہ وہ تحریر اور ایک مجلد کی صورت میں اسی ترتیب کے ساتھ قرآن کریم کو جمع کریں۔ جس ترتیب کے ساتھ یہ پاک کتاب حافظوں میں جمع تھی۔

❀ زید رضی اللہ عنہ کا جمع مسودات قرآن پر مامور ہونا

جو کچھ میں نے یہاں بیان کیا ہے اس کی تصدیق اس روایت سے ہوتی ہے جس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں جمع قرآن کے واقعہ کی تفصیل ہے۔ یہ روایت صحیح بخاری کی ہے۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد مسیلمہ کذاب کے خلاف حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ایک مہم بھیجنی پڑی۔ اس جنگ میں کئی قراء شہید ہو گئے۔ جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خطرہ ہوا کہ اگر اور لڑائیاں ایسی ہی خطرناک پیش آجائیں تو ممکن ہے کہ سب کے سب قاری یعنی حافظ لوگ شہید ہو جائیں اور اس طرح سے قرآن شریف کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے۔ حدیث اس طرح پر ہے:

((عَنْ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ الأَنْصَارِيَّ قَالَ: أَرْسَلَ إِلَيَّ أَبُو بَكْرٍ مَقْتَلَ أَهْلِ الْيَمَامَةِ وَعِنْدَهُ عُمَرُ، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: إِنَّ عُمَرَ أَتَانِي فَقَالَ: إِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ يَوْمَ الْيَمَامَةِ بِالنَّاسِ، وَإِنِّي أَخْشَى أَنْ يَسْتَحِرَّ الْقَتْلُ بِالْقُرَّاءِ فِي الْمَوَاطِنِ فَيَذْهَبَ كَثِيرٌ مِنَ الْقُرْآنِ، إِلاَّ أَنْ تَجْمَعُوهُ، وَإِنِّي لأَرَى أَنْ تَجْمَعَ الْقُرْآنَ. قَالَ أَبُو بَكْرٍ: قُلْتُ لِعُمَرَ: كَيْفَ أَفْعَلُ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ؟ فَقَالَ عُمَرُ: هُوَ وَاللهِ خَيْرٌ. فَلَمْ يَزَلْ عُمَرُ يُرَاجِعُنِي فِيهِ حَتَّى شَرَحَ اللهُ لِذَلِكَ صَدْرِي، وَرَأَيْتُ الَّذِي رَأَى عُمَرُ. قَالَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ: وَعُمَرُ عِنْدَهُ جَالِسٌ لاَ يَتَكَلَّمُ. فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: إِنَّكَ رَجُلٌ شَابٌّ عَاقِلٌ وَلاَ نَتَّهِمُكَ، كُنْتَ تَكْتُبُ الْوَحْيَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ فَتَتَبَّعِ الْقُرْآنَ فَاجْمَعْهُ. فَوَاللهِ لَوْ كَلَّفَنِي نَقْلَ جَبَلٍ مِنَ الْجِبَالِ مَا كَانَ أَثْقَلَ عَلَيَّ مِمَّا أَمَرَنِي بِهِ مِنْ جَمْعِ الْقُرْآنِ، قُلْتُ: كَيْفَ تَفْعَلاَنِ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ النَّبِيُّ ﷺ؟ فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: هُوَ وَاللهِ خَيْرٌ، فَلَمْ أَزَلْ أُرَاجِعُهُ حَتَّى شَرَحَ اللهُ صَدْرِي لِلَّذِي شَرَحَ اللهُ لَهُ صَدْرَ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ، فَقُمْتُ فَتَتَبَّعْتُ الْقُرْآنَ أَجْمَعُهُ مِنَ الرِّقَاعِ وَالأَكْتَافِ وَالْعُسُبِ وَصُدُورِ الرِّجَالِ، حَتَّى وَجَدْتُ مِنْ سُورَةِ التَّوْبَةِ آيَتَيْنِ مَعَ خُزَيْمَةَ الأَنْصَارِيِّ، لَمْ أَجِدْهُمَا مَعَ أَحَدٍ غَيْرِهِ ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم﴾ [التوبة: 129-128] إِلَى آخِرِهِمَا، وَكَانَتِ الصُّحُفُ الَّتِي جُمِعَ فِيهَا الْقُرْآنُ عِنْدَ أَبِي بَكْرٍ حَتَّى تَوَفَّاهُ اللهُ، ثُمَّ عِنْدَ عُمَرَ حَتَّى تَوَفَّاهُ اللهُ، ثُمَّ عِنْدَ حَفْصَةَ بِنْتِ عُمَرَ.))[1]

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اہل یمامہ کے قتل کے بعد یعنی ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی جو جنگ یمامہ میں شہید ہوئے حضرت ابو بکر صدیق نے مجھے بلا بھیجا۔ جب میں آپ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ حضرت عمر بن خطاب بھی آپ کے پاس موجود ہیں۔

1- صحيح البخاري: 4679

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ ابھی عمر میرے پاس آئے اور مجھے کہا کہ یمامہ کی جنگ میں قرآن کریم کے قاریوں میں بہت قتل واقعہ ہوا ہے۔ اور میں ڈرتا ہوں کہ اگر اور میدانوں میں بھی اسی طرح قاری لوگ (یعنی حافظان قرآن کریم) قتل ہوتے رہے تو بہت سا حصہ قرآن شریف کا گم ہو جائے گا۔ اور میری یہ رائے ہے کہ آپ جمع قرآن کا حکم دے دیں۔ میں نے عمر کو کہا کہ تم کیونکر اس کام کو کرتے ہو جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا۔ عمر نے جواب دیا کہ اللہ کی قسم! اس میں بہتری ہے۔ پس عمر میرے ساتھ مباحثہ کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ کو اس کے لیے کھول دیا۔ اور میری بھی اس میں وہی رائے ہو گئی جو عمر کی رائے تھی۔ زید کہتے ہیں کہ پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ تم عقلمند اور جوان آدمی ہو اور ہم تم پر کسی طرح کی تہمت نہیں لگا سکتے۔ اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وحی بھی لکھا کرتے تھے۔ پس قرآن کو تلاش کر کے اس کو ایک جگہ جمع کرو۔ اللہ کی قسم ہے اگر مجھے اس بات پر مجبور کرتے کہ تم ایک پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کر دو تو یہ بات مجھے زیادہ دشوار معلوم نہ ہوتی بہ نسبت اس کے کہ مجھے جمع قرآن کا حکم دیا۔ میں نے کہا تم کس طرح وہ کام کرتے ہو جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا۔ ابو بکر نے فرمایا واللہ یہی بہتر ہے۔ پس ابو بکر رضی اللہ عنہ مجھ سے اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے میرا سینہ اس بات کے لیے کھول دیا جس کے لیے اس نے ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہ کے سینے کھولے تھے۔ پس میں نے قرآن کو تلاش کرنا شروع کیا اور میں اسے جمع کرتا تھا کھجور کی ٹہنیوں اور پتھر کی تختیوں سے اور آدمیوں کے سینوں یعنی حافظوں سے یہاں تک کہ اخیر سورہ توبہ مجھے ابی خزیمہ انصاری کے پاس سے ملی اور کسی کے پاس وہ مجھے نہیں ملی یعنی: ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ سے براءت کے خاتمہ تک۔ پس یہ صحیفے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس تھے۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ نے ان کو وفات دی پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ان کے پاس رہے اور اس کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا کے پاس۔

❀ جمع روایت سے چند نتائج

اس روایت سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ سب سے اولیٰ اس سے یہ امر نہایت صفائی سے ثابت ہوتا ہے کہ کل کا کل قرآن شریف قراء یعنی ان لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حین حیات اور آپ کے سامنے اسے حفظ کر چکے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو اندیشہ ظاہر کیا وہ یہ تھا کہ اگر قراء سب کے سب مارے جائیں تو قرآن کریم کے بہت سے حصے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر حافظان قرآن کریم کی زندگیاں خطرے میں نہ ہوں تو قرآن شریف کے بھی ضائع ہونے کا کوئی خطرہ نہیں۔ گویا حافظانِ قرآن کے سینوں میں بلا کم و کاست سارا قرآن شریف جمع تھا۔ دوسری بات جو اس روایت سے ثابت ہوتی ہے یہ ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں جو جمع شدہ قرآن شریف کا کام کیا گیا اس کی غرض یہ تھی کہ حافظان قرآن کریم یعنی قراء کے قائمقام ایک اور امر پیدا ہو جائے یعنی قرآن کریم اس صورت میں جمع ہو جائے کہ تمام قراء کے مارے جانے کی صورت میں بھی اس کے کسی حرف یا لفظ کے تلف ہو جانے کا خطرہ باقی نہ رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کس بات کا اندیشہ ظاہر کرتے ہیں؟ صرف یہی کہ جیسے یمامہ کی جنگ میں کئی قراء مارے گئے۔ اگر ایسی ہی خطرناک جنگیں اور پیش آجائیں تو باقی حافظان قرآن کی زندگیاں بھی معرض خطر میں ہیں۔ پس آپ نے اس بات پر زور دیا کہ قرآن کریم حافظوں میں ہی جمع نہ رہے بلکہ ایسی جمع قرآن شریف کی کی جائے جس کو بعض انسانوں کے مارے جانے سے کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرح سے یعنی حافظوں میں تو قرآن کریم سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جمع کر دیا تھا۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ چاہتے تھے کہ تحریر میں بھی قرآن شریف جمع ہو جائے تا قاریوں کے مارے جانے سے قرآن کریم کے کسی لفظ کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ روایت یہ نہیں کہتی کہ قرآن کریم اس

وقت تک جمع نہ ہوا تھا بلکہ بر خلاف اس کے اس کی شہادت کھلے طور پر اس بات کو توثابت کرتی ہے کہ سینوں میں قرآن شریف بالکل محفوظ تھا۔ پر یہ اندیشہ ہوا کہ اگر وہ سینے جن میں یہ پاک کلام محفوظ تھا وہی نہ رہیں یعنی حافظ لوگ سب کے سب جنگوں میں شہید ہو جاویں تو پھر کیا ہو گا۔ اس خطرہ کے سد باب کے لیے تحریر میں اور ایک مجلد کی صورت میں قرآن کریم کا جمع کرنا ضروری سمجھا گیا۔

اس روایت سے یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ حضرت عمر کو قراء کے حافظوں پر اعتبار نہ تھا۔ حافظوں پر تو پورا اعتبار تھا لیکن قراء کی زندگیاں خطرناک لڑائیوں کے پیش آجانے کی وجہ سے معرض خطر میں پڑ گئی تھیں۔

تیسری بات جو اس حدیث سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت تک جب مجلد کی صورت میں جمع قرآن کا کام شروع کیا گیا، قرآن شریف کا کوئی حصہ ضائع نہ ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صاف الفاظ میں یہ فرماتے ہیں کہ میں ڈرتا ہوں کہ اگر باقی قراء بھی لڑائیوں میں شہید ہو جائیں اور دفعتہ کسی جنگ میں سب کا خاتمہ ہو جائے تو قرآن شریف کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اندیشہ صرف آئندہ کے متعلق تھا۔ ان کے کسی لفظ سے یہ نہیں پایا جاتا کہ اس وقت بھی قرآن شریف کا کوئی حصہ یا کوئی لفظ ضائع ہو چکا تھا۔ بلکہ ان کے الفاظ کا جس میں انہوں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ جو قراء یعنی حافظان قرآن کریم اس وقت موجود ہیں ان کے مارے جانے سے قرآن کریم کے کسی حصہ کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ صاف شہادت ملتی ہے کہ اس وقت تک کچھ ضائع نہ ہوا تھا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ سارا قرآن شریف جمع ہو کر قراء یعنی حافظان قرآن کریم کے حافظوں میں پورے طور پر محفوظ تھا۔ اور کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس جمع کے علاوہ جو سینوں میں محفوظ تھا ایک جمع قرآن کریم کی ایسی چاہتے تھے جو کتاب کی صورت میں ہو اور کہ جب تحریری کام شروع کیا گیا تو اس وقت تک حافظوں کے جمع شدہ قرآن شریف میں کوئی حرف یا کوئی لفظ ضائع نہ ہوا تھا۔ یہ تین نہایت ضروری باتیں ہیں جن کو یاد رکھنا چاہیے۔ کیونکہ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو قرآن شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے حافظوں میں جمع کر کے محفوظ کر دیا تھا وہ بلا کسی تغیر و تبدل کے اور بغیر کسی حرف کے بڑھائے جانے یا گھٹائے جانے کے اسی ترتیب کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔

❀ جمع مسودات پر بحث

اب ہم نے یہ دکھانا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ان الفاظ سے: [قُلْتُ لِعُمَرَ: كَيْفَ تَفْعَلُ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ][1] یعنی جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا اس کو تم کیونکر کر سکتے ہو۔ کیا منشا تھا۔ یہ الفاظ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عمر رضی اللہ عنہ کی کسی تجویز کے متعلق تھے۔ پس جو تجویز پیش کی گئی تھی اسی کے متعلق یہ جواب بھی ہونا چاہیے۔ اب ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمر کی تجویز مطلق جمع قرآن کے متعلق نہ تھی بلکہ یہاں تک تو وہ مطمئن تھے کہ قرآن کریم حفاظ اور قراء کے سینوں میں جمع ہے۔ فکر ان کو یہ ہوا تھا کہ اگر حفاظ سب کے سب شہید ہو جاویں تو ایسا نہ ہو کہ قرآن شریف کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے۔ اس لیے انہوں نے قرآن کریم کے ایک مجلد کی صورت میں جمع کرنے کی تجویز پیش کی تھی جو قراء کے نہ ہونے کی صورت میں بھی محفوظ کی محفوظ ہی ہو۔

دوسری طرف یہ امر بھی مسلم ہے کہ اگرچہ مکمل اور جمع شدہ قرآن شریف سورتوں اور آیتوں کی صحیح ترتیب کے ساتھ نہایت محفوظ طور پر حافظان قرآن کریم کے حافظوں میں موجود تھا۔ مگر جو تحریریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے روبرو لکھوائی تھیں جیسا کہ ہر ایک آیت اور ہر ایک سورت کا لکھا جانا ثابت ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سب کی سب ایک جگہ جمع نہ کی گئی تھیں اور نہ ہی ان کو کوئی ترتیب دی گئی تھی۔ اور جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے مہبط وحی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان تحریروں کی جمع اور ترتیب ہو بھی نہ سکتی تھی۔

1- صحيح البخاري: 4679

کیونکہ حافظان قرآن کے لیے تو یہ ایک آسان امر تھا کہ جب کوئی نئی آیت نازل ہوتی اور ان کو بتادیا جاتا کہ اس کو فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد پڑھو تو وہ آسانی سے یہ کر سکتے تھے۔ مگر ایک مکمل مجلد میں بعد میں ایسی آیتیں داخل نہ ہو سکتی تھیں۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ قراء کی زندگیاں دشمنوں کے ہاتھ سے خطرے میں ہیں تو آپ نے نہایت دور اندیشی کے ساتھ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے یہ درخواست کی کہ وہ ان تحریروں کے جمع کرنے کا حکم دیں۔ یہ وہ کام تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود نہیں کرایا تھا۔ اس لیے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پہلے یہی جواب دیا کہ جس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا اس کو تم کیونکر کر سکتے ہو۔ اس جواب سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ وحی الٰہی کے متعلق پرلے درجے کی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ یہ بھی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امر پر حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان خوب بحث ہوئی۔ جیسا کہ [فَلَمْ يَزَلْ عُمَرُ يُرَاجِعُنِيْ] سے ثابت ہے یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھ سے اصرار کرتے رہے۔ اب اس حدیث شریف میں اس بات کا کچھ تذکرہ نہیں کہ کیا سوال تھے اور کیا جواب تھے۔ مگر اخیر نتیجہ اس کا یہ لکھا ہے کہ حضرت عمر کی بات بوجہ اس کے کہ وہ قوی تر وجوہ اور مضبوط تر دلائل پر مبنی تھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تسلیم کر لی تھی۔ بلکہ جب زید رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت ابو بکر کی طرح پہلے یہی جواب دیا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا اس کو تم کیونکر کر سکتے ہو۔ تو انہی دلائل سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے زید رضی اللہ عنہ کو قائل کیا۔ اور آخر انہیں بھی اسی کو تسلیم کرنا پڑا۔

قیاس سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا ہوگا کہ اگر تحریری طور پر قرآن شریف کو جمع کرنے کا منشا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نہ ہوتا تو آپ اس قدر احتیاط کیوں فرماتے کہ جیسے ہی ایک آیت نازل ہوئی اسی وقت کاتبان وحی کو بلوا کر اسے لکھوایا۔ اور پھر یہ بھی بیان کیا ہوگا کہ تحریر میں جمع کرنے سے ہم کوئی نیا کام نہیں کرتے بلکہ جمع تو اصل میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کر چکے ہیں اور تمام و کمال ترتیب کے ساتھ اسے حفاظ کے سینوں میں محفوظ کر چکے ہیں۔ ہم نے صرف اسی جمع کا تتبع کر کے اصل تحریروں کو ایک مجلد کی صورت میں جمع کر دینا ہے۔ یہ چونکہ واقعات حقہ تھے اس لیے حضرت ابو بکر اور زید اور پھر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کو تسلیم کیا۔ غرض یہ نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تجویز مطلق جمع کے متعلق تھی اور نہ ہی حضرت ابو بکر کے جواب کا منشا یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قطعاً قرآن کو جمع ہی نہیں کیا۔ بلکہ یہ تجویز اور جواب دونوں تحریری جمع کے متعلق تھے۔

❀ جمع مسودات کی مشکلات

اسی حدیث میں یہ الفاظ جو زید نے مشکلات کا خیال کر کے کہے کہ اگر مجھے ایک پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل کرنے کے لیے کہا جاتا تو مجھے جمع قرآن کی تجویز کی نسبت زیادہ دشوار نہ معلوم ہوتا۔ ان الفاظ کو بعض کوتاہ اندیش کم فہم معترضین نے محل اعتراض بنایا ہے اور ان سے وہ یہ مطلب نکالنا چاہتے ہیں کہ گویا قرآن شریف اس وقت ایک ایسی پراگندہ صورت میں تھا کہ زید رضی اللہ عنہ اس کے جمع کرنے کو پہاڑ کے اٹھانے کی طرح ناممکن سمجھتے تھے۔ ایسی بین شہادتوں کے ہوتے ہوئے جن سے صفائی سے ثابت ہو رہا ہے کہ صحابہ کی جماعت میں بہت سے حفاظ قرآن کریم کے موجود تھے۔ اور کل قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حین حیات میں جمع ہو چکا تھا۔ ایسی دور از قیاس باتوں کو پیش کرنا حماقت اور تعصب کی انتہائی حد ہے۔ زید کو تو خود اس لیے بھی یہ تجویز دشوار معلوم ہو رہی تھی کہ ان کے ذہن میں ابھی تک یہ بات نہ آئی تھی کہ جب تحریروں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جمع نہیں کیا تو اور کوئی کیونکر کر سکتا ہے۔ چنانچہ ساتھ ہی وہ یہ کہتے ہیں کہ تم اس کام کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا کیونکر کر سکتے ہو۔ لیکن اگر یہ بھی مان لیں کہ انہوں نے جمع قرآن کی مشکلات کو مد نظر رکھ کر یہ الفاظ بولے تو بھی کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس سے یہ قیاس نہیں ہو سکتا کہ اس سے پہلے قرآن شریف مطلقاً جمع ہی نہ ہوا تھا۔ تجویز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تحریروں کو جمع کرنے کی تھی اور یہ واقعی ایک بڑا مشکل اور بھاری کام تھا۔

چنانچہ اس کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کو ابن ابی داؤد نے مصاحف میں بیان کیا ہے:

((قَالَ: قَامَ عُمَرُ فَقَالَ: مَنْ كَانَ تَلَقّٰى مِنْ رَّسُوْلِ اللهِ ﷺ شَيْئًا مِنَ الْقُرْاٰنِ فَلْيَأْتِ بِهِ وَكَانُوْا يَكْتُبُوْنَ ذٰلِكَ فِي الصُّحُفِ وَالْاَلْوَاحِ وَالْعَسَبِ قَالَ: وَكَانَ لَا يَقْبَلُ مِنْ اَحَدٍ شَيْئًا حَتّٰى يَشْهَدَ شَاهِدَانِ.))[1]

راوی کہتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عام اعلان کیا کہ ''جس کو قرآن شریف کا کوئی ٹکڑا رسول اللہ ﷺ سے براہ راست پہنچا ہو وہ اسے لے آئے۔'' اور وہ یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن شریف کاغذوں اور تختیوں اور کھجور کی شاخوں پر لکھ لیا کرتے تھے۔ پھر وہ راوی کہتا ہے کہ کسی سے کوئی چیز (یعنی لکھا ہوا قرآن کا ٹکڑا) قبول نہ کیا جاتا جب تک کہ دو گواہ گواہی نہ دیتے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے اور یہی شہادت حدیث زیر بحث سے بھی ملتی ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں جمع قرآن کا منشا ان اصل تحریروں کو اکٹھا کرنے کا تھا جو آنحضرت ﷺ کے وقت میں لکھی گئی تھیں۔ پس یہی وہ مشکل تھی جس کو مد نظر رکھ کر زید نے اس کام کو اس قدر دشوار سمجھا۔ قرآن کریم کا بہت سا حصہ مکہ میں نازل ہو چکا تھا اور جو مدینہ میں نازل ہوا تھا وہ بھی سارا زید رضی اللہ عنہ کے قبضہ میں نہ تھا۔ کیونکہ زید کی غیر حاضری میں بعض وقت اور کاتب بھی لکھنے کے لیے بلائے جاتے تھے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اس لیے منتخب کیا گیا کہ مدینہ میں جس قدر قرآن کریم نازل ہوا تھا اس کا اکثر حصہ زید نے ہی لکھا تھا۔ اور غالباً وہ سب مسودات انہی کے قبضہ میں تھے۔ مگر اس کام کو انجام دینا واقعی بڑا دشوار امر تھا۔ تمام اصلی تحریروں کو جس جس کے قبضہ میں وہ تھیں وہاں سے تلاش کرنا تھا۔ اور پھر ان کو اس ترتیب کے ساتھ جو حافظان قرآن کے سینوں میں محفوظ تھی ترتیب دینا تھا۔ ہاں اس قدر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ایسی تحریروں میں سے ضائع کچھ نہ ہوا تھا۔ بلکہ جس کسی کے پاس تھیں نہایت حفاظت سے رکھی ہوئی تھیں۔ کیونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کے متعلق صحابہ رضی اللہ عنہم نہایت احتیاط سے کام لیتے تھے اور یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ان تحریروں کو ضائع کر دیتے جن کو وہ اپنی جانوں سے بھی عزیز تر سمجھتے تھے۔ بہر حال یہ ایک مشکل کام تھا اور ان تمام مشکلات کے پورے پورے احساس نے ہی زید رضی اللہ عنہ کے منہ سے یہ الفاظ نکلوائے کہ یہ کام ان کو ایک پہاڑ نظر آیا۔

❀ جمع ابو بکر رضی اللہ عنہ میں اصلی مسودات کو جمع کیا گیا

اور بھی کئی باتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زید رضی اللہ عنہ کے سپرد جو کام کیا گیا وہ ان اصلی تحریروں کو اکٹھا کرنا تھا جو آنحضرت ﷺ کے سامنے لکھی گئی تھیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کا یہ منشا نہیں تھا کہ جس طرح حافظ لوگ قرآن شریف کو پڑھتے ہیں۔ اس کے مطابق ایک نسخہ لکھوالیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پہلے یہ لفظ تھے جو زید کو فرمائے کہ قرآن کو تلاش کرو اور اکٹھا کرو۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ تلاش کرنے سے منشا تحریروں کو تلاش کرنا ہی ہو سکتا ہے۔ اگر منشا صرف اس قدر ہوتا کہ حافظوں کو جمع کر کے جس طرح وہ قرآن شریف پڑھیں اسی کے مطابق ایک نسخہ لکھ لیا جائے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تلاش کرنے کا حکم نہ دیتے۔ کیونکہ یہ ثابت شدہ امر ہے کہ اس وقت تک سارا قرآن شریف حافظوں کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اور کوئی حصہ اس کا ضائع نہ ہوا تھا۔ نہ ہی زید رضی اللہ عنہ اس صورت میں کام کو اس قدر مشکل سمجھ سکتے تھے کہ وہ ان مشکلات کو ایک پہاڑ کے ساتھ تشبیہ دیتے۔ ایسی صورت میں یہ کافی تھا کہ چند حافظوں کو جمع کر لیا جاتا اور جس طرح وہ لکھواتے جاتے اسی طرح حضرت زید رضی اللہ عنہ لکھتے جاتے۔ اور اس طرح صحت کا پورا اہتمام ہو سکتا تھا۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مدعا اصل تحریروں کو جمع کرنا تھا جو آنحضرت ﷺ کی ہدایت سے لکھی گئی تھیں۔ تاکہ اس طرح نہ صرف طرز

1- فتح الباری: 14/9؛ کتاب المصاحف لابن أبي داود: 113-(62/1)

تحریر ہی محفوظ ہو کر آئندہ نسلوں تک پہنچ جائے بلکہ اصل کی تصدیق بھی دوسرے طور پر ہو جائے۔ اور حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زید نے اسی کے مطابق کارروائی شروع کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منشا کو پورا کیا۔ کیونکہ جب ان کو معلوم ہو گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ حق پر ہیں تو پھر وہ اپنی کارروائی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ پھر میں نے قرآن کو تلاش کرنا شروع کیا میں اس کو جمع کرتا تھا کھجور کی ٹہنیوں اور پتھر کی تختیوں سے اور آدمیوں کے سینوں سے۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید دو کام کرتے تھے۔ اول وہ قرآن شریف کو تلاش کرتے تھے اور پھر اس کو جمع کرتے تھے۔

اب جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے جمع کے مفہوم میں ترتیب ضروری پڑی ہوئی ہے۔ مگر یہ ترتیب صرف ان تحریروں سے نہ ہو سکتی تھی جو متفرق طور پر کچھ کسی اور کچھ کسی کے قبضہ میں تھیں۔ لہٰذا ترتیب کے لیے اور جمع نبوی کی پیروی کرنے کے لیے ضروری ہوا کہ جب تحریر مل جائے تو پھر اس کو ترتیب دینے کے لیے قراء یعنی حافظان قرآن کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہی مراد حضرت زید رضی اللہ عنہ کی [صُدُوْرُ الرِّجَالِ] سے حدیث مذکور میں ہے کیونکہ بغیر اس جمع کی پیروی کے جو سینوں میں محفوظ ہو چکی تھی حضرت زید تحریری جمع کے کام کو پورا نہ کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ زور دیا تھا کہ تحریری جمع کے کام کو جلد شروع کیا جائے۔ جب کہ ابھی بہت سے حافظان قرآن کریم زندہ تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے [صُدُوْرُ الرِّجَالِ] کی طرف رجوع کیا۔

حدیث کے الفاظ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے بعض سورتوں کو تو قراء سے لے لیا اور بعض کے لیے تحریریں تلاش کیں۔ کیونکہ اگر حافظوں سے ہی قرآن کا اکٹھا کرنا ان کا منشا ہوتا تو تحریروں کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔ جب انہوں نے بعض سورتوں کو قراء پر اعتبار کر کے [صُدُوْرُ الرِّجَالِ] سے لے لیا تھا تو باقی سورتوں کے لیے تحریریں تلاش کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔ اور اگر تحریروں کی تلاش کی ضرورت تھی تو پھر سب حصوں کے لیے یکساں تھی۔ اگر حافظہ پر ہی زید رضی اللہ عنہ نے انحصار کرنا ہوتا تو کیا یہ کافی نہ تھا کہ چند قراء جمع کر کے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیان سے پایا جاتا ہے ابھی بہت سے زندہ موجود تھے اور قرآن کریم پوری طرح سے ان کے سینوں میں محفوظ تھا۔ جس طرح وہ پڑھ کر سناتے جاتے اسی طرح وہ لکھتے جاتے۔ تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

❀ جمع مسودات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جمع کی پیروی کی گئی

اس جمع کے متعلق جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے ہوئی اہم ترین سوال یہ ہے کہ آیا یہ صحیفے اس جمع شدہ قرآن کریم کے ساتھ جیسا کہ وہ حافظوں اور قراء کے سینوں میں محفوظ تھا اور جس طرح کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں پڑھا جاتا تھا، بعینہٖ مطابق تھے۔ یعنی آیا ان میں کسی قسم کی کمی یا بیشی یا ترتیب مضامین میں خلل تو نہیں ہوا تھا؟ بہت سے ایسے وجوہ ہیں جن پر غور کرنے سے یہ یقین کامل ہو جاتا ہے کہ اس مجموعے میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا تھا اور نہ کوئی کمی بیشی ہوئی تھی۔

اول: جو لوگ اس کام کی تکمیل چاہتے تھے ان میں سے کسی کی غرض یہ نہ تھی کہ کسی قسم کا تغیر تبدل ہو۔ بلکہ وہ دل و جان سے اور پوری ہمت و مستعدی سے اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح قرآن شریف کمال حفاظت کے ساتھ آئندہ نسلوں تک پہنچایا جائے۔ بلکہ ان کے ایمان کبھی گوارا نہ کر سکتے تھے کہ کسی قسم کا نقص قرآن کریم کی حفاظت میں واقع ہو۔

دوم: یہ جمع کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے صرف چھ ماہ بعد شروع ہو گیا تھا۔ اور ابھی قریباً سب کے سب وہ صحابہ زندہ موجود تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ سے قرآن شریف سنا اور حفظ کیا تھا۔ علاوہ حافظوں اور قراء کے دوسرے لوگ بھی جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن کو سنا تھا اس قابل تھے کہ اگر کسی قسم کی کمی بیشی یا تغیر اس کلام پاک میں ہو تو وہ فوراً اس کو سمجھ جائیں۔ پس ممکن نہ تھا کہ کوئی کمی بیشی یا تغیر ہوتا اور یہ بات خاموشی میں دب جاتی۔

سوم: ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حدیث کے نقل کرنے میں پرلے درجے کی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ پس ممکن نہ تھا کہ وہ وحی الٰہی میں کوئی کمی بیشی یا تغیر کرنے کی جرأت کرتے۔ جس قدر عظمت ان کے دلوں میں کلام الٰہی کی تھی اس کے ساتھ افترا کا جمع ہونا یا عمداً کسی حصہ کو چھوڑ دینا ناممکن تھا۔

چہارم: بہت سے ان میں ایسے تھے جو سارا قرآن شریف حفظ رکھتے تھے اور ایک گروہ کثیر ایسا تھا جن کو بڑا حصہ قرآن شریف کا یاد تھا۔ کسی کو کوئی حصہ اور کسی کو کوئی حصہ۔ اور جو کچھ کسی کو یاد تھا اس کی برابر تلاوت میں لگے رہتے تھے۔ نمازوں میں بھی اور نمازوں سے باہر بھی۔ ایسے آدمیوں کی موجودگی میں یہ ناممکن تھا کہ کوئی کمی بیشی یا تغیر واقع ہو سکتا۔

پنجم: صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان قرآن کریم کے اجزا کے بہت سے نسخے مروج تھے اور یہ نسخے ابتدائے زمانہ سے ہی مروج تھے۔ ہر ایک آیت یا حصہ جب نازل ہوتا تو پہلے ایک تحریر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے لکھی جاتی۔ پھر اسی سے صحابہ اپنے اپنے طور پر لکھ یا لکھوا لیتے۔ اب یہ نسخے متفرق طور پر کوئی کسی صحابی کے پاس اور کوئی کسی صحابی کے پاس موجود تھے اور اس مجموعہ کی صحت کو پرکھنے کے لیے جو زید رضی اللہ عنہ نے تیار کیا تھا کافی تعداد دوسری تحریروں کی موجود تھی۔ ایسا ہی جو نسخہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کے پاس تھا اس کا مقابلہ دوسرے سے ہو سکتا تھا۔ اور اس طرح پر زید رضی اللہ عنہ کے مجموعہ میں کسی غلطی کے داخل ہونے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ ایک طرف حافظہ کی زبردست شہادت اور دوسری طرف تحریر کی مضبوط گواہی ان دونوں میں سے ہر ایک بجائے خود ہی بڑی بھاری گواہی تصدیق صحت کے لیے کافی تھی۔ مگر دونوں نے مل کر وہ کام کیا جس کی نظیر دنیا کی کسی دوسری کتاب میں نہیں پائی جاتی۔

ششم: کسی روایت یا حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں جو جمع قرآن ہوا اس میں کچھ نقص تھا۔ یعنی کوئی حصہ داخل ہونے سے رہ گیا تھا یا کوئی ایسا حصہ داخل ہو گیا تھا جو کلام الٰہی نہ سمجھا جاتا تھا۔

خود میور کو اس بات کا اقرار ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"کوئی جزو کوئی فقرہ یا کوئی لفظ ایسا نہیں سنا گیا جو جمع کرنے والوں نے چھوڑ دیا ہو۔ نہ ہی کوئی ایسا پایا جاتا ہے جو اس مسلم مجموعہ سے اختلاف رکھتا ہو۔ اگر ایسے اجزاء یا فقرے یا الفاظ ہوتے تو ضروری تھا کہ ان کا تذکرہ ان احادیث میں پایا جاتا جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال اور افعال کی نسبت چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی محفوظ رکھی گئی ہیں۔"

❀ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے مجموعہِ صحفِ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی پیروی کی

پس اس بات کے یقین کرنے کے لیے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے جو مجموعہ صحف تیار ہوا تھا وہ کیا بلحاظ ترتیب اور کیا بلحاظ عبارت کے اس مجموعہ سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی ہدایت سے تیار ہو کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے سینوں میں محفوظ ہو چکا تھا پوری پوری مطابقت رکھتا تھا؟ یقیناً اور اس کی قوی ترین وجوہات موجود ہیں۔ اگر ایسی مطابقت نہ ہوتی تو صحابہ کبھی اس مجموعہ کو جو زید رضی اللہ عنہ نے تیار کیا تھا قبول نہ کرتے۔ یہ مجموعہ بعد تکمیل حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس رہا اور آپ کی وفات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہا۔ پھر آپ کی وفات کے بعد ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت میں انہیں کے پاس موجود تھا۔ اس طرح پر یہ مجموعہ بغیر کسی تغیر و تبدل کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت تک پہنچ گیا۔ یہ بھی اغلب ہے کہ اس نسخہ سے دوسروں لوگوں نے اپنے اپنے لیے نسخے لکھ لیے ہوں اور اس طرح پر اس کی کافی اشاعت بھی ہو گئی۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بعض امور ایسے پیدا ہوئے کہ امیر المومنین نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ بڑی احتیاط اور حفاظت کے ساتھ اپنے اہتمام میں چند نسخے اسی اصل مجموعہ سے لکھوا کر شائع کیے جائیں اور ان نسخوں کی اشاعت کو جو اب تک بطور خود لوگوں نے لکھ رکھے تھے روک دیا جائے۔ چنانچہ وہ روایت جس میں ان واقعات کا تذکرہ ہے صحیح بخاری میں درج ہے اور حسب ذیل ہے:

((عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ حَدَّثَهُ أَنَّ حُذَيْفَةَ بْنَ الْيَمَانِ قَدِمَ عَلَىٰ عُثْمَانَ وَكَانَ يُغَازِي أَهْلَ الشَّأْمِ فِي فَتْحِ إِرْمِينِيَةَ وَأَذْرَبِيجَانَ مَعَ أَهْلِ الْعِرَاقِ، فَأَفْزَعَ حُذَيْفَةَ اخْتِلاَفُهُمْ فِي الْقِرَاءَةِ فَقَالَ حُذَيْفَةُ لِعُثْمَانَ: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! أَدْرِكْ هٰذِهِ الأُمَّةَ قَبْلَ أَنْ يَخْتَلِفُوا فِي الْكِتَابِ اخْتِلاَفَ الْيَهُودِ وَالنَّصَارَىٰ، فَأَرْسَلَ عُثْمَانُ إِلَىٰ حَفْصَةَ أَنْ أَرْسِلِي إِلَيْنَا بِالصُّحُفِ نَنْسَخُهَا فِي الْمَصَاحِفِ ثُمَّ نَرُدُّهَا إِلَيْكِ، فَأَرْسَلَتْ بِهَا حَفْصَةُ إِلَىٰ عُثْمَانَ فَأَمَرَ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ وَعَبْدَ اللهِ بْنَ الزُّبَيْرِ وَسَعِيدَ بْنَ الْعَاصِ وَعَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ الْحَارِثِ ابْنِ هِشَامٍ، فَنَسَخُوهَا فِي الْمَصَاحِفِ. وَقَالَ عُثْمَانُ لِلرَّهْطِ الْقُرَشِيِّينَ الثَّلاَثَةِ: إِذَا اخْتَلَفْتُمْ أَنْتُمْ وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ فِي شَيْءٍ مِنَ الْقُرْآنِ فَاكْتُبُوهُ بِلِسَانِ قُرَيْشٍ فَإِنَّمَا نَزَلَ بِلِسَانِهِمْ، فَفَعَلُوا حَتَّى إِذَا نَسَخُوا الصُّحُفَ فِي الْمَصَاحِفِ، رَدَّ عُثْمَانُ الصُّحُفَ إِلَىٰ حَفْصَةَ وَأَرْسَلَ إِلَىٰ كُلِّ أُفُقٍ بِمُصْحَفٍ مِمَّا نَسَخُوا وَأَمَرَ بِمَا سِوَاهُ مِنَ الْقُرْآنِ فِي كُلِّ صَحِيفَةٍ أَوْ مُصْحَفٍ أَنْ يُحْرَقَ.))[1]

انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان دنوں وہ فتح آرمینیا میں اہل شام کے ساتھ تھے اور آذربیجان میں اہل عراق کے ساتھ جنگ کرتے تھے۔ وہاں ان لوگوں کی قراءت نے حذیفہ کو گھبرا دیا۔ پس وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا اے امیر المومنین اس امت کی خبر لو۔ قبل اس کے کہ وہ کتاب میں ایسا اختلاف کرنے لگیں جیسا کہ یہود اور نصاری کرتے ہیں۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس آدمی بھیجا کہ صحیفے (یعنی مجموعہ قرآن جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں تیار ہوا تھا) ہمارے پاس بھیج دو۔ ہم اس کی نقلیں مصحفوں میں کر لیں گے اور پھر اصل صحیفے آپ کو واپس بھیج دیں گے۔ حفصہ رضی اللہ عنہا نے ان صحیفوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا اور حضرت عثمان نے زید بن ثابت اور عبداللہ بن زبیر اور سعید بن العاص اور عبدالرحمن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا۔ پس ان لوگوں نے ان صحیفوں کو مصاحف میں نقل کیا اور حضرت عثمان نے قریشی جماعت کو یہ بھی ہدایت فرمائی کہ جب تم اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (جو مدنی تھے) کسی امر میں اختلاف کرو تو اس کو قریش کی زبان میں لکھ لو۔ کیونکہ قرآن کریم انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ پس انہوں نے آپ کے احکام کی تعمیل کی اور جب صحیفوں کو مصاحف میں نقل کر چکے تو عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ صحیفے حفصہ رضی اللہ عنہا کو واپس بھیج دیئے۔ اور ہر ایک طرف میں ایک مصحف ان میں جو لکھے گئے بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کے سوا جس صحیفہ یا مصحف میں قرآن لکھا ہوا ہو اس کو جلا دیا جائے"۔

❀ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کو کیا ضرورت پیش آئی

اس حدیث سے ان حالات کا اندازہ لگ سکتا ہے جنہوں نے حضرت عثمان کو اس حکم دینے پر مجبور کیا کہ تمام اوراق جن پر بطور خود بعض لوگوں نے قرآن شریف کل یا اس کا کوئی جزو لکھ لیا تھا جلا دیئے جائیں اور آئندہ کے لیے ان صحیفوں سے نقلیں لی جائیں۔ جو خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت کے مجموعہ سے نقل کرائے تھے۔ حضرت عثمان کی افواج کا ایک جرنیل جو آرمینیا اور آذربائیجان میں جنگ کر رہی تھیں آپ کے پاس آیا اور یہ بیان کیا کہ لوگوں میں اختلاف قراءت ہو رہا ہے۔ یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اختلافات کا ہونا ملک شام اور آرمینیا وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور ایسے مقامات پر جیسے مکہ اور مدینہ یا عرب کے اندر ایسے اختلافوں کی کوئی شکایت نہیں کی گئی۔ اب شام اور آرمینیا نئے نئے فتح شدہ ملک تھے اور ان ملکوں کے لوگ جن کی زبان عربی نہ تھی نئے نئے اسلام

1- صحيح البخاري: 3506، 4984، 4987؛ جامع الترمذي: 3103، 3104

میں داخل ہوئے تھے۔ یہ اختلافات کس قسم کے تھے خود حذیفہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف قراءت یعنی پڑھنے کی طرز میں اختلافات تھے۔ پھر یہ بھی ان اختلافات کی نسبت بتایا گیا کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے سے اختلافات نہ تھے۔ ہاں یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا کہ اگر بروقت خبر نہ لی گئی تو یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے یہود اور نصاریٰ کے سے نہ ہو جائیں۔ کیونکہ اگر رفع اختلاف نہ کیا جائے تو ضرور ہے کہ مرور زمانہ سے وہ اختلاف کچھ کا کچھ رنگ پکڑ لے۔

واقعی کن کن الفاظ میں اور کیا کیا فرق تھا۔ اس کا جواب دینا ایک مشکل امر ہے مگر بعض دوسری روایات اور احادیث پر غور کرنے سے ان اختلافات کا کچھ پتہ لگتا ہے۔ احادیث میں یہ ذکر موجود ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بعض الفاظ کو لغت قریش کے سوا دوسری لغتوں میں ادا کرنے کی اجازت دی تھی۔ اور اس وقت بھی بعض لوگوں کو جن کو اس اجازت کی خبر نہ تھی ایسے لوگوں کو دیکھ کر اور سن کر جو کسی لفظ کو دوسری لغت میں ادا کرتے تھے ابتلا پیش آیا تھا۔ چنانچہ ایک موقعہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ہشام کو پڑھتے سن کر ان کی گردن میں چادر ڈال کر آنحضرت ﷺ کے روبرو لے گئے کہ یہ غلط پڑھتا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ نے ہشام کے پڑھنے کو صحیح قرار دیا۔

اس اجازت کی اصل وجہ یہ تھی کہ جب کثرت سے عرب اسلام میں داخل ہوئے تو ان میں بعض اقوام ایسی تھیں جن کی بولی اگرچہ عربی تھی مگر خالص محاورہ قریش کے بولنے پر قادر نہ تھے۔ اور ابتدا سے ہی ان کو بعض الفاظ کے خاص طریقوں پر ادا کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اجازت دی گئی کہ وہ لوگ جن حروف کو زبان قریش میں ادا نہیں کر سکتے انہیں اپنے محاورہ میں ہی اور اپنی طرز پر ادا کر لیں۔ یہ امر ظاہر ہے کہ مختلف حروف میں بعض الفاظ کو ادا کرنے کی اجازت ایک ضرورت پر مبنی تھی۔ اور اس اجازت سے وہ لوگ فائدہ اٹھا سکے تھے جو بچپن سے بعض الفاظ کو خاص طور پر ادا کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اور محاورہ قریش میں جس میں قرآن شریف نازل ہوا تھا ان کو ادا نہ کر سکتے تھے۔ مگر اب جبکہ اسلام کثرت سے عرب کے باہر پھیل گیا تو یہ ضرورت بھی ایک حد تک مفقود ہو گئی۔ کیونکہ جن لوگوں نے عربی زبان کو سیکھا تھا اور عربی ان کی اپنی مادری زبان نہ تھی ان کے لیے یہ برابر تھا کہ ایک لفظ کو محاورہ قریش میں ادا کریں یا کسی دوسری قوم کے محاورہ میں۔ مگر بعض صحابہ جو ایسے مرکزوں میں قرآن کی تعلیم دیتے تھے وہ اب تک قرآن شریف کو بعض دوسرے حروف پر پڑھاتے تھے۔ اور محاورہ قریش میں ان کو ادا نہ کرتے تھے۔ یہ بھی قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نے عمداً اور بلاوجہ بھی بعض قراءتوں کو اختیار کر لیا تھا اور انہی کے مطابق نو مسلموں کو بھی تعلیم دیتے تھے۔ کوفہ میں خصوصیت سے اس بات کا ہونا پایا جاتا ہے اور اس جگہ کے اختلافات کو دیکھ کر حذیفہ رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تھے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حذیفہ نے ان لوگوں کو ملامت کی جو اس قسم کی تفرقہ اندازی کرتے تھے۔ بعض کہتے تھے کہ ہم ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت پڑھتے ہیں۔ بعض کہتے تھے ہم ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت پڑھتے ہیں۔ کوئی کہتا تھا میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے۔ بلکہ یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ بعض بعض کی انہی باتوں کی وجہ سے تکفیر کرنے لگے۔ کیونکہ وہ لوگ اسلام میں حدیث العہد ہونے کی وجہ سے اصلیت سے ناواقف تھے۔ حالانکہ اگر پڑھانے والے احتیاط کرتے تو یہ سب لوگ اصل محاورہ قریش پر آسانی سے پڑھ سکتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقت کا ایک واقعہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس خبر پہنچی کہ ابن مسعود [حَتّٰی حِیْن] کی بجائے [عَتّٰی حِیْن] پڑھاتے ہیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نام حکم نامہ جاری کیا کہ قرآن شریف کا اصل نزول بلسان قریش میں ہی ہے۔ پس آپ ہذیل کی لغت میں لوگوں کو قرآن نہ پڑھائیے۔ کیونکہ ہذیل حتی کی بجائے عتی بولتے تھے۔ جیسا کہ کسی عربی لغت کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اب اگرچہ حتی حین کو عتی حین پڑھنے کی اجازت آنحضرت ﷺ نے محاورہ ہذیل کے سبب دی۔ مگر ان نو مسلموں کو ہذیل کی لغت پر قائم کرنا بلا ضرورت اختلافات ڈالنا تھا۔ اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو منع کیا۔ (دیکھو فتح الباری جلد 9 صفحہ 24)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے درج پیغام سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو لکھا:

((وَمِنْ ثُمَّ اَنْكَرَ عُمَرُ عَلَىٰ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قِرَائَةَ "عَتَّى حِيْنٍ" وَكَتَبَ اِلَيْهِ اِنَّ الْقُرْاٰنَ لَمْ يَنْزِلْ بِلُغَةِ هُذَيْلٍ فَاقْرَئِ النَّاسَ بِلُغَةِ قُرَيْشٍ وَلَا تُقْرِئْهُمْ بِلُغَةِ هُذَيْلٍ.))[1]

پس ایک تو یہ بلا ضرورت اختلاف قراءت کو پھیلانا اور پھر دوسری طرف ان نو مسلموں کا ناواقفیت کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑنا جس سے فتنہ و فساد پھیلتا ہے۔ ایسے امور تھے جنہوں نے حذیفہ اور عثمان رضی اللہ عنہم کے دلوں میں خطرہ پیدا کیا۔ اس کا علاج سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ کہ مختلف حروف کو جن میں قرآن شریف کے پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی تحریر میں نہ لایا جائے بلکہ ایسے تمام نسخوں کو محو کر کے ایسے نسخے مناسب احتیاط سے لکھوا کر شائع کیے جائیں جو قریش کے محاورہ کے مطابق لکھے گئے تھے۔ کیونکہ یہی وہ محاورہ تھا جس میں قرآن کریم نازل ہوا اور دوسرے حروف میں پڑھنے کی اجازت بعد میں اور خاص ضرورتوں کے لیے دی گئی تھی۔ پس جب وہ ضرورتیں نہ رہیں تو اس اجازت کی بھی ضرورت نہ رہی۔

❀ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کو مطابق محاورہ قریش لکھوایا

اب جب ہمیں ان اختلافوں کی جن کو دیکھ کر حذیفہ کو خطرہ پیدا ہوا تھا اور جن کی اصلاح عثمان رضی اللہ عنہ کے مد نظر تھی کچھ حقیقت معلوم ہو گئی۔ تو اب یہ دیکھنا چاہیے کہ حضرت عثمان اس موقعہ پر قرآن شریف کے نقل کرنے میں کیا کیا خاص ہدایات دی تھیں۔ جہاں تک ان کا تذکرہ روایات میں ہے وہ یہ لفظ ہیں کہ

((إِذَا اخْتَلَفْتُمْ أَنْتُمْ وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ فِي شَيْءٍ مِنَ الْقُرْآنِ فَاكْتُبُوهُ بِلِسَانِ قُرَيْشٍ فَإِنَّمَا نَزَلَ بِلِسَانِهِمْ.))[2]

''جب تمہارا اور زید بن ثابت کا کچھ اختلاف ہو تو قریش کی زبان میں لکھو۔ کیونکہ قرآن شریف قریش کی زبان میں ہی نازل ہوا ہے۔''

اور یہ بھی ساتھ ہی لکھا ہے [فَفَعَلُوْا ذٰلِكَ] یعنی انہوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے آگے قدم نہیں رکھا جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رکھا تھا۔ کیونکہ جیسا انہوں نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا کہ ہذیل کے محاورہ پر قرآن شریف لوگوں کو مت پڑھاؤ۔ بلکہ قریش کی زبان میں پڑھاؤ۔ کیونکہ قریش کی زبان میں ہی نازل ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اختلاف کے وقت لسان قریش کو ہی اختیار کیا۔ صرف فرق اتنا تھا کہ حضرت عثمان کے وقت میں نئے مسلمانوں کی بہت کثرت کے سبب سے اختلافات احرف یا قراءت بھی بڑھ گئے بلکہ ان سے بعض برائیاں پیدا ہونے لگیں اس لیے حضرت عثمان نے ان برائیوں کو سرے سے ہی اڑا دیا۔ ایک اور روایت میں جو وہ بھی بخاری کی ہے روایت منقولہ [فی شَيْءٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ] کی بجائے الفاظ [فِي عَرَبِيَّةٍ مِنْ عَرَبِيَّةِ الْقُرْآنِ] وارد ہوئے ہیں جن سے ہماری بات کی تائید ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ اختلافات احرف محاورہ کے ہی اختلافات تھے کہ ایک شخص ایک لفظ کو ایک طرح پر بولتا یا لکھتا تھا اور دوسرا دوسری طرح پر۔

اب حضرت زید رضی اللہ عنہ جنہوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں قرآن شریف کو جمع کیا تھا اور جو اب بھی نسخے لکھنے پر متعین تھے قریشی نہ تھے۔ مگر ان کے ساتھ تین اور قریشی اصحاب بھی تھے۔ اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے احتیاطاً یہ ہدایت کی کہ بصورت اختلاف لسان قریش کے مطابق لکھیں۔ اس اختلاف کی ایک مثال روایات سے معلوم ہوتی ہے جس کو ترمذی نے اس روایت کے ساتھ جو بخاری

1- فتح الباری: 27/9

2- صحيح البخاري: 3506، 4984، 4987؛ جامع الترمذي: 3103، 3104

سے ہم نے اوپر نقل کی ہے ابن شہاب کی سند سے بیان کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے:

((فَاخْتَلَفُوا يَوْمَئِذٍ فِي التَّابُوتِ وَالتَّابُوهِ، فَقَالَ الْقُرَشِيُّونَ: التَّابُوتُ، وَقَالَ زَيْدٌ: التَّابُوهُ، فَرُفِعَ اخْتِلَافُهُمْ إِلَى عُثْمَانَ فَقَالَ: "اكْتُبُوهُ التَّابُوتُ فَإِنَّهُ نَزَلَ بِلِسَانِ قُرَيْشٍ".))[1]

اس موقعہ پر زید اور قریشیوں کا اختلاف لفظ تابوت اور تابوہ کے متعلق ہوا۔ قریش کہتے تھے کہ اس لفظ کو تابوت لکھنا چاہیے اور زید کہتے تھے کہ تابوہ لکھنا چاہیے۔ یہ ان کا اختلاف بالآخر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''تابوت لکھو کیونکہ قرآن شریف زبان قریش میں ہی نازل ہوا ہے۔''

اس واقعہ سے نہ صرف یہی پتہ لگتا ہے کہ زید اور قریش میں اختلاف کی کیا حقیقت تھی بلکہ اس سے ان اختلافات کا اندازہ بھی لگتا ہے جن کا ذکر حذیفہ نے کیا تھا۔ جن اختلافوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دور کرنا چاہتے تھے وہ زیادہ تر اسی قسم کے اختلاف تھے۔ یہ اختلاف ایک ضرورت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے جائز ہو گئے تھے مگر اب غیر عربی اقوام کے کثرت سے اسلام میں داخل ہونے سے یہ ضرورت باقی نہ رہی تھی اور اس لیے حضرت عثمان نے یہ ضروری سمجھا کہ ان کو دور کر دیا جائے اور جیسا کہ ہم آگے چل کر سبعۂ احرف کی بحث میں دکھائیں گے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی کبھی یہ اجازت نہ ہوئی تھی کہ ان اختلاف احرف کو تحریر میں لایا جائے یا قرآن شریف کے اندر لکھا جائے۔ اسی قسم کے اختلافات کو دور کرنے کی غرض سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ حکم صادر فرمایا کہ تمام نسخے جو لوگوں نے بطور خود لکھ لیے ہیں اور اس لیے ان میں کافی احتیاط نہیں ہوئی محو کر دیئے جائیں۔ چنانچہ ایک روایت میں ان کے یہ الفاظ آئے ہیں [مَحَوْتُ مَا عِنْدِيْ فَامْحُوْا مَا عِنْدَكُمْ] ''جو میرے پاس تھا میں نے محو کر دیا ہے پس جو تمہارے پاس ہے تم اسے محو کر دو''۔

❀ صحائفِ عثمانی صحفِ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی محض نقل تھے

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عثمان نے جو نسخے اس قدر احتیاط سے صحف ابی بکر رضی اللہ عنہ سے نقل کرائے ان میں اور اس اصل میں کوئی فرق تھا؟ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت ابو بکر والے صحف میں بغیر کسی تغیر و تبدل اور بغیر ادنی سے ادنی کمی زیادتی کے وہی قرآن شریف تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سامنے صحابہ کو حفظ اور جمع کرایا تھا۔ پس اب اگر یہ بھی ثابت ہو جائے کہ عثمانی صحیفے بعینہٖ صحف ابی بکر کی نقل تھے تو ہمارا مدعا ثابت ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک قرآن شریف میں نہ کسی قسم کا تغیر و تبدل ہوا نہ کوئی کمی زیادتی ہوئی نہ اس کی ترتیب میں کچھ ادل بدل ہوا۔ بلکہ تمام و کمال حفاظت کے ساتھ وہی قرآن کریم ہمارے ہاتھوں تک پہنچا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو پڑھایا اور حفظ کرایا تھا۔ اور جو آپ کے روبرو لکھ لیا گیا تھا۔ اس سوال کو حل کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ حذیفہ کے بیان پر سب سے پہلی تجویز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اختلافات دور کرنے کی کیا سوجھی۔ وہ تجویز یہی تھی کہ آپ نے معاًام المومنین حفصہ کے پاس آدمی بھیجا کہ صحف ابی بکر ہمارے پاس بھیج دو۔ ہم ان سے نقلیں اتروا کر واپس بھیج دیں گے۔

ایک غور کرنے والی طبیعت اس سے فی الفور سمجھ سکتی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کیا کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جو ارادہ ظاہر فرمایا وہ صرف یہی تھا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ والے صحف کی نقلیں کرا کر مختلف اطراف میں بھیج دی جائیں۔ اب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں جمع کا اہتمام حضرت زید کے سپرد ہی تھا۔ اور اب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زید رضی اللہ عنہ کے سپرد ہی یہ کام کیا۔ جس سے اور بھی وضاحت سے ان

1- صحيح البخاري: 3506، 4984، 4987؛ جامع الترمذي: 3103، 3104

کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحف ابی بکر رضی اللہ عنہ سے کسی قسم کا اختلاف نہ کرنا چاہتے تھے۔ ہاں اس موقعہ پر انہوں نے یہ کیا کہ زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ تین قریشی اور لگا دیئے۔ بلکہ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بارہ آدمی اس کام پر متعین کیے گئے تھے اور ہدایت فرمائی کہ جب زید اور قریشیوں میں اختلاف کسی لفظ کی طرز تحریر کے متعلق ہو تو قریشیوں کے محاورہ میں وہ لفظ لکھا جائے کیونکہ قرآن شریف لسان قریش میں ہی نازل ہوا تھا۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ زید اور قریشیوں میں واقعی اختلافات ہوئے بھی تھے۔ بلکہ یہ ایک احتیاط تھی اگر کوئی اختلاف بھی ہوا تو وہ ایک لفظ سے زیادہ کا اختلاف نہ تھا۔ جیسا کہ ترمذی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر صرف ایک ہی اختلاف لفظ تابوت کے لکھنے کے متعلق ہوا۔ اس کے سوائے اور کسی اختلاف کا جو زید اور قریشیوں کے درمیان ہوا ہو کوئی تذکرہ کسی روایت میں نہیں پایا جاتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو صحف حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں زید نے جمع کیے تھے اور جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس موقعہ پر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے منگوائے انہی کی نقل بعینہٖ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف میں کرائی اور اس نسخہ سے کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوا۔ حضرت عثمان کے اپنے الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو جو پیغام انہوں نے بھیجا تھا وہ یہ تھا:

((أَرْسِلِيْ إِلَيْنَا بِالصُّحُفِ نَنْسَخُهَا فِي الْمَصَاحِفِ ثُمَّ نَرُدُّهَا إِلَيْكِ.))[1]

''آپ صحف کو ہمارے پاس بھیج دیں، تاکہ ہم اسے اور صحیفوں میں لکھ لیں۔ اور اصل پھر آپ کو واپس کر دیں گے۔''

چنانچہ ایسا ہی ہوا یعنی چند صحیفے لکھوا کر اصل کو واپس کر دیا گیا۔ اگر اس اصل میں اور ان نسخوں میں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لکھوائے کوئی اختلاف ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ وہ واپس کیا جاتا کیونکہ جب اور صحیفے سوائے چار مستند صحیفوں کے جلائے گئے تو یہ کیوں نہ جلایا گیا۔ اس کا نہ جلانا اس بات کی قطعی شہادت ہے کہ مصاحف عثمانی اور صحف ابو بکر میں کوئی فرق نہ تھا۔ علاوہ ازیں اگر ان دونوں میں کوئی فرق ہوتا تو یہ بھی ممکن نہ تھا کہ وہ بعد میں ظاہر نہ ہو جاتا اور اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اس کے ظاہر ہونے میں کوئی دقت بھی تھی تو بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وقت میں ایسا کوئی مانع نہ تھا۔ اور اس وقت بھی یہ اصل نسخہ موجود تھا۔ اس وقت تو اسلام میں کئی فریق بھی ہو گئے تھے۔ پس اگر ایک فریق اس کا خواہاں نہ بھی ہوتا تو دوسرا ضرور ایسے اختلافات کو ظاہر کر دیتا۔ جن لوگوں نے حضرت عثمان کو قرآن شریف پڑھتے ہوئے شہید کر دیا تھا کیا ممکن تھا کہ ان کے ہاتھ میں ایسے کسی اختلاف کا آنا ممکن ہوتا تو اس کو ظاہر کر کے خلیفہ کے خلاف الزام قائم نہ کرتے اور اس طرح پر لوگوں کی نظروں میں اپنے اس فعل کو جائز دکھانے کی کوشش نہ کرتے۔ پس جس صورت میں ایک ذرہ بھر شہادت اس امر کی کسی روایت سے نہیں ملتی کہ صحف ابی بکر رضی اللہ عنہ سے مصاحف عثمان رضی اللہ عنہ کا کچھ اختلاف تھا۔ اور برخلاف اس کے صریح شہادت ملتی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی اصل سے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں تیار ہوا تھا اور اسی کاتب کی معرفت جس نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں صحف جمع کیا تھا چند نسخے لکھوائے تو یہ نتیجہ یقینی اور قطعی ہو جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ والے مصاحف حرف بحرف نقل صحف ابی بکر رضی اللہ عنہ کی تھے۔ اور اصل میں اور نسخوں میں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لکھوائے کسی قسم کا فرق نہ تھا۔

❀ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی کارروائی میں صحابہ شامل تھے

اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ حکم کہ وہ تمام اوراق جن پر خود بخود لوگوں نے قرآن شریف لکھ لیا تھا جلا دیئے جائیں صحابہ کی نظروں میں قابل اعتراض یا ناجائز ہوتا تو وہ کبھی اس کو گوارا نہ کرتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طاقت تو خود صحابہ سے تھی پس اگر وہی مخالف ہوتے تو

1- صحيح البخاري: 3506، 4984، 4987؛ جامع الترمذي: 3103، 3104

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قطعاً ایسی کارروائی کرنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ بلکہ ایسی صورت میں ساری اسلامی دنیا ان کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی۔ مگر معتبر روایات سے ثابت ہے کہ انہوں نے نہ صرف آپ کی اس کارروائی پر کوئی اعتراض ہی نہیں کیا بلکہ اس کو پسند کیا اور اس میں حضرت عثمان کو مدد بھی دی۔

اوّل محرک اس کے حذیفہ رضی اللہ عنہ تھے جو کہ آرمینیا سے اسی غرض سے آئے تھے اور جب حضرت عثمان کے سامنے یہ امر پیش ہوا تو پہلا کام جو انہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے مشورہ لیا کہ اس معاملہ میں کیا کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایک روایت جسے ابو داؤد نے بیان کیا ہے (اور جس کی اسناد کو صحیح مانا گیا ہے) یوں ہے:

((قَالَ: قَالَ عَلِيٌّ: لَا تَقُوْلُوْا فِيْ عُثْمَانَ اِلَّا خَيْرًا، فَوَاللّٰهِ مَا فَعَلَ الَّذِيْ فَعَلَ فِي الْمَصَاحِفِ اِلَّا عَنْ مَلَأٍ مِنَا. قَالَ: مَا تَقُوْلُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْقِرَائَةِ فَقَدْ بَلَغَنِيْ اَنَّ بَعْضَهُمْ يَقُوْلُ: اِنَّ قِرَائَتِيْ خَيْرٌ مِنْ قِرَائَتِكَ وَهٰذَا يَكَادُ اَنْ يَكُوْنَ كُفْرًا. قُلْنَا: فَمَا تَرٰى؟ قَالَ: اَرٰى اَنْ نَجْمَعَ النَّاسَ عَلٰى مُصْحَفٍ وَّاحِدٍ فَلَا تَكُوْنُ فِرْقَةٌ وَاخْتِلَافٌ، قُلْنَا: فَنِعْمَ مَا رَاَيْتَ.))[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عثمان کے حق میں سوائے کلمہ خیر کے کچھ نہ کہو کیونکہ مصاحف کے بارے میں جو انہوں نے کیا وہ ہمارے مشورہ سے ہی کیا۔ انہوں نے ہم سے دریافت کیا کہ تم اس قراءت میں کیا کہتے ہو۔ کیونکہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ میری قراءت تمہاری قراءت سے بہتر ہے۔ اور قریب ہے کہ ایسا کلمہ کفر کا ہو جائے۔ ہم نے کہا آپ کی کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا میری رائے یہ ہے کہ ہم لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کریں، تاکہ کوئی فرقہ اور اختلاف نہ رہے۔ ہم نے جواب دیا کہ آپ کی رائے بہت اچھی ہے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہ کے مشورہ کے بعد یہ کام کیا۔ ایک روایت کے بموجب بارہ آدمی اس مجلس میں شامل تھے جس کے سپرد قرآن شریف کے کئی نسخے لکھوانے کا کام کیا گیا تھا۔ چنانچہ زید، سعید، ابی، انس بن مالک، عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم کے ناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف چار آدمی اس اہتمام پر تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً یہ کام چار صحابہ کے سپرد کیا گیا اور بعد میں اس تعداد کو بڑھا دیا گیا۔ جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ جتنے نسخے پہلے تیار کرانے کا خیال ہو بعد میں ان سے زیادہ کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہی ایک ایسے شخص تھے جو علم قرآن میں مشہور ہونے کی وجہ سے اس مجلس میں شامل نہیں ہوئے لیکن ان کو اس وجہ سے باہر نہ رکھا گیا تھا کہ ان کے خلاف کسی کو کوئی ضد یا تعصب تھا بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ اس وقت مدینہ میں موجود ہی نہ تھے بلکہ بہت دور یعنی کوفہ میں رہتے تھے۔ اگر ان کو بلوایا جاتا اور ان کا انتظار کیا جاتا تو کام میں بڑا التوا پڑتا۔ اس لیے کام کو جلدی کرنے کی خاطر ان کو شامل نہ کیا جا سکا۔ مگر جیسا کہ صحابہ کے مشورہ سے یہ کام شروع ہوا تھا ایسا ہی اس کی تکمیل پر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس حکم پر کہ باقی تمام اوراق کو جلا دیا جائے صحابہ نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔ چنانچہ مصعب بن سعید کہتے ہیں کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اوراق قرآن کریم کو جو خود بخود لوگوں نے نقل کر لیے تھے جلانے کا حکم دیا تو میں بہت سے صحابیوں سے ملا مگر ان میں سے کسی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ اسے پسند ہی کیا۔ اصل میں جیسا کہ کئی روایات سے معلوم ہوتا ہے حضرت عثمان کو زیادہ تر فکر اختلاف قراءت سے نہیں ہوا بلکہ اس بات سے کہ جو لوگ اختلاف قراءت کی اصل وجہ سے ناواقف تھے انہوں نے ایسے اختلافات کو مباحثوں اور جھگڑوں کا ذریعہ بنا لیا۔ پس جب عثمان اور دیگر صحابہ نے یہ دیکھا کہ ایسے اختلافات فسادوں اور غلطیوں کا موجب ہو رہے ہیں اور جس ضرورت کے لیے ان کی اجازت دی گئی تھی وہ ضرورت باقی نہیں رہی تو انہوں نے مصلحت اس

1- تحفة الأحوذي: 411/8؛ شرح صحيح البخاري لابن بطال: 586/8

بات میں سمجھی کہ ان اختلافات کا دروازہ آئندہ کے لیے بند کر دیا جائے۔

❀ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی عدم شرکت

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اس کام میں شریک نہ ہو سکے اور تمام جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک وہی شخص تھے جنہوں نے بعض روایات کے مطابق حضرت زید رضی اللہ عنہ کے متعلق نازیبا الفاظ بولے۔ اگرچہ یہ احادیث اعلیٰ طبقہ احادیث میں سے نہیں ہیں مگر تاہم ان پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے صحابی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اختلاف کیا۔

ایک روایت میں سے یہ ہے کہ ایک ایسے آدمی کو قرآن لکھنے پر مامور کیا گیا ہے جو ابھی ایک کافر باپ کی پیٹھ میں تھا جب کہ میں مسلمان ہو چکا تھا۔ الفاظ اس روایت کے جسے ترمذی نے نقل کیا ہے یہ ہیں:

((أَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ مَسْعُودٍ كَرِهَ لِزَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ نَسْخَ الْمَصَاحِفِ وَقَالَ: يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِينَ! أُعْزَلُ عَنْ نَسْخِ كِتَابَةِ الْمُصْحَفِ، وَيَتَوَلاَّهَا رَجُلٌ وَاللهِ لَقَدْ أَسْلَمْتُ وَإِنَّهُ لَفِي صُلْبِ رَجُلٍ كَافِرٍ.))[1]

ان الفاظ سے مراد ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ ظاہر کرنا تھا کہ وہ عمر اور اسلام میں زید بن ثابت پر تقدم رکھتے تھے۔ اب یا تو یہ روایت غلط ہے اور یا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے غلطی کھائی۔ اسلام میں تقدم یا عمر میں بڑے ہونا ایسے امور نہ تھے جو کتابت قرآن میں بھی فضیلت کو ثابت کر سکتے۔ اور اس لیے ان الفاظ سے کچھ مطلب نہیں نکلتا۔ مگر جب کتابت کے معاملہ میں فضیلت کو دیکھا جاتا ہے تو یہ یقیناً زید بن ثابت کو حاصل تھی۔ جب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے اور زید بن ثابت اسلام میں داخل ہوئے۔ کتابت وحی کا کام زیادہ تر انہی کے سپرد رہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حین حیات میں ہی وہ کاتب الوحی کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جب کتاب کی صورت میں قرآن شریف کو جمع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما دونوں کی نظر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ پر ہی پڑی۔ حالانکہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی اس وقت وہیں موجود تھے اور حضرت ابو بکر اور عمر سے بڑھ کر کوئی شخص اس امر کو نہ سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ موزوں اس کام کے لیے کون ہے۔ اگر واقعی ابن مسعود زید رضی اللہ عنہ کو اس قابل نہ سمجھتے تھے تو یہ اعتراض تو انہیں حضرت ابو بکر کے وقت کرنا چاہیے تھا۔ جس وقت ایسا اہم کام جمع کا سا ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ مگر اس وقت انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ روایت ہی غلط ہے اور یا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے غلطی کی۔

زید بن ثابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں اور تمام صحابہ کی نظر میں اس کام میں سب پر سبقت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں حضرت عثمان کے وقت میں اول تو کام ہی محض اس قدر تھا کہ ایک اصل نسخہ سے دوسرے نسخے نقل کیے جائیں۔ اور دوم حضرت عثمان نے اس کام کو بھی بلا مشورہ نہیں کیا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا کہ [مَنْ اَكْتَبُ النَّاسِ] تو انہوں نے جواب دیا کہ [زيد بن ثابت كاتب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم] اور اسی روایت کے اخیر میں ترمذی نے اسی راوی ابن شہاب سے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں:

((فَبَلَغَنِي أَنَّ ذٰلِكَ كَرِهَهُ مِنْ مَقَالَةِ ابْنِ مَسْعُودٍ رِجَالٌ مِنْ أَفَاضِلِ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم.))[2]

یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ کو جو انہوں نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے متعلق بولے اجلۂ صحابہ نے ناپسند کیا اور برا منایا۔

علاوہ ازیں ان روایات کی رو سے اگر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کوئی بات ناپسند تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس کام پر

1- جامع الترمذي: 3103، 3104؛ مسند أبي يعلى: 63؛ قال الشيخ الألباني: صحيح.

2- جامع الترمذي: 3103، 3104؛ مسند أبي يعلى: 63؛ قال الشيخ الألباني: صحيح.

کیوں مامور کیا گیا ہے اور مجھے مامور کیوں نہیں کیا گیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ البتہ بعض روایات جو بہت کمزور ہیں اس قسم کی بھی آئی ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنا نسخہ قرآن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آدمیوں کو دینے سے انکار کیا اور کہ انہوں نے زبردستی ان سے چھین لیا۔ مگر ان روایات پر یقین کرنے کے کافی وجوہات موجود نہیں ہیں۔ اور اگر بفرض محال ان روایات کو صحیح بھی مان لیا جائے تو ان سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو نسخے لکھوائے تھے وہ ناقص تھے یا صحیح نہ تھے۔ ان سے اگر کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے تو صرف یہی کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو بعض قراءتیں اپنے طور پر پڑھتے تھے ان سے روکا جانے پر انہوں نے اظہار ناراضگی کیا اور اسی وجہ پر اپنے نسخہ قرآن کو دینے سے انکار کیا۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں باقی صحابہ رضی اللہ عنہ نے کس کی تائید کی؟ کیا ایک آدمی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے جس نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے کی تائید کی ہو؟ جس طرح ابن مسعود رضی اللہ عنہ کھلے طور سے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے اور اس اظہار کی وجہ سے کسی نے ان کو مار نہ ڈالا تھا۔ اسی طرح دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اپنے رائے کا آزادانہ اظہار کر سکتے تھے۔ اور کوئی ان کو روکنے والا نہ تھا۔ مگر سب صحابہ رضی اللہ عنہم نے بالاتفاق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کارروائی کو صحیح سمجھا اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تائید نہیں کی۔

ان تمام واقعات سے جو اوپر بیان ہوئے یہ امر نہایت صفائی کے ساتھ پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ جو مصاحف حضرت عثمان نے شائع کرائے وہ لفظ بلفظ اور حرف بحرف اس قرآن کریم کی نقل تھے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جمع کرایا تھا۔ جس کے متعلق ہم پہلے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ وہ بلا تفاوت ایک حرف کے وہی قرآن شریف تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کو سکھایا تھا۔ جب حضرت عثمان نے مصاحف نقل کرا کر بھیجے تو اس وقت ہزارہا صحابہ ابھی زندہ موجود تھے۔ اور بعض ان میں سے جیسے عبداللہ بن عمر اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم وغیرہما ایسے تھے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حین حیات اور آپ کے سامنے کل قرآن شریف حفظ کر لیا تھا اور ہزارہا آدمی ایسے تھے جنہوں نے آپ کے بعد قرآن شریف کو حفظ کر لیا تھا۔ اب حضرت عثمان نے جو مصاحف لکھوائے ان کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے صرف تیرہ سال بعد ہے۔ اور اگر ان مصاحف میں اصل نسخہ سے یا قرآن شریف سے جیسا کہ حافظوں میں محفوظ تھا کچھ بھی اختلاف ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم خاموشی سے ان مصاحف کو قبول کر لیتے۔ قرآن کریم ان کا سب سے بڑا قیمتی خزانہ تھا۔ جسے وہ جانوں سے بھی عزیز رکھتے تھے۔ اور اگر ضرورت ہوتی تو پہلے اپنی جانوں کو قربان کر دیتے مگر یہ کبھی گوارا نہ کر سکتے تھے کہ قرآن شریف میں کوئی شخص کسی قسم کا تغیر تبدل کرے۔ ان میں صرف قرآن شریف کی اعلیٰ درجہ کی محبت اور اخلاص ہی موجود نہ تھا بلکہ ان کے ہاتھ میں ایسے ذرائع موجود تھے جن سے وہ مصاحف عثمانی کی صحت کو پرکھ سکتے تھے۔ اگر کوئی فقرہ چھوڑ دیا جاتا یا کوئی حصہ جو قرآن میں داخل نہ تھا داخل کر دیا جاتا تو سینکڑوں صحابی اس کا تذکرہ کرتے۔ مگر ابن مسعود رضی اللہ عنہ تک نے بھی کبھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف یہ الزام نہیں لگایا کہ آپ نے کوئی حصہ قرآن شریف کا چھوڑ دیا ہے یا کچھ بڑھا دیا ہے۔ بلکہ اس کی شکایت صرف یہ تھی کہ اس کو بعض قراءتوں کے پڑھنے سے کیوں روکا گیا۔

اس تمام بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عثمان نے قرآن شریف میں کوئی تغیر نہیں کیا۔ بلکہ جیسا کہ آپ کو جمع ابو بکر سے ملا وہی انہوں نے سب مسلمانوں تک پہنچایا۔ انہوں نے جو کارروائی کی وہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے تھی۔ اور پھر نقلیں کرنے کا اہتمام ان صحابہ رضی اللہ عنہم کے سپرد کیا گیا جو اپنی قرآن دانی میں سب سے بڑھ کر شہرت رکھتے تھے۔ پھر جو نسخے آپ نے لکھوا کر شائع کیے ان کو تمام اسلامی دنیا نے صحیح نسخے قرآن شریف کے تسلیم کیا۔ اور اگر بفرض محال کوئی اختلاف نسخوں میں ہوتا بھی تو اس کا اثر قرآن کریم پر جیسا کہ وہ حافظوں میں محفوظ تھا کچھ نہ پڑ سکتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سخت ترین دشمن جنہوں نے نہایت بے رحمی سے آپ کو قتل کیا انہوں نے بھی یہ الزام آپ پر نہیں لگایا کہ آپ نے قرآن شریف میں کوئی کمی بیشی کر دی ہے۔ اگرچہ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک اعتراض انہوں نے بنایا تھا کہ حضرت عثمان نے ان کاغذات کو کیوں جلوایا جن پر قرآن شریف لکھا ہوا تھا۔ اگر کمزور سے کمزور اعتراض بھی مصاحف

عثمانی کی صحت اور ترتیب پر ہوتے تو یقیناً دشمن اسے بڑھا چڑھا کر بیان کرنے سے کبھی نہ رکتے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں بھی کسی شخص نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اس بارہ میں کوئی الزام نہیں دیا۔

آخری حصہ ہمارے دعویٰ کا جو قرآن شریف ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ بعینہٖ صحف عثمانی کی نقل ہے۔ یہ ایسا دعویٰ ہے جس کو سخت سے سخت دشمنان اسلام نے بھی تسلیم کیا ہے۔ پس قرآن کریم کا تمام تر حفاظت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہم تک پہنچنا یقینی اور قطعی دلائل کے ساتھ ثابت ہے۔ صحف ابو بکر رضی اللہ عنہ میں وہ قرآن تحریر میں تمام و کمال سے محفوظ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چھوڑ گئے اور حضرت عثمان کے مصاحف میں پوری احتیاط سے صحف ابی بکر سے نقلیں کرائی گئیں اور پھر ان سے آج تک تمام اسلامی دنیا میں قرآن شریف شائع ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر دو ایسے ملکوں سے جن میں بعد المشرقین ہے دو نسخے قرآن کے لے لو تو ان میں ایک زیر زبر یا ایک حرف یا لفظ کا فرق بھی نہ پاؤ گے۔ اگر حفاظت الٰہی شامل حال نہ ہوتی تو اس قدر حفاظت انسانی طاقت میں نہ تھی۔ اب ہم ان چند اعتراضات کا جواب دیں گے جو بعض حدیثوں کی بنا پر حفاظت قرآنی پر کیے جاتے ہیں۔ اور اس مضمون سے اصل مضمون حفاظت قرآن کریم کا مکمل ہو جائے گا۔

اعتراضوں کے جواب

❀ حفاظت قرآن کریم پر چھ قسم کے اعتراض

اگرچہ جس قدر شہادت پہلے پانچ عنوانوں کے نیچے دی جاچکی ہے وہ اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کہ قرآن کریم ہر ایک قسم کی تحریف اور تصرف سے محفوظ ہم تک پہنچا ہے اعلیٰ درجہ کی قطعی اور یقینی شہادت ہے اور کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ لیکن چونکہ اس سوال کے تمام پہلوؤں پر بحث کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اس لیے ذیل میں ہم ان تمام اعتراضوں کو جو عیسائیوں نے قرآن کریم کے محفوظ ہونے پر کیے ہیں نقل کر کے ان کا جواب دیتے ہیں تاکہ کسی مخالف کو یہ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہے کہ فلاں اعتراض کا جواب نہیں دیا گیا۔ جہاں تک میں نے مخالفین کی تحریروں پر غور کیا ہے مندرجہ ذیل اعتراضات پر زور دیا گیا ہے۔

① یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ موجودہ قرآن شریف میں بعض فقرے ناقص اور ٹوٹے ہوئے ہیں اور یہ کہ اصل میں وہ فقرے مکمل تھے۔ پس ضروری ہے کہ بعض حصے ضائع ہو گئے ہوں۔

② ایک اور اعتراض یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کے بعض نسخوں کو جو بعض صحابہ کے پاس تھے اور جن کی قراءتیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ والے صحیفہ سے مختلف تھیں تلف کرادیا یا ان کی اشاعت کو روک دیا۔ پس ان نسخوں کو تلف کرانے سے ضرور قرآن شریف کے کچھ حصے ضائع ہو گئے ہوں گے۔

③ ایک اعتراض یہ ہے کہ بعض حصوں کو ہمیشہ کے لیے قرآن شریف میں داخل کرنے کا منشا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نہ ہو گا یا نہ تھا۔ یا بعض حصے منسوخ ہو گئے ہوں گے اور ممکن ہے کہ زید نے ان امور پر اطلاع نہ پانے کی وجہ سے ان کو قرآن شریف میں داخل کر دیا ہو۔

④ چوتھا اور بڑا بھاری اعتراض یہ سمجھا جاتا ہے کہ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت میں بعض عبارتیں قرآن شریف میں پڑھی جاتی تھیں جو اَب نہیں پڑھی جاتیں۔ جس سے موجودہ قرآن کریم کے ناقص ہونے کا نتیجہ نکالا جاتا ہے۔

⑤ پانچواں اعتراض یہ ہے کہ مسلمانوں میں بعض فرقے ایسے موجود ہیں (جس سے معترض کی مراد فرقہ شیعہ ہے) جو اس بات کو مانتے ہیں کہ قرآن شریف محفوظ نہیں رہا۔ بلکہ ناقص ہے اور اس میں سے بعض حصے نکال دیئے گئے ہیں۔

⑥ تازہ ترین اعتراض ڈاکٹر منگانا نے اس صورت میں کیا ہے کہ اس کو بعض اوراق قدیم نسخہ جات قرآنی کے ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن سے موجودہ نسخہ جات سے کسی لفظ یا حرف کا اختلاف پایا جاتا ہے۔

❀ بعض فقرات کے نامکمل ہونے کا اعتراض

مختلف مضامین کو پڑھ کر جو قرآن کریم کی جمع پر لکھے گئے ہیں میں نے یہ چند اعتراض مختصر الفاظ میں بطور خلاصہ ان مضامین سے نکالے ہیں اور ان میں تازہ سے تازہ تصانیف جو اسلام کے خلاف لکھی گئی ہیں شامل ہیں۔ اب ہم اسی ترتیب کے ساتھ ان اعتراضوں کا ایک ایک کر کے جواب دیں گے۔ اعتراض اول کا بڑا حامی ایک مضمون نویس ہے جس نے اسلام (محمڈن ازم) پر انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں مضمون لکھا ہے۔ یہ مضمون نویس لکھتا ہے کہ

''حضرت عثمانؓ والے نسخے مکمل نہیں تھے کیونکہ ان میں بعض فقرے ایسے پائے جاتے ہیں جو کھلے طور پر ناقص اور ادھورے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ ان عبارتوں کا کچھ حصہ جس سے ان کی تکمیل ہوتی تھی ضائع ہو گیا ہے۔''

ایک طالب حق اور ایک سمجھدار انسان بڑی آسانی سے اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت کی اس مضبوط اور قطعیۃ الدلالت شہادت کے بالمقابل جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ایسا وہم کچھ بھی وقعت نہیں رکھتا بلکہ اس کو دعویٰ بلا دلیل کی ذیل میں رکھ کر رد کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ قرآن شریف کا کوئی فقرہ ایک شخص کی نظر میں ادھورا دکھائی دیتا ہے اس لیے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اصل فقرہ ضرور کچھ اور ہو گا اور کچھ حصہ اس کا ضائع ہو گیا ہو گا۔ ہم تو تاریخی شہادت پیش کرتے ہیں کہ جو کچھ آنحضرت ﷺ نے سکھایا وہ سب صحابہ رضی اللہ عنہم نے حفظ کر لیا اور مردوں اور عورتوں نے اپنے سینوں میں محفوظ کر لیا۔ اور اس کے جواب میں یہ وہم پیش کیا جاتا ہے کہ چونکہ کسی صاحب کو کوئی فقرہ مکمل معلوم نہیں ہوتا اس لیے کچھ حصہ ضائع ہو گیا ہو گا۔ معتبر تاریخی شہادت کے خلاف ایسے توہمات کو پیش کرنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔

اب یہ بھی ثابت ہے کہ جس وقت حضرت زیدؓ نے تحریری جمع کے کام کو شروع کیا تو آپ نے نہ صرف قرآن مجید کے حافظوں سے مدد لی بلکہ ان تمام تحریروں کو بھی جو آنحضرت ﷺ کے سامنے آپ کی ہدایت سے لکھی گئی تھیں، جہاں جہاں وہ تھیں وہاں سے جمع کیا اور اس طرح پر ہر ایک آیت اور ہر ایک لفظ کے متعلق پوری پوری تحقیقات کر کے اس کو صحیفوں میں لکھا۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ بعض فقرے ادھورے ہیں یہ خود مخالفین کی عربی زبان سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ جہاں کمال فصاحت و بلاغت کسی فقرہ میں پائی جاتی ہے اس کو بوجہ اپنی ناواقفیت کے وہ ادھورا کہہ دیتے ہیں۔ اور جہاں نہایت باریک اور گہرا تعلق آیات میں ہے وہ بوجہ ایک سطحی نظر سے اس کو دیکھنے کے یہ کہہ دیتے ہیں کہ ان آیات میں کوئی ربط نہیں ہے۔ پھر ایسے ایسے توہمات کو جو ناواقفیت سے پیدا ہوتے ہیں اعلیٰ درجہ کی تاریخی شہادت کے بالمقابل اعتراضوں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

پھر گویا اسی بات کی تائید میں بعض فقرے ناقص پائے جاتے ہیں وہی مضمون نویس انسائیکلو پیڈیا میں لکھتا ہے کہ چند چھوٹے چھوٹے اور الگ الگ ٹکڑے اب تک ایسے پائے جاتے ہیں جو کہ اصل میں قرآن شریف کے حصے تھے مگر زیدؓ نے ان کو شامل نہیں کیا۔ اب ان احادیث پر مفصل بحث چوتھے نمبر کے اعتراض میں آئے گی۔ یہاں میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اعتراض اول کے ساتھ اس کو چسپاں کرنے سے معترض کا منشا یہ ظاہر کرنے کا ہے کہ جو فقرے ناقص پائے جاتے ہیں انہیں کے ٹکڑے اب تک حدیثوں میں موجود چلے آتے ہیں۔ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ بعض فقرے جن کو معترضین ادھورے سمجھتے ہیں وہ ان ٹکڑوں کے ساتھ شامل کرنے سے جو ایسی حدیثوں میں پائے جاتے ہیں درحقیقت کامل ہو جاتے ہیں تو پھر یہ مضمون قابل بحث ہو جاتا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اعتراضوں کی بنا صرف توہمات پر ہے اور کوئی مثال پیش نہیں کی جاتی مثلاً: قرآن شریف کا فلاں فقرہ ناقص ہے اور فلاں حدیث میں جو یہ کہا گیا ہے کہ فلاں عبارت کسی وقت قرآن شریف کا جزو تھی اگر اس عبارت کو اس ناقص فقرہ کے ساتھ ملا دیا جائے تو ان کے ملنے سے ایک کامل فقرہ بن جاتا ہے۔ اگر ایسی کوئی مثال پیش کی جائے تو پھر اعتراض کی صورت بھی بنتی ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ ٹکڑے جو احادیث میں بیان کیے گئے ہیں ان کے لیے کوئی ایسی جگہ قرآن شریف کے اندر نہیں ملتی کہ جہاں اس کو رکھا جا سکے۔ اور اسی سے ان ٹکڑوں کی اصل حقیقت کا پتہ لگتا ہے۔

❀ بحیثیت مجموعی اعتراضات ایک دوسرے کے مؤید نہیں ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اگر ان تمام اعتراضوں پر یکجائی نظر سے غور کیا جائے تو وہ خود ہی ایک دوسرے کا بطلان کرتے ہیں۔ یہ

بات پیش کی جاتی ہے کہ قرآن شریف کے بعض حصے گم ہوگئے اور اس کی تائید میں یہ واقعات پیش کیے جاتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سوائے ان صحیفوں کے جو اپنی نگرانی میں تیار کرائے تھے باقی تمام صحف قرآنی کو جلادیا اور ان کی نقلیں شائع نہ ہونے دیں۔ اور بعض احادیث میں یہ ذکر ہے کہ بعض عبارتیں اصل میں قرآن شریف میں پائی جاتی تھیں جو اب اس میں داخل نہیں ہیں اور بعض فقرے موجودہ قرآن میں ناقص ہیں۔ اور یہ بھی کہ شیعہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ بعض حصے جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کا ذکر تھا وہ قرآن سے نکال دیئے گئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصحف تیار کرا کے اطراف میں بھیجے اور دوسرے نسخوں کو جلانے کا حکم دیا تو اس کے بعد وہ اختلاف جو صحف عثمانی اور دیگر صحائف میں بتائے جاتے ہیں یا تو موجود رہے یا قطعاً نابود ہوگئے۔ اگر ایسے اختلاف صحف عثمانی کی اشاعت سے قطعاً رک گئے تھے تو پھر وہ روایات جن میں یہ ذکر ہے کہ فلاں عبارت قرآن شریف میں داخل تھی بالکل غلط ثابت ہوتی ہے۔ اور اگر ایسے اختلاف بعد میں بھی کچھ نہ کچھ محفوظ چلے آئے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے نسخے قرآن کریم کے دنیا سے کیوں نابود ہوگئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سلطنت میں اگر یہ ممکن نہ تھا تو اس کے بعد کون روکنے والا تھا جن لوگوں نے ان اختلافات کو نسلاً بعد نسل محفوظ رکھا تھا کیوں کچھ وقت گذرنے کے بعد جب اسلام کی سلطنت متفرق ہوگئی انہوں نے ان کو اپنے نسخوں میں درج نہ کر لیا اور کون مانع ہوا؟

پھر ایک دوسری مشکل اس میں یہ پیش آتی ہے کہ اگر وہ حصص جن کو کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چھوڑ دیا تھا محفوظ رہے یا کل نہیں تو ان میں سے بعض ہی محفوظ رہے تو چاہیے تھا کہ وہ یا تو اعتراض نمبر اول اور یا اعتراض نمبر پنجم کے مطابق ہوتے۔ یعنی ان سے یا تو فرضی نقص بعض فقرات کا دور ہوتا یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت ان میں پائی جاتی۔ مگر تعجب یہ ہے کہ یہ عبارتیں جن کا ذکر احادیث میں ہے نہ تو فرضی نقص کو پورا کرتی ہیں نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کی بو تک ان میں پائی جاتی ہے۔ جو حصص بزعم معترضین گم ہوگئے تھے ان کا تو نام و نشان تک نہیں ملتا اور جو حدیثوں میں عبارتیں پائی جاتی ہیں وہ گم شدہ حصص میں سے نہیں ہیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں اور اس سے ایک دانشمند آدمی ایک مفید نتیجہ پر نہیں پہنچتا؟ ایک چیز کے گم ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور اس کی تائید میں یہ پیش کیا جاتا ہے کہ فلاں جگہ سے وہ چیز یا اس کے اجزا برآمد ہوگئے ہیں۔ مگر جب اس برآمد شدہ مال کو دیکھا جاتا ہے تو یہ قطعاً اس مال کا کوئی حصہ ثابت نہیں ہوتا۔ جس کے گم ہونے کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ پس اس دعوے کے بطلان پر یہی ایک دلیل کافی ہے۔ پھر کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے بعض حصص قرآنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چھوڑ دیئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ خود ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ ہوئے۔ مگر وہ اپنی فضیلت کے حصص کو دوبارہ قرآن شریف میں درج نہ کر سکے۔ پس یہ تمام اعتراض خود ہی ایک دوسرے کی بیخ کنی کرنے والے ہیں۔ مگر مزید اطمینان کے لیے ان میں سے ہر ایک اعتراض پر الگ الگ بحث کر کے بھی ہم ان کا جھوٹا ہونا دکھائیں گے۔

❀ اُبی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے مصاحف

اب ہم دوسرے اعتراض کو لیتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دیا کہ

"سوائے اس اصلی صحف کے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں تیار ہوئے تھے اور ان مصحفوں کو جو ان صحف سے جو حضرت عثمان نے نقل کرائے تھے باقی نسخے قرآن شریف کے جلا دیئے جائیں۔"

اب ان مصحفوں میں سے جو جلائے گئے یعنی جن کے جلانے کا حکم دیا گیا وہ مصحفوں کو صحف عثمانی کے بالمقابل معترضین خاص وقعت دیتے ہیں۔ یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مصحف اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا مصحف۔ ان مصحفوں اور عثمانی مصحفوں میں جو

اختلاف بتایا جاتا ہے کہ اس کے متعلق انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے مضمون نویس کی رائے اس قابل ہے کہ اسے مخالفانہ نکتہ چینی کا بہترین وکیل سمجھا جائے۔ یہ وہی مضمون نویس ہے جس کے مضمون ''محمڈن ازم'' کا میں پہلے بھی حوالہ دے چکا ہوں۔ وہ لکھتا ہے:

''ساتھ ہی اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن شریف کی دوسری سورتیں فی الفور نابود نہیں ہو گئی تھیں۔ خصوصیت سے ہمیں ابی کے نسخہ کے متعلق کچھ اطلاع ملتی ہے جو فہرست اس کی سورتوں کی دی گئی ہے اگر وہ صحیح ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ابی کے نسخہ میں وہی کچھ تھا جو موجودہ قرآنوں میں ہے اس صورت میں ماننا پڑتا ہے کہ ابی کے مصحف کی بنا بھی انہیں اصل مصحف پر ہو گی جو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے جمع کیے تھے۔ یہی بات ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف پر بھی صادق آتی ہے اور اس کی فہرست مضامین سے بھی جو ہم تک پہنچی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ لمبی سورتوں یعنی طوال کو پہلے رکھنے کے اصول پر ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے زید سے بھی بڑھ کر عمل کیا ہے۔ اس کے مصحف میں پہلی سورت یعنی فاتحہ اور ایک سو تیرہویں اور ایک سو چودھویں سورتیں یعنی معوذتین نہیں لکھی گئیں۔ اس کے برخلاف ابی نے اپنے مصحف میں دو دعائیہ فقرے زیادہ لکھ رکھے تھے۔ جن کو ہم (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سمجھ سکتے ہیں۔''

یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان دونوں مصحفوں کی بعض قراءتیں جو صحف عثمانی کی قراءتوں سے مختلف ہیں محفوظ رہی ہیں اور ان کے پرانے اختلافات قراءت کی بھی ایک بڑی تعداد محفوظ ہو کر ہم تک پہنچی ہے۔ ان میں سے ایک کثیر حصہ قراءتوں کا ایسا ہے جو موجودہ قراءتیں سے بہت کم درجہ کا ہے۔ لیکن بعض قراتیں ایسی بھی ہیں جو مرجوحہ قراءت کے ہم پلہ ہیں۔ اور چند ایک ایسی ہیں جن کو موجودہ قراءت پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔

❀ مخالف کا اعتراف کہ مصحف عثمانی ہی اصل ہے

لیکن اس مضمون نویس کی صحیح صحیح رائے ناظرین کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسی جگہ ایک اور فقرہ کا ترجمہ بھی ہدیہ ناظرین کیا جائے۔ اس فقرہ میں جو منقولہ بالا فقرہ کے ساتھ ملحق ہے اور جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ وہ دلائل دیئے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل قرآن شریف وہی ہے جو عثمانی مصحفوں اور ان کی نقلوں میں موجود ہے:

''صرف ایک ہی شخص ایسا معلوم ہوتا ہے جس نے واقعی طور پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحفوں کے جاری ہونے کے وقت کچھ مخالفت کی اور یہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ تھا۔ وہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سب سے پرانے رفیقوں میں سے تھا۔ اور بہت موقعوں پر اس نے آپ کی خدمات بھی کی تھیں لیکن اس کے خیالات کا دائرہ وسیع نہ تھا۔ اگرچہ وہ اسلامی مذہبی علم کلام میں ایک بڑا رکن مانا جاتا ہے۔ پر اس کی مخالفت کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اب جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ اس وقت بہت سے ایسے مسلمان زندہ موجود تھے جنہوں نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے منہ سے قرآن شریف سنا ہوا تھا اور پھر جب اس بات کو بھی دیکھتے ہیں کہ کمزور خلیفہ عثمان رضی اللہ عنہ کی بعض دوسری تجاویز کی مذہب کے متعصب حامیان نے بڑی مخالفت کی اور ان لوگوں کا مخالفانہ جوش عثمان کے بعض حریص پرانے رفیقوں کے سبب سے اور بھی تیز ہو گیا۔ یہاں تک کہ آخر کار انہوں نے خلیفہ کو قتل کر دیا۔ اور بالآخر اس بات پر غور کرتے ہیں کہ خلیفہ کی موت کے بعد جو خانہ جنگیاں ہوئیں ان میں مختلف فریق اس بات کی تلاش میں لگے رہتے تھے کہ کوئی ایسے وجوہ ان کے ہاتھ میں آجائیں جن سے وہ اپنے مخالفین پر کفر کا فتویٰ لگا سکیں۔ جب ہم ان تمام باتوں پر غور کرتے ہیں تو ان سے صاف طور پر مصحف عثمانی کے اصل قرآن ہونے کا نتیجہ نکلتا ہے۔ کیونکہ کسی فریق نے یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فریق نے بھی اس معاملہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر اعتراض نہیں کیا اور نہ اس مصحف کو چھوڑا جو زید رضی اللہ عنہ نے تیار کیا تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے خاندان کا مخلص تھا۔''

❀ مجنون معترضین

میں نے یہ فقرے اس غرض سے نقل کیے ہیں، تاکہ ناظرین خود اعتراض کی وقعت کو دیکھ سکیں اور معلوم کر سکیں کہ مخالفین اگر سوچ سمجھ کر چلیں تو موجودہ قرآن کے اصل قرآن ہونے پر کہاں تک اعتراض کر سکتے ہیں۔ اس مضمون نویس کی رائے مخالف نکتہ چینی کو سنجیدگی سے بیان کرتی ہے اور اس لیے اس تردید سے ان تمام اعتراضوں کا قلع قمع ہو جاتا ہے جو معترضین نے کیے ہیں۔ میرے خیال میں کیا انگریزی اور کیا اردو تحریروں کو جہاں تک پڑھا جائے اس سے باوقعت اعتراض کوئی معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اس بات کا ظاہر کرنا بھی ضروری ہے کہ اسلام پر بعض دیسی عیسائی صاحبان نے مجنونانہ اعتراض بھی کیے ہیں۔ ایسی ایک تحریر کی مثال مصنف تاویل القرآن میں بھی ملتی ہے۔ یہ شخص اپنی تاریخ قرآن کو ان الفاظ سے شروع کرتا ہے:

''میری زندگی کے برسوں کے دن تھوڑے رہے اور برے'' اور پھر تشریح دعویٰ کرتا ہوا لکھتا ہے کہ ''اس امر کا کہ قرآن شریف کا کوئی بڑا حصہ ساقط ہو گیا اور جو بچ گیا وہ بدنظمی سے مرتب ہوا اکثر محققین کو اعتراف کرنا پڑا''۔ اور پھر اخیر پر لکھتا ہے کہ ''جو قرآن اب ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے وہ اصل قرآن کا ایک ایڈیشن ہے۔ اس وقت اس سے زیادہ بہتر اور معتبر ایڈیشن بھی موجود تھے جیسے نسخہ ابو بکر رضی اللہ عنہ یا نسخہ عبداللہ بن مسعود یا نسخہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ یا نسخہ علی رضی اللہ عنہ یا ان سب کے علاوہ کوئی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اہتمام سے جو نسخہ تیار ہوا تھا وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نسخہ سے ضرور افضل تھا۔ گو ابن مسعود یا ابی بن کعب یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قرآنوں کی ٹکر کا نہ تھا۔ ہم بھی ان سب مصاحف قرآن کی نسبت جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں شہید ہو گئے یہی کہتے ہیں کہ اگر آج وہ یا ان کے نقول بھی ہم تک پہنچتے تو ان سب سے بڑا ذخیرہ علم دین کا حاصل ہوتا ایسا کہ جس کے مقابل صحیفہ عثمانی دریا کے مقابل گڑھا متصور ہوتا۔''

اور پھر ایک دوسری جگہ یہی شخص یوں بڑہانکتا ہے:

''یہ بالکل مبالغہ نہیں کہ جو بدنظمی و بے احتیاطی قرآن کے حق میں ابتداءً سرزد ہوئی دنیا میں کسی کتاب کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا گیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ گو وہ صحیفہ قرآن جو حضرت عثمان نے جمع کرایا ہم تک بے کم و کاست پہنچا۔ مگر وہ قرآن آنحضرت چھوڑ گئے گم ہو گیا اور جو باقی ہے صرف اس کی یادگار ہے کچھ بے ترتیب حصص جو اپنی قسمت سے بچ رہے۔''

اور پھر ایک جگہ سبعۃ احرف کی بحث کرتا ہوا لکھتا ہے:

''پس ہم کو یہ ماننا پڑا کہ وہ قرآن جو حضرت پر نازل ہوا تھا وہ ہفتگانہ قرآن تھا۔ اور لفظ قرآن کا اطلاق حقیقت میں ان ساتوں حروف کے مجموعہ پر ہوتا تھا۔ اور اب جو قرآن موجود ہے یعنی صحیفہ عثمانی وہ زیادہ سے زیادہ صرف کسی ایک حرف پر مشتمل ہے اور اس لیے اگر بہت رعایت کریں تو اس کو صرف ایک ساتواں حصہ سالم قرآن اصلی کا کہہ سکتے ہیں۔''

ایسے شخص کا جواب صرف یہی کافی ہے کہ وہ معترضین جن کی مخالفت کی حالت اس مصنف کی طرح جنون کی حد تک نہیں پہنچ گئی وہ خود اس کے ان تمام لایعنی دعووں اور مجنونانہ بڑوں پر لعنت بھیجتے ہیں اور یہ گواہی دیتے ہیں کہ جیسا کہ میور نے اور انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے مضمون نویس نے دی ہے کہ جس طرح حفاظت سے قرآن کریم ہم تک پہنچا ہے اس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی اور کہ تمام واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اصل قرآن وہی ہے جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے اور جو مصحف عثمانی کی نقل ہے اور کہ مصحف عثمانی ہی اصل قرآن تھا اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی یا تغیر تبدل نہیں ہوا۔

❀ مصحف اُبی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی مطابقت صحف عثمانی سے

اب ہم اصل اعتراض کی طرف واپس آتے ہیں۔ اس بات کو تسلیم کیا گیا ہے کہ ابن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف بلحاظ

ترتیب اور بلحاظ عبارتوں کے عام طور پر مصحف عثمانی کے مطابق ہی تھے۔ اور یہ مطابقت یہاں تک تھی کہ راقم مضمون اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ ابن مسعود اور ابی رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف ان صحف کی بناپر تیار کیے تھے جو زید نے حضرت ابو بکر کے وقت میں جمع کیے تھے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ہی جمع ہو چکا تھا اور اسی بناپر ابن مسعود یا ابی بن کعب یا زید رضی اللہ عنہ کے مجموعے تیار ہوئے تھے۔ یہی وجہ ان کی مطابقت کی تھی۔ کیونکہ وہ سب ایک ہی سرچشمہ سے لیے گئے تھے۔ ہاں فرق صرف اس قدر تھا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے جو صحف میں قرآن شریف کو جمع کیا تو اس میں حد درجہ کی احتیاط سے کام لیا گیا اور تمام اصل تحریریں اکٹھی کی گئیں۔ اور تمام صحابہ کے اتفاق اور مشورہ سے یہ جمع وقوع میں آئی۔ لیکن ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی کوششیں صرف ذاتی تھیں۔ اس لیے ان کا کسی موقعہ پر غلطی کھا جانا بھی ممکن تھا۔ بہر حال جو اختلاف ان مصحفوں کے مصحف عثمانی سے بتائے جاتے ہیں وہ صرف دو قسم کے ہیں۔ یعنی اول یہ کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں معوذتین اور فاتحہ قرآن کریم کے اندر نہ لکھی گئی تھی اور ابی کے مصحف میں دو دعائیہ فقرے زائد لکھے ہوئے تھے۔

اور دوم کچھ قراءتوں کا اختلاف تھا۔ لہٰذا میں ان دو اختلافوں کی حقیقت پر غور کروں گا۔ اور تاویل القرآن کے مصنف کے بے سروپا اور لایعنی دعوے اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی طرف توجہ بھی کی جائے اور خود اس کے ہم مذہبوں کی تحریریں اس کے مجنونانہ دعووں پر نفرین بھیجتی ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف صرف صحف ابی بکر کی نقل تھے اور نقل کرنے والے بھی خود ہی حضرت زید رضی اللہ عنہ تھے۔ جنہوں نے حضرت ابو بکر کے وقت صحف کو جمع کیا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مصحف کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھی واقعات کے سامنے باطل ثابت ہوتا ہے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایسا کوئی مصحف تھا تو کیوں کبھی اس کی اشاعت نہ ہوئی؟ بالفرض اگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مانع ہوئے تھے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقت میں کون مانع ہوا تھا۔ اور کم از کم یہ تو ضرور تھا کہ اگر اور کبھی موقع اس کی اشاعت کا نہ ملا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی خلافت میں ہی اس کو شائع کرتے اور دنیا میں پھیلاتے۔ اور عجیب تر یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت میں مصحف نقل کرانے میں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی مددگار ہوئے اور اپنے مصحف کا نام تک نہ لیا۔

❀ حدیث کے چار طبقے اور پایہ تصانیف جلال الدین سیوطی

ہمارے سامنے اب اس اعتراض کے متعلق یہ سوال حل طلب ہیں کیا اُبی رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس اپنے اپنے الگ مصحف تھے۔ کیا ان کا مصحف عثمانی سے کوئی اختلاف تعداد سور اور قراءتوں میں تھا اور اگر تھا تو کس قدر؟ پہلے اُبی کو لو۔ کوئی معتبر روایت ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ اُبی کا مصحف الگ تھا جس کا مروجہ قرآن سے اختلاف تھا یا یہ کہ اس مصحف میں علاوہ قرآن شریف کے ایک سو چودہ سورتوں کے دو دعائیہ جملے اخیر پر زائد لکھے ہوئے تھے۔ ہاں بعض روایات جلال الدین سیوطی کی اتقان میں ملتی ہیں اور اس لیے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ سیوطی کی روایات پر ہم کہاں تک اعتبار کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے میں ناظرین کو شاہ عبدالعزیز دہلوی کے عجالہ نافعہ کا حوالہ دیتا ہوں۔ جو اصول علم حدیث پر ایک مختصر سا مگر نہایت قیمتی رسالہ ہے۔ شاہ صاحب نے احادیث کو چار طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ طبقۂ اول میں جو سب سے زیادہ معتبر ہے۔ وہ مؤطا امام مالک اور بخاری اور مسلم کو رکھتے ہیں۔ دوسرے طبقہ میں ابوداؤد و ترمذی و نسائی کو رکھا ہے۔ اور ان کو بلحاظ اعتبار کے طبقہ اول سے کم درجہ کی تسلیم کیا گیا ہے۔ تیسرے طبقہ میں ایسی کتابیں رکھی گئی ہیں جن کی عام طور پر قبولیت نہیں ہوئی اور نہ ہی ایسی احادیث کو محض ان کتابوں میں ذکر کیا جانے کی وجہ سے قابل سند مانا گیا ہے۔ بلکہ ان میں ایسی روایتیں بھی ہیں جن کے راویوں کے ثقہ ہونے پر اور ان کی راست گوئی پر بڑی جرح ہوئی ہے۔ اس طبقہ میں احادیث کی ایسی کتابیں جیسے طبرانی، طحاوی، بیہقی، مستدرک حاکم، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی اور چند کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سب سے آخری طبقہ احادیث کا چوتھا طبقہ ہے جس کے متعلق شاہ صاحب یوں لکھتے ہیں:

''طبقہ رابعہ احادیثے کہ نام ونشان آنہادر قرون سابقہ معلوم نبود ومتاخران آنہارا روایت کرداند۔ پس حال آنہاازدو شق غالی نیست یاسلف تفحص کردند وآنہارااصلی نیافتہ اند تامشغول بروایت آنہامے شدند یا یافتند ودر آنہا قدحے وعلتے ودیدند کہ باعث شد ہمہ آنہار وعلی کل تقدیر ایں بر ترک روایت احادیث قابل اعتماد نیستند ومایہ تصانیف شیخ جلال الدین سیوطی در رسایل ونوادر۔ خود ہمیں کتابہاست۔''

''چوتھے درجہ کی حدیثیں وہ ہیں جن کا پہلے زمانوں میں کہیں نام ونشان بھی نہیں پایا جاتااور متأخرین نے ہی ان کو روایت کیا ہے۔ پس ایسی حدیثیں دو حال سے خالی نہیں ہیں۔ یاتو پہلے لوگوں نے خوب تحقیق کی اوران حدیثوں کو اصلی نہ پایااس لیے ان کی روایت نہ کی یا اگرانہوں نے ان کو پایاتوان میں ایسی قدح اور علت دیکھی کہ سب کے سب نے ان روایتوں کو چھوڑ دیا۔ دونوں صورتوں میں یہ احادیث قابل اعتبار نہیں ہیں اور شیخ جلال الدین سیوطی کی تصنیفوں کی کل پونجی اپنے رسالوں اور نوادر میں اسی قسم کی کتابیں ہیں۔''

پس اول تو اسی سے قیاس کر لینا چاہیے کہ اتقان کی روایات پر کہاں تک اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ یہ روایات محققین کے نزدیک بالکل ناقابل اعتبار ہیں یاتو محض وضعی ہیں یاایسی کمزور اور ناقابل اعتبار کہ کسی محدث نے ان کی روایت کو نہیں لیا۔ اب ایک اور امر قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ نہ صرف ان روایات کو اعلیٰ طبقہ کی احادیث سے کچھ تائید نہیں ملتی بلکہ تردید ہوتی ہے۔ ہم دکھا چکے ہیں کہ روایت معتبرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ بھی اس مجلس میں تھے جس کے سپرد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصحفوں کا نقل کرانا کیا تھا۔ بعض اور روایات ایسی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں بھی ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن کے کام میں مدد دی۔ لیکن اگر بفرض محال اس بات کو بھی تسلیم کر لیا جائے کہ ابی کے پاس ایک الگ مصحف بھی تھا جس میں انہوں نے علاوہ قرآن شریف کی سورتوں کے دو دعائیہ جملے بھی لکھے ہوئے تھے تو اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ وہ دعائیہ جملے فی الواقع جزو قرآن شریف تھے۔ بلکہ اس سے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ابی بن کعب ان کو قرآن شریف کی دو سورتیں سمجھتے تھے۔ اور اگر ابی کا یہ خیال بھی ہو تو بھی اس سے قرآن کریم پر کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا۔ ہزارہا صحابہ کی متفقہ شہادت ایک طرف اور ابی کا خیال ایک طرف؟

قبل اس کے کہ ابی کے اس خیال کو مصحف عثمانی پر حملہ کرنے کے لیے پیش کیا جائے ان صحابہ کا نام تو معترضین کو لینا چاہیے جنہوں نے ابی کے اس خیال کی تائید کی۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جن کے خیالات بعض امور کی نسبت اجماع صحابہ سے الگ تھے وہ بھی ابی کی تائید نہیں کرتے اور ان دو جملوں کو قرآن کریم کا جزو قرار نہیں دیتے۔ اب اگر ایک شخص تحقیق کر کے اعتراض کرتا تو اسے یہ تو لازم تھا کہ پہلے وہ شہادت کا وزن کرتا اور پھر دیکھتا کہ آیا اعتراض کی صورت بھی بنتی ہے؟ قرآن کریم کوئی ایک یا دو شخصوں کی جائداد تو تھی نہیں کہ جو کچھ وہ کہہ دیں صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ اور یہ خیال کر لیا جائے کہ باقی صحابہ کو کوئی علم ہی نہ تھا۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ صرف ایک ابی کو یہ معلوم ہوتا کہ فلاں دو دعائیہ جملے قرآن شریف کا جزو ہیں۔ اور باقی ہزارہا صحابی اس سے بالکل بے خبر رہتے اور ان کے کانوں تک یہ بات ہی کبھی نہ پہنچتی۔ قرآن کریم کی ہر ایک آیت اس کے نزول کے وقت دشمنوں اور دوستوں کے درمیان کثرت سے شائع ہو جاتی تھی۔ اب ایک شخص سے غلطی بھی ہو سکتی تھی جس کی اصلاح ہزارہا دوسرے شخصوں کی شہادت سے ہو سکتی تھی۔ بلکہ یہ ایک خصوصیت قرآن کریم کو حاصل ہے کہ اس کی ہر ایک آیت ہزارہا لوگوں کے سینوں میں فی الفور محفوظ ہو جاتی تھی۔ اور اس طرح پر قرآن شریف کا محافظ کوئی فرد واحد نہ تھا۔ بلکہ ہزارہا محافظ تھے اور ایک آدمی کی غلطی کی اصلاح دوسروں کی شہادت سے فی الفور ہو سکتی تھی۔ پس تمام صحابہ رضی اللہ عنہ کی متفقہ شہادت ہی ایک ایسا امر ہے جو غلطی کرنے سے بچا سکتا ہے۔

اب اگر مصحف عثمان اور مصحف ابی رضی اللہ عنہ میں کوئی اختلاف تھا تو اس کی صورت یہ نہ تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک بات کہتے ہوں اور

اُبی رضی اللہ عنہ اس کے خلاف کوئی دوسری بات کہتے ہوں۔ بلکہ یہ اختلاف ابی رضی اللہ عنہ کا تمام جماعت صحابہ رضی اللہ عنہم سے تھا۔ حتی کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی اختلاف تھا۔ پس ایسی صورت میں کسی معترض کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ کہہ دے کہ ممکن ہے کہ حق ابی کے ساتھ ہو۔ یعنی ابی کی بات سچی ہو۔ کیونکہ ابی رضی اللہ عنہ کی رائے اکیلی تھی اور اس کے خلاف تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی متفقہ شہادت تھی۔ پس جب کہ یہ بھی ثابت ہے کہ ہر ایک آیت نازل ہونے کے وقت عام طور پر شائع ہو جاتی تھی اور دوسری طرف ابی رضی اللہ عنہ کے خیال کا مؤید صحابہ میں سے ایک بھی نہیں ملتا۔ بلکہ وہ کھلے طور پر ابی کی بات کو غلط قرار دیتے ہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ اُبی غلطی پر تھے۔

کیونکہ یہ قرین قیاس ہے کہ ایک شخص سے غلطی ہو جائے اور دوسرے اس کی اصلاح کر دیں۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ قرآن شریف کا کوئی حصہ نازل ہو اور اس کا علم سوائے ابی کے اور ایک صحابی کو بھی نہ ہو۔ یہ سب باتیں اس روایت کو جو اتقان میں موجود ہے قابل اعتبار فرض کر کے لکھی گئی ہیں۔ اور دراصل جیسا کہ میں دکھا چکا ہوں یہ روایت ہر گز قابل اعتبار نہیں ہے۔

❀ حفد اور خلع

اب ہم ایک اور پہلو سے اس معاملہ پر نظر کرتے ہیں۔ اتقان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو جملے جن کو حفد اور خلع کی سورتوں کے نام سے نامزد کیا گیا ہے دعائے قنوت کے دو حصے ہیں۔ اور اس طرح پر ہیں۔ فقرہ اول:

((اللَّهُمَّ إِنَّا نَسْتَعِينُكَ وَنَسْتَغْفِرُكَ، وَنُؤْمِنُ بِكَ، وَنَخْضَعُ لَكَ، وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَكْفُرُكَ.))

ترجمہ: ”اے اللہ ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں اور تیری ہی حفاظت طلب کرتے ہیں اور تیری نیک ثنا کرتے ہیں۔ اور جو شخص تیری نافرمانی کرتا ہے ہم اس سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں اور اسے چھوڑتے ہیں۔“

فقرہ دوم

((اللَّهُمَّ إِيَّاكَ نَعْبُدُ، وَلَكَ نُصَلِّي وَنَسْجُدُ، وَإِلَيْكَ نَسْعَى وَنَحْفِدُ، نَرْجُو رَحْمَتَكَ وَنَخَافُ عَذَابَكَ الْجِدَّ، إِنَّ عَذَابَكَ بِالْكَافِرِينَ مُلْحَقٌ.))[1]

ترجمہ: ”اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیرے لیے ہی نماز پڑھتے اور سجدہ کرتے ہیں۔ اور تیری طرف ہی بھاگ کر آتے ہیں اور تیری ہی خدمت کرتے ہیں۔ اور تیری رحمت کی امید کرتے ہیں۔ اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ تیرا عذاب کافروں کو جا لگتا ہے۔“

❀ دعائے قنوت قرآن کریم کا حصہ نہیں

یہ وہی دعائے قنوت ہے جن کو مسلمان نماز میں پڑھتے ہیں اور یہ دعا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی ہے۔ دعائے قنوت کی اور بھی بعض صورتیں صحیح احادیث میں آئی ہیں اور مندرجہ ذیل دعا بہت مشہور ہے:

((«اللَّهُمَّ اهْدِنِي فِيمَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنِي فِيمَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنِي فِيمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لِي فِيمَا أَعْطَيْتَ وَقِنِي شَرَّ مَا قَضَيْتَ فَإِنَّكَ تَقْضِي وَلاَ يُقْضَى عَلَيْكَ وَإِنَّهُ لاَ يَذِلُّ مَنْ وَالَيْتَ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ».))[2]

اب یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ دعائے قنوت کی یہ دونوں صورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے مروی ہیں اور

1- سنن الكبرى للبيهقي: 210/2

2- جامع الترمذي:464؛ سنن أبي داود:1425؛ سنن النسائي:1745؛ سنن ابن ماجه: 1178

قرآن کریم سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسلمانوں میں سے کیا سابقین اور متاخرین سب دعائے قنوت پڑھتے رہے ہیں جس طرح آنحضرت ﷺ نے یہ دعا ان کو سکھائی تھی۔ پس صحابہ کے علم کی حد صرف اسی بات تک نہ تھی کہ دعائیہ جملے جن کو اُبی رضی اللہ عنہ بموجب روایت اتقان اپنے مصحف میں شامل کرتے تھے ان کو آنحضرت ﷺ نے کبھی قرآن کا حصہ بنا کر سکھایا تھا۔ بلکہ ان کو یہ بھی علم تھا کہ یہ دعائیہ جملے ان کو سکھائے بھی گئے ہیں مگر ان کو جزو قرآن قرار نہیں دیا گیا۔ اس طرح پر صحابہ کی شہادت کے بر خلاف ابی رضی اللہ عنہ کے صرف لاعلمی کی شہادت ہی نہ تھی کہ وہ کہتے ہوں ہمیں کبھی یہ جملے سکھائے ہی نہیں گئے۔ بلکہ ان کی شہادت تو یہ تھی کہ یہ جملے تو ہمیں سکھائے گئے ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ قرآن کا جزو نہیں۔ اسی لیے صحابہ میں سے کسی نے ابی رضی اللہ عنہ کی بات کی تائید نہیں کی۔

بلکہ احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے بھی اس دعاء القنوت کو پڑھا اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی سکھایا۔ مگر کبھی اس کو جزو قرآن نہیں کہا۔ ممکن ہے کہ ابی کو صرف اس بات سے غلطی لگی ہو کہ یہ جملے نماز میں پڑھے جاتے ہیں۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ اور بھی بہت سارے دعائیہ جملے نماز میں پڑھے جاتے تھے جو جزو قرآن نہیں تھے۔ اور یہ جملے بھی قرآن شریف کی آیات کی طرح فاتحہ کے بعد نہ پڑھے جاتے تھے اور نہ کبھی اس بات کو کافی سمجھا گیا کہ سورۂ فاتحہ کے بعد آیات قرآنی پڑھنے کی بجائے انہی دو جملوں کو پڑھ لیا جائے۔ پس اگر ابی رضی اللہ عنہ نے ان دعائیہ جملوں کو مصحف میں لکھا یا قرآن کا حصہ سمجھا تو یہ محض ان کا خیال تھا اور غلط خیال تھا۔ اور ہزارہا صحابہ کی قطعی شہادت اس کے خلاف بتاتی ہے کہ یہ جملے جزو قرآن ہر گز نہیں تھے۔

کیونکہ اول تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت جمع قرآن میں کل صحابہ رضی اللہ عنہم اس کام میں شامل تھے۔ اور وہ جمع کسی ایک آدھ آدمی کی رائے سے نہیں ہوئی۔ پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی قرآن کریم سے نئے نسخے لکھوائے تو اس وقت بھی نقل کے اہتمام میں بہت سے صحابہ شامل تھے۔ علاوہ ازیں کسی صحابی سے کوئی روایت نہیں پائی جاتی کہ یہ قرآن کا جزو ہیں اور مصحف عثمانی میں یہ نقص رہ گیا ہے کہ ان کو داخل نہیں کیا گیا۔ بلکہ اگر ابی رضی اللہ عنہ کا کوئی اختلاف تھا تو انہوں نے خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ انہی نقلوں کے اہتمام میں شامل ہو کر اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔ کیونکہ کہیں سے ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہو کہ یہ فقرے بھی مصحف کے اندر لکھنے چاہئیں۔ اور بموجب ایسی ہی روایات کے آخر اپنا مصحف جلا کر حضرت عثمان کے مصحف کی صحت کو قبول کر لیا۔ میں نہیں سمجھتا اس سے بڑھ کر اور واضح تر شہادت قرآن کریم کی صحت کی کیا ہو سکتی ہے۔

❀ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اختلاف

اختلافِ قرآن کے سوال کو میں بالفعل چھوڑتا ہوں کیونکہ یہ مضمون لمبا ہے اور الگ عنوان کے نیچے اس پر آگے بحث آتی ہے۔ اب ہم ان اختلافات پر غور کرتے ہیں جو ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ معوذتین کو اپنے مصحف میں نہ لکھتے تھے۔ اس کے متعلق بخاری میں حسب ذیل حدیث کتاب تفسیر میں آئی ہے:

((عَنْ زِرٍّ قَالَ: سَأَلْتُ أُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ، قُلْتُ: يَا أَبَا الْمُنْذِرِ! إِنَّ أَخَاكَ ابْنَ مَسْعُودٍ يَقُولُ كَذَا وَكَذَا؟ فَقَالَ أُبَيٌّ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ فَقَالَ لِي: قِيلَ لِي. فَقُلْتُ، قَالَ: فَنَحْنُ نَقُولُ كَمَا قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ.))[1]

اور اسی کی دوسری روایت یوں ہے:

((عَنْ زِرِّ بْنِ حُبَيْشٍ قَالَ: سَأَلْتُ أُبَيَّ بْنَ كَعْبٍ عَنِ الْمُعَوِّذَتَيْنِ، فَقَالَ: سَأَلْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ

1- صحيح البخاري: 4977

فَقَالَ: قِيلَ لِي: فَقُلْتُ: فَنَحْنُ نَقُولُ كَمَا قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ.))[1]

اس روایت کے الفاظ میں کچھ ابہام ہے۔ ترجمہ اس کا یوں ہے کہ

''زر کہتے ہیں کہ میں نے ابی بن کعب سے پوچھا کہ ابن مسعود معوذتین کے بارے میں ایسا ایسا کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا مجھے ایسا ہی کہا گیا ہے سو میں نے بتادیا۔ انہوں نے کہا پس ہم وہی کہتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے کہا''۔

اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کے بارہ میں کیا کہتے تھے۔ آیا واقعی اپنے مصحف میں نہ لکھتے تھے تو کس وجہ پر۔ کیونکہ ممکن ہے وہ اسے کلام الٰہی سمجھتے ہوں مگر یہ کہتے ہوں کہ ان کا لکھنا قرآن شریف میں ثابت نہیں یا اور کچھ کہتے ہوں۔ بہر حال حدیث کے الفاظ میں تصریح نہیں۔ ہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواب ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے یہ دیا کہ انہوں نے خود رسول اللہ ﷺ سے معوذتین کے متعلق دریافت کیا تھا۔ اور آنحضرت ﷺ کا جواب کیا تھا یہ اسی سے معلوم ہو جائے گا کہ ابی ان سورتوں کو قرآن شریف کا جزو سمجھتے اور مصحف میں لکھتے تھے۔ پس یہی جواب ان کو آنحضرت ﷺ کی طرف سے ملا تھا۔ ظاہر الفاظ حدیث کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''مجھے یہ دونوں سورتیں اسی طرح وحی کی گئی ہیں۔ پس میں نے اس وحی کو لوگوں تک پہنچادیا۔''

مگر بعض دوسری روایات سے جو کم پایہ کی ہیں یعنی بلحاظ اعتبار کے وہ اس قابل نہیں کہ ہم ان کی صحت پر وثوق کر سکیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے مصحف میں ان سورتوں کو لکھتے نہ تھے۔ چنانچہ ایک روایت احمد کی ہے:

((إِنَّ ابْنَ مَسْعُودٍ كَانَ لَا يَكْتُبُ الْمُعَوِّذَتَيْنِ فِي مُصْحَفِهِ))[2]

اور ایک روایت ان الفاظ میں ہے:

((كَانَ عَبْدُ اللهِ يَحُكُّ الْمُعَوِّذَتَيْنِ مِنْ مَصَاحِفِهِ وَيَقُولُ إِنَّهُمَا لَيْسَتَا مِنْ كِتَابِ اللهِ))[3]

یعنی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کو اپنے مصاحف سے کھرچ ڈالتے تھے اور کہتے تھے کہ ''وہ کتاب اللہ میں سے نہیں ہیں۔''

خود اتقان میں نووی اور ابن حزم کی شہادت موجود ہے کہ یہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر جھوٹ ہے۔ لیکن اگر یہ روایت صحیح ہے تو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن مسعود کا یہ خیال بعد کا تھا۔ کیونکہ وہ لکھے ہوئے کو کھرچتے تھے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ فعل ان کا کسی علم کی بنا پر نہ تھا بلکہ اجتہاد کی بنا پر تھا۔ بہر حال کسی دوسرے صحابی نے ان کے اس فعل کی تائید نہیں کی۔ جیسا کہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے:

((قَالَ الْبَزَّارُ: وَلَمْ يُتَابِعِ ابْنَ مَسْعُوْدٍ عَلَىٰ ذٰلِكَ اَحَدٌ مِنَ الصَّحَابَةِ وَقَدْ صَحَّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهُ قَرَأَهُمَا فِي الصَّلَاةِ.))[4]

بزاز کہتے ہیں کہ ''ایک بھی صحابی نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس بات میں پیروی نہیں کی اور آنحضرت ﷺ سے یہ صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ نے معوذتین کو نماز میں پڑھا''۔

صرف اسی قدر نہیں کہ دوسرے صحابہ نے ابن مسعود کی بات کی تائید نہیں کی بلکہ خود ابی نے ہی ان کی مخالفت کی اور اپنے علم کی بنا

1- صحيح البخاري: 4976؛ مسند الإمام أحمد: 21182؛ شعب الإيمان للبيهقي: 2325

2- مصنف ابن أبي شيبة: 30828؛ مسند الإمام أحمد: 21186؛ قال الشيخ شعيب الأرنؤوط: حسن صحيح.

3- مسند الإمام أحمد: 21226؛ وقال الشيخ الأرنؤوط: صحيح.

4- مسند البزار: 1586؛ فتح الباري: 742/8

پر یہ فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو جزو قرآن ہی بتایا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ دو ہی آدمی ایسے بتائے جاتے ہیں جن کے مصاحف میں کسی اختلاف کا ذکر بعض روایات میں موجود ہے۔ اور وہ دونوں ایسے ہیں کہ جو نہ صرف ایک دوسرے کی تائید نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ان کی رائے سب صحابہ کی رائے کے موافق ہے اور صحف عثمانی کو صحیح قرار دیتی ہے۔

اُبی دعائے قنوت کو قرآن میں لکھتے ہیں تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ باقی صحابہ کے ساتھ انہیں غلطی پر قرار دیتے ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کو قرآن میں نہیں لکھتے تو ابی رضی اللہ عنہ دوسرے صحابہ کے ساتھ انہیں غلطی پر قرار دیتے ہیں۔ پس ایک اکیلے آدمی کی رائے ہزارہا آدمیوں کی متفقہ شہادت کے خلاف جو علم کی بناپر مبنی ہے کیا وقعت رکھتی ہے۔

❀ معوذتین جزو قرآن ہیں

بہت سی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرت سے صحابہ صحیح علم اس بات کا رکھتے تھے کہ معوذتین قرآن کریم کا حصہ ہیں۔ اور یہ علم ان کا بلاواسطہ آنحضرت ﷺ سے تھا۔ ابی رضی اللہ عنہ کی شہادت کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور بھی بہت سے صحابیوں سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کئی بار ان سورتوں کو نماز میں پڑھا۔ دعائیہ جملوں کے طور پر نہیں بلکہ قراءت کے طور پر۔ یعنی بجائے کوئی اور حصہ قرآن کا پڑھنے کے انہی سورتوں کو پڑھا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جو دعائیہ جملے آنحضرت ﷺ نماز میں پڑھا کرتے تھے جیسے دعائے قنوت وہ قراءت کی بجائے نہ ہوتے تھے مگر معوذتین کو قراءت کے طور پر پڑھا اور یہی صحابہ کو سکھایا۔ چنانچہ کئی صحابیوں کی شہادت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود ان کو ہدایت فرمائی کہ ان کو نماز میں پڑھا کرو۔ ایک صحابی سے روایت ہے:

((اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اَقْرَاَهُ الْمُعَوَّذَتَيْنِ وَقَالَ لَه: «اِذَا اَنْتَ صَلَّيْتَ فَاقْرَأْ بِهِمَا».))[1]

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو کیا غلطی لگی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ یہ دونوں سورتیں (قل اعوذ برب) سے شروع ہوتی ہیں۔ دوسری طرف قرآن شریف میں یہ حکم ہے کہ:

﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾ [النحل: 98]

یعنی ''جب تو قرآن شریف پڑھے تو اللہ کے نام کے ساتھ پناہ مانگ۔''

ادھر ان دونوں سورتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کس طرح پناہ مانگنی چاہیے۔ ابن مسعود نے یہ خیال کیا کہ اس کلام میں صرف وہ طریق سکھلایا گیا ہے جس طرح پناہ مانگنی چاہیے۔ یہ خیال ہی خیال نہیں بلکہ ایک روایت میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ موجود ہیں: [اِنَّمَا اَمَرَ النَّبِيُّ ﷺ اَنْ يُتَعَوَّذَ بِهِمَا][2] ''یعنی آنحضرت ﷺ نے یہ حکم دیا تھا کہ ان کے ساتھ پناہ مانگی جائے۔

جس سے انہوں نے یہ خیال کر لیا کہ یہ قرآن کریم کا جزو نہیں۔ بلکہ آنحضرت ﷺ نے پناہ مانگنے کا طریق سکھایا ہے۔ حالانکہ آنحضرت ﷺ کے اس حکم کا کہ ان کے ساتھ پناہ مانگی جائے یہ نتیجہ نہیں نکلتا تھا کہ وہ اللہ کا کلام یعنی جزو قرآن نہیں ہیں۔ اس سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی غلطی کا صاف پتہ لگتا ہے۔ قاضی ابو بکر باقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس فعل کی تشریح یوں کی ہے اور اسی کی تائید قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کی ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کے جزو قرآن ہونے سے انکار نہیں کیا۔ بلکہ صرف یہی کہا ہے کہ ان کو قرآن کریم کے اندر نہ لکھا جائے۔ جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ انہیں آنحضرت ﷺ سے ان کا لکھنا ثابت نہ ہوا ہو خواہ کچھ ہی صورت

1- مسند الإمام أحمد: 20284؛ قال الشيخ الأرنؤوط: صحيح، رجاله رجال الشيخين.

2- مسند البزار: 1586؛ فتح الباري: 742/8

ہو۔اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس خیال کی ایک بھی صحابی نے تائید نہیں کی اور اس لیے چونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی متفقہ شہادت اس کی رائے کے خلاف ہے اس لیے تاریخی طور پر بھی ہمیں اس کے خیال کو قطعاً غلط ٹھہرانا پڑتا ہے اور یہ اعتراض کہ وہ فاتحہ کو بھی اپنے مصحف میں نہ لکھتے تھے اس سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ کیونکہ کسی معتبر روایت سے اس کا کچھ بھی پتہ نہیں لگتا۔ صرف چوتھے طبقہ کی روایات ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا۔ ایک روایت اس کو بیان کرتی ہے جس کا ذکر جلال الدین سیوطی نے اتقان میں کیا ہے۔ اس روایت میں جو واقعہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اگر وہ صحیح ہے تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سورۂ فاتحہ کو تمام قرآن کے لیے بطور خلاصہ سمجھا جاتا تھا۔ شاید اسی وجہ پر انہوں نے قرآن کے اندر اسے نہ لکھا ہو۔ یا وہ سمجھتے ہوں کہ جس طرح معوذتین صرف قرآن کے ختم کرنے کے لیے ہیں فاتحہ اس کے شروع کرنے کے لیے ہے۔ اور انہیں قرآن کے اندر لکھنے کی ضرورت نہیں۔ بہر حال ایک آدمی کے محض خیال کو ہزارہا آدمیوں کی متفقہ شہادت کے خلاف جو وزن دیا جا سکتا ہے وہی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی باتوں کو صحابہ کے اتفاق کے مقابل دینا ہو گا۔

❀ جمع زید رضی اللہ عنہ میں کمی بیشی کے امکان کا خیال خلاف واقعات ہے

تیسرا اعتراض صرف ایک وہم ہی وہم ہے۔ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا تھا اسی کے مطابق آپ کاتبان وحی سے لکھواتے اور اسی کے مطابق حافظان قرآن حفظ کرتے۔ اگر جمع قرآن صرف تنہا زید رضی اللہ عنہ کا ہی کام ہوتا اور اس میں دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم ان کے معاون نہ ہوتے تو ایسے شکوک کے لیے جگہ مل سکتی تھی کہ ممکن ہے زید رضی اللہ عنہ سے بعض فقرات رہ گئے ہوں۔ یا بعض فقرات ایسے انہوں نے درج کر دیئے ہوں جن کو قرآن کریم میں شامل کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا نہ تھا۔ لیکن جیسا کہ بہت سی روایات کی متفقہ شہادت سے جو مختلف سلسلہ رواۃ سے ہم کو پہنچی ہیں ثابت ہوتا ہے زید کے معاون جمع قرآن کے کام میں کل صحابہ رضی اللہ عنہ تھے۔ جنہوں نے قرآن شریف کو لکھا ہوا تھا۔ وہ اپنے اپنے لکھے ہوئے کاغذ لے کر حاضر ہوئے اور جنہوں نے حفظ کیا ہوا تھا ان کے حافظوں سے مدد لی گئی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں بھی صحابہ رضی اللہ عنہ کا جمع قرآن کے کام میں زید کے ساتھ شامل ہونا ثابت ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت میں جب نسخے لکھے گئے اس وقت بھی دیگر صحابہ کا زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ شامل ہونا ثابت ہے۔ پس اس صورت میں جبکہ ابھی بہت سے لوگ ان صحابہ میں سے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرآن شریف کو حفظ کر لیا تھا زندہ تھے۔ یہ بالکل ناممکن تھا کہ کچھ فقرات جو اصل میں قرآن شریف میں شامل تھے غلطی سے شامل ہونے سے رہ جاتے یا بعض فقرات ایسے شامل ہو جاتے جن کے شامل کرنے کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں دیا تھا۔ کیا ایسی غلطی کا ارتکاب اکیلے آدمی سے ہو سکتا تھا؟

مگر جہاں ایک طرف حفاظ موجود ہوں دوسری طرف کل کی کل تحریریں اکٹھی کی گئی ہوں اور پھر وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جو دن رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنتے تھے وہ موجود ہوں وہاں ایسی غلطی کا ارتکاب ناممکن ہے۔ کیونکہ جو غلطی ایک شخص کرتا اس کی اصلاح دوسرے کر سکتے تھے۔ ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ ایک آدھ صحابی سے کوئی غلطی ہو سکتی تھی بلکہ ہم اس بات کو لکھ چکے ہیں کہ اگر ابی رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مصاحف والی روایتیں درست ہیں تو ان بزرگوں سے بعض غلطیاں ہو جانے کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے اپنی ہی رائے کے مطابق سب کام کیا۔ مگر ہم جس بات پر زور دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ زید رضی اللہ عنہ کی جمع اور پھر نسخ مصاحف کے وقت ایسی امکانی غلطیوں کی اصلاح کے اتنے بڑے ذرائع موجود تھے کہ غلطی کا امکان بھی باقی نہیں رہتا۔ چہ جائیکہ اس کا وقوع ثابت ہو۔

سیدنا زید رضی اللہ عنہ نے بڑی محنت سے قرآن شریف کو جمع کیا جو کامل سورتیں نازل ہوئی تھیں ان کو سورت، سورت کر کے جمع کیا اور جہاں متفرق آیتیں نازل ہوئی تھیں، ایک ایک آیت کر کے انہیں تلاش کیا اور پھر ان تمام تحریروں پر تائیدی شہادت حافظان قرآن کی

موجود تھی۔ اگر خالی تحریر کا ہی اعتبار کیا جاتا تو کہا جا سکتا تھا کہ کوئی آیت رہ گئی ہو گی۔ مگر وہاں حافظ بھی سب جمع تھے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو سارا قرآن شریف آنحضرت ﷺ کی زندگی میں اور آپ کے سامنے حفظ کر چکے تھے۔ اور اس لیے زید رضی اللہ عنہ خوب جانتے تھے کہ کس حصہ یا کس آیت کی تلاش ابھی کرنی چاہیے۔ چنانچہ جمع قرآن کے بارہ میں جو حدیث آئی ہے اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہاں زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں فلاں آیت کو میں نے تلاش کیا یہاں تک کہ اسے فلاں شخص کے پاس پایا۔ یعنی آیت کا علم تھا اور تحریر کو تلاش کیا یہاں تک کہ تحریر بھی مل گئی۔

پھر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ایک یا دو حافظوں پر ہی اعتبار نہیں کیا۔ بلکہ کل کے کل کو جمع کیا۔ ممکن تھا کہ ایک حافظ سے کہیں غلطی ہو جائے مگر اس کی اصلاح دوسرے فی الفور کر سکتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ایسی غلطی کی اصلاح کا دوسرا ذریعہ تحریر تھی۔ کیونکہ ہر ایک آیت بعد نزول فی الفور ضبط تحریر میں بھی لائی جاتی تھی۔ یہ ایسا پختہ انتظام تھا کہ کسی غلطی کے امکان کو باقی نہیں چھوڑتا۔ کیونکہ باوجود ایک قسم کی قطعی شہادت کے موجود ہونے کے زید مطمئن نہ ہوتے تھے۔ جب تک کہ دوسری قسم کی شہادت نہ مل جائے۔ حافظہ کی تائید تحریر سے اور تحریر کی تائید حافظہ سے ہوتی تھی۔ اسی دوسری شہادت کی طرف حدیث جمع قرآن میں زید رضی اللہ عنہ اشارہ کرتے ہیں۔ جب وہ یہ فرماتے ہیں کہ میں تحریروں اور آدمیوں کے سینوں سے قرآن شریف کو اکٹھا کرنے لگا۔ باقی رہا ناسخ منسوخ کا سوال۔ اس کے جواب میں اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ اگر ہم اس بات کو فرض بھی کر لیں کہ کوئی آیت کبھی منسوخ کی گئی تو صحابہ اس سے بے خبر نہ ہو سکتے تھے۔ کیونکہ جس چیز کو آپ نے منسوخ کرنا ضروری سمجھا ہو اس کا اعلان اور اس کی اشاعت بھی اسی طرح کی ہو گی جس طرح کسی آیت کے نزول کی۔ لیکن کسی آیت کے متعلق تمام ذخیرہ احادیث میں ایک لفظ تک بھی موجود نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اسے منسوخ کیا ہو۔

❀ قرآن میں نہ کچھ بڑھایا گیا نہ کچھ گھٹایا گیا

اب ہم چوتھے اعتراض کی طرف آتے ہیں جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ بعض روایات میں اب تک قرآن کریم کے وہ فقرات محفوظ ہیں جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت میں شامل نہیں کیے گئے۔ حالانکہ وہ آنحضرت ﷺ کے وقت میں جزو قرآن سمجھے جاتے اور قرآن شریف میں پڑھے جاتے تھے۔

در حقیقت یہی اعتراض سب سے بڑا اعتراض ہے اور اس پر کسی قدر مفصل بحث درکار ہو گی۔ ہم اس بات سے تو انکار نہیں کرتے کہ ایسی روایات موجود ہیں۔ مگر یہ کہتے ہیں کہ وہ قابل اعتبار ہر گز نہیں۔ ہاں بعض مقامات پر بعض الفاظ کے معنوں کی غلط فہمی کی وجہ سے بھی اعتراض پیدا ہوئے ہیں۔ قبل اس کے کہ ان روایات پر ہم ایک ایک کر کے بحث کریں چند عام باتیں کرتے ہیں جو امید ہے کہ ناظرین کو اصل بحث کے سمجھنے میں مدد دیں گی۔ قرآن کریم کی حفاظت کو ثابت کرنے کے لیے ہمیں دو باتیں ثابت کرنی ہیں۔ اول یہ کہ قرآن شریف میں کوئی لفظ یا فقرہ بڑھایا نہیں گیا۔ اور دوم یہ کہ اصل میں سے کچھ چھوڑا نہیں گیا۔ جو موجودہ قرآن میں نہ ہو۔ ان میں سے امر اول کے متعلق یہ بات ثابت ہے کہ کوئی روایت معتبر یا غیر معتبر اصلی یا غیر اصلی ایسی نہیں پائی جاتی جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہو کہ فلاں آیت یا الفاظ جو اس وقت قرآن شریف میں پڑھے جاتے ہیں آنحضرت ﷺ کے وقت میں نہ پڑھے جاتے تھے۔ سوائے اس ایک روایت کے جس میں یہ ذکر ہے کہ ابن مسعود معوذتین کو مصحف کے اندر نہ لکھتے تھے یا لکھے ہوئے کو کھرچتے تھے۔ اس پر بحث گزر چکی ہے اور میں دکھا چکا ہوں کہ یہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی صریح غلطی تھی۔ وہ اکیلے اس خیال میں پڑ گئے تھے۔ حالانکہ سارے کے سارے صحابی حتیٰ کہ ابی بھی اس میں ان کی مخالفت کرتے تھے۔ غلطی کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ معوذتین صرف تعوذ کے لیے ہیں اور ان کو قرآن شریف کے خاتمہ پر پڑھ لینا چاہیے۔ قرآن شریف کے اندر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے

خیال کیا کہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ جس سے ہر ایک سورہ قرآن شریف کی شروع ہوتی ہے وہ صرف افتتاح کے لیے ہے جزو سورت نہیں۔

ایسا ہی خیال معوذتین کے متعلق ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اکیلے شخص کا خیال جو وہ بھی صریح طور پر واقعات کی غلط فہمی پر مبنی ہے تمام صحابہ کی متفقہ شہادت کے بالمقابل کیا وقعت رکھ سکتا ہے۔ درآنحالیکہ ان کی شہادت کی بنیاد قطعی اور یقینی علم پر تھی نہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرح محض ایک خیال یا اجتہاد پر۔ اس ایک روایت کے سوائے اور کوئی روایت ایسی نہیں جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہو کہ فلاں آیت یا سورۃ قرآن کریم میں شامل نہ تھی اور اس امر کی تو قطعاً کوئی شہادت نہیں کہ زید رضی اللہ عنہ یا عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے کوئی آیت یا سورۃ ملادی تھی۔

اب جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرآن شریف میں کچھ بڑھایا نہیں گیا تو دوسری بات کا ثابت ہونا کہ اس میں کچھ گھٹایا نہیں گیا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پہلے امر کا ثبوت بھی اس دوسرے امر کے ثبوت کا مد ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ نہ بڑھانے کے وجوہات کیا ہوئے؟ اگر قرآن شریف ایسی بے احتیاطی سے جمع کیا جاتا جیسا کہ مخالفین خیال کرتے ہیں کہ اس میں سے سورتوں کی سورتیں یا آیتیں رہ گئیں تو پھر اس بے احتیاطی کا اثر دوسرے پہلو پر بھی ہونا چاہیے جیسا کہ کچھ گھٹایا گیا تھا کچھ بڑھا بھی دیا جاتا تھا۔ یا جیسے کچھ حصص رہ گئے تھے کچھ اور بھی داخل ہو جاتے کیونکہ دونوں طرف یکساں ہی اثر ہونا چاہیے تھا۔ مگر چونکہ قرآن شریف میں بڑھ جانے کی شہادت کسی کمزور روایت سے بھی نہیں ملتی اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اعلیٰ درجہ کی احتیاط اور تحقیق سے جمع کا کام کیا۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ جس احتیاط اور تحقیق نے قرآن شریف میں کچھ زیادتی ہو جانے سے اس کلام پاک کو محفوظ رکھا وہی اس میں سے کم ہو جانے سے بھی اس کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ بن گئی۔ اور اصل بات یہی ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ اعلیٰ درجہ کی تحقیق کو کام میں لائے اور سامان حفاظت بھی سارے موجود تھے۔ یعنی ایک طرف حافظان قرآن جن کو قرآن شریف کا ایک ایک حرف حفظ تھا اور دوسری طرف اصلی تحریریں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی تھیں۔ پس ایک طرف سامان حفاظت کا پورا پورا موجود ہونا اور دوسری طرف حضرت زید رضی اللہ عنہ کی اس قدر احتیاط۔ یہی وہ وجوہات تھیں تھے کہ جن کی وجہ سے قرآن کریم میں نہ کوئی زیادتی ہوئی اور نہ ہی کوئی کمی ہوئی۔

❀ نتائج کی بنیاد احادیث کی مجموعی شہادت پر رکھی جاسکتی ہے

دوسری بات جس کو میں خصوصیت سے بیان کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ حدیثوں سے استدلال کا طریق جو یورپین مصنف اختیار کر رہے ہیں بالکل غلط ہے۔ یہ غلطی بعض مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ عموماً اپنے نتائج کی بنیاد حدیث کی مجموعی شہادت پر نہیں رکھتے۔ بلکہ جہاں اعتراض کرنے کی غرض ہو یا پہلے دل میں کوئی خیال بیٹھا ہوا ہو تو ایک کمزور سے کمزور روایت بلکہ بعض وقت وضعی حدیث کو بنیاد ٹھہرا کر اس پر ایک عمارت کھڑی کر دیتے ہیں۔ خواہ اس حدیث کے خلاف معتبر احادیث میں کتنی ہی وزنی شہادت کیوں موجود نہ ہو۔ اور خواہ وہ نتیجہ جو نکالا گیا ہے حدیث کی مجموعی شہادت کی رو سے کتنا ہی لغو ثابت ہوتا ہو۔

اب جو ذخیرہ احادیث کا ہمارے سامنے موجود ہے اس میں ہر ایک قسم کی روایات شامل ہیں اور محدثین نے شاقہ محنتوں کے ساتھ معتبر اور غیر معتبر روایات کو الگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے ایک محقق یا ناقد کے لیے یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ روایات کے ملے جلے ذخیرہ میں سے ایک روایت لے کر جو نتیجہ اس سے نکل سکے نکال لے۔ بلکہ ایسا نتیجہ نکالنے سے پہلے اس کو کئی امور پر غور کرنا چاہیے۔ احادیث کے مجموعوں میں سے وہ مجموعہ جو امام بخاری نے جمع کیا اور جو صحیح بخاری کے نام سے موسوم ہے سب سے زیادہ معتبر ہے اور جہاں احادیث سے متضاد شہادت ملتی ہے یعنی بعض احادیث کی شہادت بعض کے مخالف ہو تو مامون طریق ایسی صورت میں یہ ہے کہ بخاری

شریف کو مقدم کیا جائے۔ کیونکہ خود امت کا اجماع اس بات پر ہو گیا ہے کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری شریف ہے۔ پس احادیث سے شہادت لیتے وقت پہلا قاعدہ جو ایک محقق یا ناقد کو مد نظر رکھنا چاہیے یہ ہے کہ معتبر اور غیر معتبر احادیث میں فرق کیا جائے۔ بغیر اس قاعدہ کو مد نظر رکھنے کے ہم صحیح نتیجہ تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔

اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں ہم صرف اس صورت کا ذکر کر رہے ہیں جب بعض احادیث سے بعض کے مخالف شہادت پیدا ہوتی ہو۔ لیکن جہاں حدیث کا اختلاف قرآن سے ہو تو ایسی صورت میں حدیث کو رد کرنا پڑے گا۔ خواہ وہ کسی قسم کی ہو۔ دوسرا قاعدہ جو احادیث کی شہادت کو وزن کرتے وقت مد نظر رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ جب احادیث ایک سی ہی معتبر یا غیر معتبر ہوں تو دیکھنا چاہیے کہ زیادہ شہادت کس طرف ہے۔ مگر سب سے ضروری اور یقینی معیار یہ ہے کہ عملی تواتر کس بات کو صحیح ٹھہراتا ہے۔

❀ وہ روایات جن میں یہ ذکر ہے کہ فلاں سورت یا آیت قرآن میں تھی اب نہیں ہے

اب ہم ان تینوں معیاروں کی رو سے ان احادیث کو پرکھیں گے جو حفاظت قرآن کریم کے سوال کے متعلق ہیں۔ لیکن اسے پہلے ان احادیث کا بیان کرنا ضروری ہے جن پر اعتراضوں کی بنا رکھی گئی ہے۔ ان احادیث کو میں تاویل القرآن سے لیتا ہوں۔ جو سخت معاندانہ رنگ میں لکھی گئی ہے اور جس کے مصنف نے ایسی احادیث کے جمع کرنے میں سخت محنت اٹھائی ہے۔ اگرچہ اوپر میں نے یہ کہا تھا کہ ہم اس کتاب کے مجنونانہ دعووں کی طرف کوئی توجہ نہ کریں گے لیکن تاہم اس مضمون میں ان تمام باتوں کا جواب دے دیا گیا ہے یاد یا جائے گا۔ جن کی بنا ایسے امور پر ہے جو روایات کی شہادت سے پیدا ہوں۔ خواہ ایسی روایت معتبر ہوں یا غیر معتبر روایات پیش کردہ یہ ہیں۔

① صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ میں ابوالاسود سے یہ روایت ہے کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بصرہ میں حسب ذیل الفاظ قراء کی ایک جماعت کے سامنے بیان کیے:

((وَإِنَّا كُنَّا نَقْرَأُ سُورَةً كُنَّا نُشَبِّهُهَا فِي الطُّولِ وَالشِّدَّةِ بِبَرَاءَةَ فَأُنْسِيتُهَا غَيْرَ أَنِّي قَدْ حَفِظْتُ: مِنْهَا لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ -لَابْتَغَى وَادِيًا ثَالِثًا- وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ. وَكُنَّا نَقْرَأُ سُورَةً كُنَّا نُشَبِّهُهَا بِإِحْدَى الْمُسَبِّحَاتِ فَأُنْسِيتُهَا غَيْرَ أَنِّي حَفِظْتُ مِنْهَا: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝٢﴾ فَتُكْتَبُ شَهَادَةً فِي أَعْنَاقِكُمْ فَتُسْأَلُونَ عَنْهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ.))[1]

② مسلم (کِتَابُ الرِضَاعِ) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حسب ذیل روایت ہے:

((عَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا قَالَتْ: كَانَ فِيمَا أُنْزِلَ مِنَ الْقُرْآنِ عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَعْلُومَاتٍ يُحَرِّمْنَ. ثُمَّ نُسِخْنَ بِخَمْسٍ مَعْلُومَاتٍ فَتُوُفِّيَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَهُنَّ فِيمَا يُقْرَأُ مِنَ الْقُرْآنِ.))[2]

③ مسلم [کِتَابُ الْحُدُوْدِ] میں حسب ذیل روایت ہے:

((عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ يَقُولُ: قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَهُوَ جَالِسٌ عَلَى مِنْبَرِ رَسُولِ اللهِ ﷺ: إِنَّ اللهَ قَدْ بَعَثَ مُحَمَّدًا ﷺ بِالْحَقِّ وَأَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ، فَكَانَ مِمَّا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةُ الرَّجْمِ قَرَأْنَاهَا وَوَعَيْنَاهَا وَعَقَلْنَاهَا، فَرَجَمَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَرَجَمْنَا بَعْدَهُ فَأَخْشَى إِنْ طَالَ بِالنَّاسِ زَمَانٌ أَنْ يَقُولَ: قَائِلٌ مَا نَجِدُ الرَّجْمَ فِي كِتَابِ اللهِ فَيَضِلُّوا بِتَرْكِ فَرِيضَةٍ أَنْزَلَهَا اللهُ وَإِنَّ الرَّجْمَ فِي كِتَابِ اللهِ حَقٌّ

1- صحيح مسلم: 2466؛ المسند المستخرج على صحيح مسلم: 42

2- صحيح مسلم: 3670؛ جامع الترمذي: 1550؛ سنن النسائي: 3307؛ سنن ابن ماجه:1941؛ قال الشيخ الألباني: صحيح.

عَلَىٰ مَنْ زَنَىٰ إِذَا أَحْصَنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ إِذَا قَامَتِ الْبَيِّنَةُ أَوْ كَانَ الْحَبَلُ أَوْ الِاعْتِرَافُ.))[1]

اور ایسا ہی سنن ابی داؤد [كتاب الحدود باب الرجم] میں یہ روایت ہے:

((عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ اِنَّ عُمَرَ يَعْنِيْ ابْنَ الْخَطَّابِ خَطَبَ فَقَالَ: "فَالرَّجْمُ حَقٌّ عَلَىٰ مَنْ زَنَا مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ اِذَا كَانَ مُحْصِنًا اِذَا قَامَتِ الْبَيِّنَةُ اَوْ كَانَ حَمْلٌ اَوِ الْاِعْتِرَافُ وَاَيْمُ اللهِ لَوْلَا اَنْ يَّقُوْلَ النَّاسُ زَادَ عُمَرُ فِيْ كِتَابِ اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ لَكَتَبْتُهَا".))

④ ((عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَتْ سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ تُقْرَأُ فِيْ زَمَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِائَةَ اٰيَاتٍ فَلَمَّا كَتَبَ عُثْمَانُ الْمَصَاحِفَ لَمْ نَقْدِرْ مِنْهَا اِلَّا مَا هُوَ الْآنُ.))[2]

⑤ ((عَنْ مَالِكٍ اِنَّ اَوَّلَهَا لَمَّا سُقِطَ سُقِطَ مَعَهُ الْبَسْمَلَةُ فَقَدْ ثَبَتَ اَنَّهَا كَانَتْ تَعْدِلُ الْبَقَرَةَ طُوْلُهَا وَفِيْ مُصْحَفِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ مِائَةَ وَاِثْنَتَا عَشْرَةَ سُوْرَةً لِاَنَّهُ لَمْ يَكْتُبِ الْمُعَوَّذَتَيْنِ وَفِيْ مُصْحَفِ اُبَيٍّ سِتَّةٌ لِاَنَّهُ كَتَبَ فِيْ اٰخِرِ سُوْرَةِ الْحَفْدِ وَالْخُلْعِ.))[3]

❀ ان پانچ روایات کی تردید دوسری صحیح احادیث سے ہوتی ہے

یہ وہ پانچ روایات ہیں جن کی بناپر اعتراض کیا جاتا ہے کہ بعض آیات یا فقرے یا سورتیں جو آنحضرت ﷺ کے وقت میں قرآن شریف میں پڑھی جاتی تھیں اس وقت قرآن شریف میں موجود نہیں۔ اب پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا کوئی ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن سے ان روایات کی تردید ہوتی ہو۔ اگر ایسی روایات ملتی ہیں تو پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوگا کہ ان میں سے کون سی روایات زیادہ قابل اعتبار ہیں۔ شہادت کا وزن زیادہ تر کس طرف ہے اور عملی تواتر اور مسلمہ واقعات تاریخ کون سی روایت کو صحیح ٹھہراتی ہیں۔

جیسا کہ ہم اس مضمون کے پہلے حصوں میں دکھا چکے ہیں۔ ایسی معتبر روایات بہت کثرت سے ملتی ہیں جن سے ان روایات کے بیانات کی تردید ہوتی ہے۔ اس لیے اب ہم ان تین امور پر غور کریں گے جن کا ذکر ابھی ہوا۔ مگر قبل اس کے کہ ہم اس بحث کو چھیڑیں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ آخری دو روایتیں جو اتقان سے لی گئی ہیں اس قابل نہیں کہ ان پر کوئی توجہ کی جائے۔ کیونکہ جیسا کہ شاہ عبدالعزیز نے اپنے عجالہ نافعہ میں جو اصول علم حدیث پر لکھا گیا ہے یہ بتادیا ہے جلال الدین سیوطی کی تصانیف میں ایسی روایات پائی جاتی ہیں جن کا نام و نشان ابتدائی زمانہ میں نہیں ملتا اور اس لیے ایسی روایات کسی طرح قابل اعتبار نہیں۔ پس اگر ان روایات کی تردید معتبر روایات سے نہ بھی ہوتی ہو تو بھی یہ اس قابل نہیں کہ ان کی بناپر کوئی اعتراض کیا جائے۔ بلکہ وہ خود اپنی تردید کے لیے آپ ہی کافی ہیں۔

اس طرح پر اتقان کی دونوں روایتوں کے رد کرنے کے بعد مسلم کی تین روایتیں رہ جاتی ہیں۔ پس اصول اول کے متعلق جس کا ذکر اوپر ہوا ہے سب سے پہلے ہم بخاری کو دیکھیں گے کہ آیا اس میں ایسی روایت پائی جاتی ہے جو مسلم کی ان روایات کی تردید کرتی ہو۔ کیونکہ صحیح بخاری وہ کتاب ہے جس کو بالاجماع [أصح الكتاب بعد كتاب الله] مانا گیا ہے۔ اور مسلم یا کسی دوسری کتاب کو ایسا مرتبہ حاصل نہیں۔ پس اگر مسلم کی کوئی روایت یا کسی اور کتاب کی روایت بخاری کی تردید کرتی ہو تو ہمیں ایسی روایت کو رد کرنا پڑے گا۔ لیکن ان روایات کی شہادت کی تردید نہ صرف بخاری سے ہی ہوتی ہے۔ بلکہ خود انہی کتابوں یعنی مسلم وغیرہ میں کثرت سے ایسی روایات پائی جاتی ہیں جو ان تینوں روایتوں کی تردید کرتی ہیں۔ چونکہ حفاظت قرآن کے مضمون میں ہم نے ان احادیث کا مفصل ذکر اپنی اپنی جگہ

1- صحيح البخاري: 6829؛ صحيح مسلم: 4513

2- الإتقان: 30/2

3- الإتقان: 68/1

کرتے آئے ہیں اور انہی کی بناپر ہم نے یہ قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ قرآن کریم آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے لے کر آج تک محفوظ چلا آیا ہے۔ اور اس میں کوئی کمی بیشی یا تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ لہٰذا ان احادیث کے اعادہ کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔

❀ حدیث ابو موسیٰ کے راویوں پر بحث

اب ہم ان تینوں کو ایک ایک کر کے لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہ کہاں تک قابل اعتبار ہیں۔ پہلی روایت میں ابو موسیٰ اشعری کے خطبہ کا ذکر ہے جو اس نے قراء بصرہ کے سامنے دیا اور جس کا ماحصل یہ ہے کہ وہ یعنی ابو موسیٰ اور آنحضرت ﷺ کے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم دو سورتیں پڑھا کرتے تھے جن میں سے صرف ایک ایک فقرہ ہی اسے یاد رہ گیا اور پہلی سورتوں کے فقرہ کا مضمون یہ ہے کہ اگر ابن آدم کے لیے مال کی دو وادیاں ہوتیں تو وہ ایک تیسری وادی تلاش کرتا اور ابن آدم کے پیٹ کو سوائے مٹی کے کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ اور دوسری سورہ کے فقرہ کا یہ مضمون ہے کہ اے ایمان دارو تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ اس کی شہادت تمہارے خلاف لکھی جائے گی اور قیامت کے دن تم سے اس کے متعلق باز پرس کی جائے گی۔ خود مسلم سے جو بیرونی اور اندرونی شہادت اس روایت کے متعلق ملتی ہے وہ اس کو مردود ٹھہراتی ہے۔ بیرونی شہادت کے لیے سب سے پہلے اس کے سلسلہ رواۃ کو دیکھنا چاہیے۔ اس روایت کے راویوں کے سلسلہ میں سب سے پہلے سوید بن سعید ہے اور اس لیے سب سے پہلے ہم اسی کو لیتے ہیں کہ اس کی روایت کہاں تک قابل اعتبار ہو سکتی ہے۔ راویوں کی جرح پر ذہبی کی میزان الاعتدال سب سے زیادہ معتبر کتاب ہے۔ اس کتاب میں سوید بن سعید کے متعلق یہ لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے جن میں مسلم بھی ہیں اس کی روایت کو لیا ہے۔ لیکن اکثر نے اس کی روایت کو مردود سمجھا ہے۔ اور اس بات پر قریباً قریباً سب کا اتفاق ہے کہ وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا اور آخر کار اندھا ہو گیا۔ اور اس وقت وہ بعض ایسی روایتیں بیان کر دیتا تھا جو دراصل اس کی روایتیں نہ تھیں۔ امام بخاری کے اس کے متعلق یہ الفاظ ہیں [اِنَّهُ ضَعِيْفٌ جِدًّا]۔

ایسا ہی ایک واقعہ کا اس کتاب میں ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا میلان شیعہ مذہب کی طرف تھا۔ لکھا ہے کہ ایک شخص اس کے پاس کتاب الفضائل لایا تو اس نے علی رضی اللہ عنہ کو اول اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کو آخر کر دیا۔ بہت سے لوگوں نے اسے متروک الحدیث قرار دیا ہے اور بعض نے اس کو کذاب کہا ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ وہ متہم بالزندقہ ہے۔ یہ اس راوی کا حال ہے جس کے منہ سے مسلم نے اس حدیث کو لیا ہے اور جب اس کی نسبت اس قدر بے اعتباری کی شہادت ملتی ہے تو ہمیں ضرورت نہیں کہ اب ہم اس حدیث کے دوسرے راویوں پر غور کریں۔

❀ اس حدیث کے خلاف مسلم کی اپنی شہادت

ایک اور قسم کی خارجی شہادت خود مسلم سے ملتی ہے۔ جس سے روایت زیر بحث کی وقعت کچھ بھی نہیں رہتی۔ اس روایت سے پہلے خود مسلم نے اسی مضمون کی چار اور روایتیں نقل کی ہیں۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ سوید کی روایت سے جو الفاظ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں ان کے متعلق یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ قرآن شریف کی دو سورتوں کے ٹکڑے تھے۔ لیکن ان چاروں روایتوں میں اس بات کا نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ مسلم [كِتَابُ الزَّكٰوةِ بَابُ لَوْ اَنَّ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيَيْنِ لَابْتَغٰى ثَالِثًا] میں سب سے پہلی روایت یہ ہے:

((حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ يَحْيَى وَسَعِيدُ بْنُ مَنْصُورٍ وَقُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَ يَحْيَى: أَخْبَرَنَا وَقَالَ الآخَرَانِ: حَدَّثَنَا أَبُوعَوَانَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ

لاَبْتَغَى وَادِيًا ثَالِثًا وَلاَ يَمْلأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلاَّ التُّرَابُ وَيَتُوبُ اللهُ عَلَىٰ مَنْ تَابَ».))[1]

یعنی یحییٰ بن یحییٰ اور سعید بن منصور اور قتیبہ بن سعید ان تینوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت مسلم کو پہنچائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''اگر آدمی کے لیے دو وایاں بھی مال کی ہوتیں تو بھی وہ تیسری کی خواہش کرتا اور آدمی کے پیٹ کو سوائے مٹی کے کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ یعنی آخر موت سے ہی اس کی خواہشات اور حرص کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اور جو شخص خدا کی طرف رجوع کرتا ہے خدا بھی اس پر رجوع برحمت کرتا ہے۔''

اب اس روایت کے بموجب حضرت انس رضی اللہ عنہ یہ روایت کرتے ہیں کہ وہی لفظ یعنی [لَوْ كَانَ لاِبْنِ آدَمَ] آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائے تھے۔ اور ان کو قرآن کا جزو قرار نہیں دیا گیا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اب مسلم کی یہ دونوں روایتیں ایک دوسرے کے مخالف شہادت دیتی ہیں۔ یعنی ایک طرف توسوید کی روایت ہے جس کی روسے [لَوْ كَانَ لاِبْنِ آدَمَ] کو کسی بھولی ہوئی سورت کی آیت قرار دیا گیا ہے اور دوسری طرف یحییٰ بن یحییٰ اور سعید بن منصور اور قتیبہ بن سعید تینوں کی متفقہ روایت ہے۔ جس کی روسے انہی الفاظ کو قرآن شریف کا جزو نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے الفاظ قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ان دونوں روایتوں میں سے ہم زیادہ اعتبار کس پر کر سکتے ہیں۔ سوید کے متعلق جو رائے محدثین کی ہے اس کو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔

اب ان تینوں راویوں میں سے سعید بن منصور اور یحییٰ بن یحییٰ دونوں کو ذہبی نے میزان الاعتدال میں صریح الفاظ میں ثقہ بیان کیا ہے اور تیسرے یعنی قتیبہ بن سعید کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا حال کچھ معلوم نہیں۔ بہر حال اس حدیث کی شہادت پہلی حدیث سے بہت بڑھ کر وزنی ہے کیونکہ وہاں تو صرف ایک آدمی کی روایت ہے اور وہ بھی ایسا کہ جس کو اکثر محدثین نے ناقابل اعتبار اور ضعیف اور متروک الحدیث مانا ہے۔ اور بعض نے زندیق اور کذاب تک کہا۔ اور یہاں کم از کم دو ایسے راویوں کی شہادت ہے جن کو سب محدثین نے ثقہ تسلیم کیا ہے۔ اس لیے ہم آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس حدیث کی شہادت حدیث زیر بحث سے بہت زیادہ قابل اعتبار ہے۔ پس جب یہ حدیث قابل تسلیم ہے تو حدیث زیر بحث ضرور مردود ٹھہرتی ہے۔ پھر اس کے علاوہ تین اور حدیثیں اسی مضمون کی مسلم نے بیان کی ہیں اور ان سب میں ان الفاظ [لَوْ كَانَ لاِبْنِ آدَمَ] کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ کے الفاظ اور آپ کی حدیث قرار دیا گیا ہے اور کسی ایک میں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ وہ جزو قرآن تھے۔ ان تینوں میں سے ایک حدیث میں ابن عباس کی طرف جو اس کے پہلے راوی ہیں یہ الفاظ منسوب کیے گئے ہیں: [فَلَا اَدْرِیْ مِنَ الْقُرْاٰنِ هوَ اَمْ لَا][2] یعنی ''میں نہیں جانتا کہ یہ قرآن کا جزو ہیں یا نہیں۔'' مگر اس کے ساتھ ہی ایک دوسری روایت میں انہیں الفاظ [فَلَا اَدْرِیْ مِنَ الْقُرْاٰنِ] کے تعلق میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ذکر نہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی پچھلے راوی کے لفظ ہیں۔

ان تمام واقعات پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خود مسلم نے اس ایک روایت کے خلاف چار اور حدیثیں بیان کر کے اس کو ایک حد تک ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ اور کم از کم یہ تو ظاہر ہے کہ جب ایک ہی کتاب میں ہم پانچ روایتیں ایسی پاتے ہیں جن میں چار کی شہادت پانچویں کے مخالف ہے اور پھر ان چار روایتوں کو پانچویں روایت کی نسبت بلحاظ راویوں کے زیادہ قابل اعتبار بھی پاتے ہیں تو ان چار روایتوں کی شہادت کے بالمقابل پانچویں روایت کی شہادت کو رد کرنا پڑے گا۔ اس بارہ میں یہ امر بھی قابل تذکرہ ہے کہ خود مسلم نے ان چار روایتوں کو پہلے اور اس پانچویں روایت کو جو ان کے مخالف ہے سب سے اخیر بیان کر کے یہ جتا دیا ہے کہ یہ روایت ان کے مقابل بہت کم وزن رکھتی ہے۔ یہ صرف قیاس ہی قیاس نہیں بلکہ مسلم نے صحیح مسلم کے دیباچہ میں خود اس بات کو وضاحت سے بیان کیا ہے کہ

1- صحيح البخاري: 6436، 6437، 6438، 6439؛ صحيح مسلم: 2462، 2464

2- صحيح البخاري: 6437؛ صحيح مسلم: 2465

جن حدیثوں کو اس نے زیادہ قابل اعتبار سمجھا ہے ان کا ذکر بھی پہلے کیا ہے۔ اور جن حدیثوں کو کمزور سمجھا ہے ان کا ذکر بعد میں کیا ہے۔ چنانچہ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

((فَأَمَّا الْقِسْمُ الأَوَّلُ فَإِنَّا نَتَوَخَّى أَنْ نُقَدِّمَ الأَخْبَارَ الَّتِي هِيَ أَسْلَمُ مِنَ الْعُيُوبِ مِنْ غَيْرِهَا وَأَنْقَى مِنْ أَنْ يَكُونَ نَاقِلُوهَا أَهْلَ اسْتِقَامَةٍ فِي الْحَدِيثِ وَإِتْقَانٍ لِمَا نَقَلُوا لَمْ يُوجَدْ فِي رِوَايَتِهِمِ اخْتِلاَفٌ شَدِيدٌ وَلاَ تَخْلِيطٌ فَاحِشٌ كَمَا قَدْ عُثِرَ فِيهِ عَلَى كَثِيرٍ مِنَ الْمُحَدِّثِينَ وَبَانَ ذَلِكَ فِي حَدِيثِهِمْ فَإِذَا نَحْنُ تَقَصَّيْنَا أَخْبَارَ هَذَا الصِّنْفِ مِنَ النَّاسِ أَتْبَعْنَاهَا أَخْبَارًا يَقَعُ فِي أَسَانِيدِهَا بَعْضُ مَنْ لَيْسَ بِالْمَوْصُوفِ بِالْحِفْظِ وَالإِتْقَانِ كَالصِّنْفِ الْمُقَدَّمِ قَبْلَهُمْ.))[1]

یعنی امام مسلم کہتے ہیں کہ ''ہم نے اس قاعدہ کی پیروی کی ہے کہ ان حدیثوں کو پہلے رکھیں جو دوسری حدیثوں کی نسبت عیبوں سے زیادہ محفوظ ہیں اور ان کے نقل کرنے والے حدیث میں اہل استقامت اور اہل اتقان ہیں۔ ان باتوں میں جن کو انہوں نے نقل کیا اور ان کی روایت میں اختلاف شدید یا بڑا خلط نہیں پایا جاتا جیسا کہ اکثر محدثین کو ان پر اطلاع ہوئی ہے اور پھر لکھتے ہیں کہ جب ہم اس قسم کی حدیثوں کو بیان کر چکتے ہیں تو ان کے بعد اس قسم کی حدیثیں لاتے ہیں۔ جن کی سندوں میں بعض ایسے راوی بھی ہیں جو حفظ اور اتقان میں پہلے راویوں کی طرح نہیں۔ ان الفاظ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود مسلم نے حدیث زیر بحث کو وہ وقعت نہیں دی جو ان حدیثوں کو جن سے اس کے مخالف شہادت پیدا ہوتی ہے۔''

❀ روایت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ پر اندرونی شہادت

روایت زیر بحث کے بطلان کو اور بھی واضح کرنے کے لیے اب ہم اس اندرونی شہادت پر غور کرتے ہیں جو خود اس روایت سے پیدا ہوتی ہے۔ اول تو خود اس فقرہ کی عبارت اس طرز کی ہے کہ کوئی شخص جس نے قرآن شریف کو پڑھا ہے اسے قرآن شریف کا جزو قرار نہیں دے سکتا۔ ثانیاً وہ الفاظ جو ابو موسیٰ اشعری کی طرف منسوب کیے گئے ہیں اس روایت کے جھوٹا ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں [كُنَّا نَقْرَأُ سُوْرَةً] یعنی ''ہم ایک سورت پڑھا کرتے تھے۔'' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کے مطابق وہ اکیلے ہی ایسے آدمی نہ تھے جن کو وہ سورت حفظ ہو۔ بلکہ ان کی طرح دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی یاد تھی۔ اس لیے یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ سورت تمام صحابہ رضی اللہ عنہم میں شہرت رکھتی تھی۔ اب اگر اس بات کو فرض کر لیا جائے کہ یہ ممکن تھا کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ساری سورہ کو یکایک بھول جائیں اور صرف ایک ہی فقرہ ان کو یاد رہ جائے۔ تو یہ کیونکر ہوا کہ باقی تمام صحابی بھی اس کو ساتھ ہی بھول گئے۔ کوئی صحابی نہ اس سورت کا ذکر کرتا ہے نہ نام لیتا ہے۔ کہ کبھی کوئی ایسی سورت قرآن شریف کا ایک حصہ تھی اور انہی میں سے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی شامل ہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت میں جب قرآن شریف جمع کیا جا رہا تھا زید رضی اللہ عنہ کو کسی نے یہ اطلاع نہ دی کہ ایسی کوئی سورت بھی قرآن شریف میں داخل ہے۔ حالانکہ اس وقت عام طور پر اعلان کیا گیا کہ جس شخص کے پاس کوئی حصہ قرآن کا ہو جو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا ہو وہ اسے لے آوے۔ پھر نہ معلوم اس وقت ابو موسیٰ اشعری اور دوسرے صحابہ جن کو یہ سورت حفظ تھی کہاں تھے؟ یا کیوں انہوں نے اسے پیش نہ کیا؟ ایسا ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت میں جب مصاحف کی نقل بڑے اہتمام سے کرائی گئی اس وقت بھی کسی کی اطلاع میں یہ بات نہ آئی کہ ایسی کوئی سورت بھی قرآن شریف میں ہے۔ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے وقت سے لے کر جب قرآن شریف جمع

1- صحيح مسلم، مقدمة الكتاب، ص: 2

کیا گیا کسی قاری نے یا حافظ نے باوجود اس کے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بہت سے لوگ ایسے موجود تھے کبھی اس بات کو پیش نہ کیا کہ جو قرآن شریف حضرت ابو بکر نے جمع کرایا تھا اس میں ایک اتنی بڑی لمبی سورت کا نام و نشان تک پایا نہیں جاتا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور دوسرے تمام صحابہ جن کو سورت حفظ تھی اور ایسا ہی تمام حافظان قرآن اس سورت کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی جمع سے پہلے ہی بھول چکے تھے اور تمام تحریریں بھی جن پر یہی سورت لکھی ہوئی تھی اس وقت سے پہلے تلف ہو چکی تھیں تو کم از کم اتنا تو ہوتا کہ یہ چند لفظ جو ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو یاد رہ گئے یعنی [لَوْ كَانَ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ] قرآن شریف میں درج کر دیئے جاتے۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو یاد دلاتے کہ ہم سب فلاں سورت پڑھا کرتے تھے جس کو اب ہم سب بھول گئے ہیں۔ اور یہی ایک فقرہ یاد رہ گیا ہے۔ تو ضروری تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی یہ بات یاد آتی اور عجیب بات یہ ہے کہ ابن مسعود اور اُبی رضی اللہ عنہما کے پاس جو کہا جاتا ہے کہ الگ نسخے قرآن شریف کے تھے ان میں بھی اس سورہ کا نام و نشان نہیں۔ پھر جب ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس بات کو بیان کیا تو اس وقت بھی ہزارہا صحابیوں میں سے کسی ایک نے بھی اس کی تائید نہ کی۔ اور تعجب پر تعجب یہ کہ وہ لوگ جو ایک ایک حدیث کے لیے مہینوں کے سفر کرتے اور محنت شاقہ اٹھاتے ان میں سے بھی کوئی ایک اس تحقیق کے درپے نہ ہوا کہ اتنی بڑی لمبی سورتیں قرآن شریف کی جو کہ ابو موسیٰ کو بھول گئی تھیں ان کا کہیں پتہ لگاتا۔ بلکہ خود ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے بھی کوشش نہ کی کہ جو سورتیں ان کو بھول گئی تھیں ان کو تازہ کرنے کے لیے کچھ محنت اٹھاتے۔

اصل بات یہ ہے کہ روایت میں جو بات بیان کی گئی ہے وہ ایسی لغو اور دور از قیاس ہے کہ ایک سمجھدار آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی اس پر یقین نہیں کر سکتا۔ پس خارجی اور اندرونی شہادت دونوں صفائی سے اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ روایت زیر بحث سراسر جھوٹی ہے اور اس کی صداقت پر ایک ذرہ بھر بھی شہادت نہیں ملتی۔ اور یہ امر کہ مسلم نے اس روایت کو اپنی کتاب میں لکھ دیا ہے یہ کوئی اس کی صداقت کی شہادت نہیں۔ درآنحالیکہ ہم یہ بھی دکھا چکے ہیں کہ خود مسلم بھی اس کو بہت ضعیف اور کمزور سمجھتا تھا اور دوسری حدیثوں کو جن سے اس کے مخالف شہادت پیدا ہوتی ہے اس سے بہت زیادہ قابل اعتبار سمجھتا تھا۔

❀ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت رضاع پر بحث

باقی دو روایتیں جو مسلم نے بیان کی ہیں اور جن کو اعتراض کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر ان میں سے ہر ایک پر ایسی ہی لمبی بحث کی جائے تو یہ مضمون بہت طول پکڑ جائے گا۔ ہم نے صرف مثال کے طور پر یہ بتا دیا ہے کہ ایسی روایت پر خواہ وہ مسلم میں ہی موجود ہوں اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اور تحقیق سے ایسی حدیثیں بالکل جھوٹی ثابت ہوتی ہیں۔ پس باقی ماندہ دو روایتوں کے متعلق ہم صرف ان کی اندرونی شہادت کے متعلق ہی مختصر طور پر کچھ ذکر کریں گے۔ ان میں سے ایک روایت کا جو نمبر 2 پر دی گئی ہے یہ مضمون ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بیان کیا تھا کہ قرآن شریف میں ایک آیت تھی جس میں صراحت سے یہ ذکر تھا کہ دس بار دودھ چوسنے سے حرمت رضاعی ثابت ہوتی ہے اور کہ یہ حکم بعد میں منسوخ ہو گیا اور اس کی بجائے ایک اور حکم نازل ہوا جس میں دس بار کی بجائے پانچ بار کا دودھ چوسنا حرمت رضاعی کے لیے کافی سمجھا گیا۔ اور کہ یہ آخری حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک قرآن شریف میں پڑھا جاتا تھا۔

جو کچھ اس روایت میں بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا حکم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوا دوسروں کو بھی معلوم تھا اور وہ اس کو قرآن شریف میں پڑھا کرتے تھے۔ درحقیقت اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اگر کوئی ایسا حکم نازل ہوتا تو اس کی شہرت عام ہوتی۔ کیونکہ یہ حکم ایسا تھا جو روزمرہ استعمال میں آنے والا تھا۔ عرب میں بچوں کو عموماً دودھ دائیہ سے پلایا جاتا تھا۔ پس اگر ایسی کوئی آیت قرآن شریف میں نازل ہوتی تو اس کا علم کبھی ایک شخص تک محدود نہ رہ سکتا تھا۔ بلکہ اس کی اطلاع اور شہرت عام ہونی چاہیے تھی۔ محدثین نے یہ اصول قائم کیا ہے کہ اگر کسی حدیث میں کسی ایسے واقعہ کا تذکرہ ہو جس کی اطلاع اور شہرت عام ہونی چاہیے مگر وہ لوگ جن

کو اس کا علم ہونا چاہیے تھا اس کے متعلق کچھ اطلاع نہ دیں اور اس سے لاعلمی ظاہر کریں تو ایسی حدیث کے وضعی ہونے کی یہ شہادت کافی ہے۔

در حقیقت اگر غور کیا جائے تو یہ اصول نہایت معقول ہے۔ جب ہم اس کے رو سے روایت زیر بحث کو پرکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت اصلی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایسا حکم رضاعت کے متعلق عام طور پر لوگوں کے علم میں آنا چاہیے تھا اور ضروری تھا کہ کثرت سے روایات اس کے متعلق ہوتیں۔ روایت میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ایک آیت عام طور پر آنحضرت ﷺ کی زندگی میں پڑھی جاتی تھی۔ اب جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قرآن شریف کو جمع کرنا شروع کیا تو آنحضرت ﷺ کی وفات سے صرف چھ ماہ کا عرصہ گزرا تھا مگر باوجود اس کے کہ اس قدر تھوڑا عرصہ گزرا تھا ایک شخص نے بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یا زید رضی اللہ عنہ کو اطلاع نہ دی کہ ایسی کوئی آیت بھی قرآن شریف میں ہے۔

بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی جن سے یہ روایت منسوب کی جاتی ہے ایسی اطلاع نہیں دی۔ اور بالفرض اگر وہ زید رضی اللہ عنہ کو اطلاع نہ دے سکتی تھیں تو کیا اپنے والد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بھی نہ دے سکتی تھیں۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زندہ تھیں۔ مگر اس وقت بھی ایسی کسی آیت کا انہوں نے ذکر نہیں کیا۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کو تو کئی سال بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایسی بات کا پتہ بتائیں لیکن خود اپنے والد کو جمع قرآن کے وقت نہ بتائیں۔ اور اس وقت جب کہ عام اعلان کیا گیا تھا کہ جس شخص کے پاس کوئی آیت ہے وہ اسے سامنے لے آئے، خاموشی اختیار نہ کرے۔

اور پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوا کوئی شخص ایسی آیت کا نام تک نہیں لیتا۔ علاوہ اس کے جیسا کہ پچھلی روایت کی بحث میں دکھایا جا چکا ہے۔ خود مسلم کے اسی باب کی دیگر روایات سے اس روایت کے جھوٹا ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ کیونکہ ان روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی صحابی کو ایسی کسی آیت کی کوئی خبر نہ تھی۔ بلکہ اسی باب میں ایسی احادیث خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر صحابیوں سے مروی ہیں جن میں آنحضرت ﷺ سے یہ سوال کیے گئے ہیں کہ کتنی دفعہ کی رضاعت سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایسی صاف آیت قرآن شریف میں وارد ہوتی کہ پانچ یا دس دفعہ دودھ چوسنے سے حرمت قطعی ہو جاتی ہے تو ایسے سوالات آنحضرت ﷺ سے کیوں پوچھے جاتے۔ نہ ہی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ انہی سوالوں کے وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کا کوئی تذکرہ حدیث میں نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ اگر ایسا واقعہ ہوتا تو اس کا تذکرہ حدیث میں بھی ضرور ہوتا۔

❀ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی روایت رجم

رہی تیسری روایت سو اس کا بھی اب اس جگہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات غور کے قابل ہے کہ اگر اس روایت کے وہی معنی صحیح ہوں جو مخالف معترض کھینچ تان کر بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو جو الفاظ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں وہ ان کی زبان سے نکلے ہوئے کبھی ثابت نہیں ہو سکتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الفاظ سے معترض یہی نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہ کو ایک ایسی آیت یاد تھی جس میں زانی مردوں اور عورتوں کی سزا کا ذکر تھا۔ لیکن یہ آیت قرآن میں درج نہیں ہوئی۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ یہ آیت پڑھی جاتی اور یاد کی جاتی تھی اور آنحضرت ﷺ خود اور ان کے بعد خلفائے راشدین اس پر عمل کرتے اور اس کے مطابق حکم کیا کرتے تھے

اب اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کہ ہم اس بات کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جمع قرآن میں سب سے بڑا دخل تھا اور جمع شدہ قرآن شریف ان کی خلافت کے زمانہ میں ان کے قبضہ میں ہی تھا۔ تو پھر کیا وجہ پیدا ہوئی کہ انہوں نے اس بات کو درج نہ

فرمایا؟اس آیت کے متعلق صرف تین قیاس کیے جا سکتے ہیں۔

① یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ کا اس پر اتفاق تھا کہ یہ قرآن شریف کی آیت ہے۔

② یا یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی یہ رائے تھی کہ یہ قرآن شریف کی ایک آیت ہے اور دوسرے صحابہ اس سے متفق نہ تھے۔

③ یا یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ نہ حضرت عمرؓ اور نہ دوسرے صحابہؓ ہی اس کے آیت قرآنی ہونے پر متفق تھے۔

ان قیاسات میں سے صرف پہلا قیاس ہی ایسا ہے جس سے معترضین کی نکتہ چینی کو کچھ رونق مل سکتی ہے۔ لیکن اگر ایسا ہی ہوتا کہ حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ اس بات پر متفق ہوتے کہ یہ قرآن شریف کی آیت ہے تو ان کو کس بات نے روکا تھا کہ اسے درج قرآن نہ کیا؟اس لیے یہ قیاس بالکل باطل ٹھہرتا ہے اور خصوصاً جب ان لوگوں کے اخلاص اور دیانت وامانت اور تقویٰ اور طہارت کی طرف توجہ کی جاتی ہے اور ان کے اس دخل پر غور کی جاتی ہے جو جمع قرآن میں ان کو حاصل تھا۔ اور نیز جب اس بات کو دیکھا جاتا ہے کہ اس حکم کے اخفا سے ان کا کوئی ذاتی فائدہ نہ تھا۔ تو ایسی حالتوں کے باوجود اس کا درج قرآن نہ ہونا اس قیاس کے بطلان پر قوی دلیل ہے۔

اسی طرح دوسرا قیاس بھی غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس بات کی کہیں ذرا بھی شہادت نہیں ملتی کہ کبھی حضرت عمرؓ نے ایسا بیان کیا ہو اور صحابہؓ نے ان کی تردید کی ہو۔ اور اگر بالفرض یہ مانا جائے کہ واقع طور پر حضرت عمرؓ کے ایسے بیان کی دوسرے صحابیوں نے تردید کی تھی تو حضرت عمرؓ جب کسی دوسرے صحابی کو اپنا مؤید نہ پاتے تو خود ہی اپنی غلطی سے رجوع کرتے۔ ان دونوں قیاسوں کے بطلان کے بعد صرف تیسرا قیاس ہی ایسا ہے جس پر یہ مقدمہ ٹھہر سکتا ہے۔ لیکن اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ قیاس اس روایت کے ساتھ کس طرح توافق کھا سکتا ہے۔ کیونکہ ظاہر میں دونوں متضاد بیانات کی طرح نظر آتے ہیں۔ مگر اصل بات یوں نہیں۔ تھوڑا سا غور کرنے سے یہ امر ظاہر ہو جائے گا کہ اگر اس روایت کے معنی تیسرے قیاس کے ساتھ متوافق نہ ہوں تو یہ روایت ہی بے معنی اور عبث ٹھہر جاتی ہے۔

حضرت عمرؓ کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ

''جب کچھ زمانہ گذر جائے گا تو لوگ یہ کہنا شروع کر دیں گے کہ زانیوں کو سنگسار کرنے کا حکم کتاب اللہ میں موجود نہیں۔ حالانکہ زانی مردوں اور زانیہ عورتوں کو سنگسار کرنے کا حکم کتاب میں صحیح طور پر موجود ہے۔''

اگر کتاب اللہ سے مراد قرآن شریف سمجھا جائے تو یہ ایک صریح تضاد ہے اور اس لیے حدیث مذکور سراسر بے معنی ہے۔ کیونکہ پھر معنی یہ ہوں گے کہ سنگساری کا حکم قرآن شریف میں موجود ہے مگر مرور زمانہ کے بعد لوگ کہنے لگیں گے کہ ایسا حکم قرآن شریف میں نہیں۔ لیکن لفظ کتاب اللہ جو اس حدیث میں وارد ہے اگر اس کے مفہوم کو ذرا وسعت دی جائے تو یہ اختلاف دور ہو جاتا ہے۔ سو واضح رہے کہ یہ ضروری نہیں کہ کتاب اللہ سے مراد قرآن ہی ہو۔ کیونکہ یہی لفظ قرآن شریف میں بھی آیا ہے اور وہاں اس کے معنی احکام الٰہی کے ہیں۔ چنانچہ:

﴿وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ﴾ [النساء: 24]

میں ''کتاب اللہ'' کے معنی قرآن شریف نہیں بلکہ احکام الٰہی ہیں۔ سو ان معنوں کی رو سے روایت کے معنی درست ہو جاتے ہیں اور قرآن شریف کی حفاظت پر جو اعتراض بنایا گیا تھا دور ہو جاتا ہے۔ مگر یہ صرف اس صورت میں ہے کہ روایت کو صحیح تسلیم کیا جائے جو میرے نزدیک صحیح نہیں۔

ایسی روایات کس طرح مروج ہوئیں

بعض نکتہ چین لوگ یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ ایسی وضعی روایات کا مسلمانوں میں کیونکر رواج ہو گیا اور کیونکر ان کو مشہور و معروف جامعانِ احادیث نے اپنی کتب میں درج کر لیا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حدیثیں اسلام میں لاکھوں تک مروج ہوئیں اور ان میں سے بہت سی بناوٹی اور موضوع حدیثیں بھی تھیں۔ بہت سی ایسی احادیث زندیقوں نے وضع کیں جو بظاہر اسلام کے قائل مگر درپردہ دشمن تھے۔ اور بعض شیعوں نے بھی بعد میں بہت سی روایات بنالیں۔ چنانچہ انہیں میں سے ایک روایت کے راوی اول کے حالات سے ظاہر ہو چکا ہے کہ وہ زندیق قرار دیا گیا تھا اور اس کا میلان رفض کی طرف پایا جاتا تھا۔ لیکن امام مسلم نے اس کی روایت پر اگرچہ بہت اعتبار تو نہ کیا لیکن قبولیت میں جگہ دے دی۔ اس کی غالب وجہ یہ تھی کہ جس وقت امام مسلم نے اس روایت کو نقل کیا تھا اس وقت اس شخص کے دل کے اندرونی خیالات دیکھے نہیں گئے تھے۔ اس میں کلام نہیں کہ محدثین نے صحیح اور وضعی حدیثوں کے پرکھنے اور ان کے الگ کرنے میں بڑی سعی کی۔ لیکن آخر وہ انسان ہی تھے عالم الغیب نہ تھے۔ جہاں تک انسانی عقل پہنچ کر کوشش کرتی ہے انہوں نے اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر بشری نقصانوں سے وہ کیونکر بچ سکتے تھے۔

غرض ایسی وضعی احادیث جن میں اسلام پر باریک رنگ میں حملے کیے گئے زندیقوں نے وضع کر کے ان کو شہرت دی اور اس طرح مسلمانوں میں وہ رواج پا گئیں اور رواج پا کر معتبر شمار ہونے لگ گئیں۔ علاوہ ازیں اس قسم کی وضعی حدیثوں کے بنانے اور رواج دینے میں بعض غالی شیعوں کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے پہل تو یہ لوگ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حقوق خلافت کو فوقیت اور ترجیح دیتے تھے۔ لیکن جب ان کے سامنے یہی بات پیش کی گئی کہ ان کے اس دعوے کی تائید میں کوئی آیت قرآنی نہیں تو پھر انہوں نے خلفائے ثلاثہ کو کوسنا شروع کیا۔ اور ان پر جھوٹا الزام لگایا کہ انہوں نے جان بوجھ کر وہ آیات قرآن میں درج نہیں کیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حقوق کی مؤید تھیں۔ اس عقیدے کو رواج دینے کے لیے اس قسم کی روایتیں بنائی گئیں جن سے قرآن کریم میں نقصان کا واقع ہونا معلوم ہو۔ تاکہ اس سے یہ استدلال ہو سکے کہ جب نقصان ہو گیا ہے تو ضرور ہے کہ بعض حصص جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت تھی نکال دیئے گئے ہوں۔ اور ممکن ہے کہ کسی جامع حدیث نے ایسی باتوں کو صرف اس پر محمول کر لیا کہ یہ آیتیں منسوخ ہو چکی تھیں۔ لیکن اس سے ان آیات کا قرآن شریف میں منسوخ ہونے یا فروگذاشت سے نہ لکھے جانے کا ثبوت نہیں ملتا۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ محققین اہل تشیع قرآن کریم کی حفاظت کے قائل ہیں۔ جیسے آگے دکھایا گیا ہے۔

ایسی سب روایات صرف اکیلے آدمی کی شہادت بیان کرتی ہیں

اگر بفرض محال ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ روایات زیر بحث معتبر ہیں تو اس صورت ہم کو اس بات کا دیکھنا ضروری ہو گا کہ آیا کوئی شہادت ان کے متعارض اور مخالف تو موجود نہیں۔ کیونکہ اگر ایسی متعارض اور مخالف شہادت موجود ثابت ہو گی تو پھر اس بات کے جانچنے کی ضرورت ہو گی کہ دونوں میں سے کس طرف کی شہادت زیادہ قابل وثوق و اعتبار ہے۔ اس موقعہ پر جب ہم دیکھتے ہیں تو ایک طرف تو اکیلے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اشعری کی گواہی ہے کہ دو سورتیں صحابہ پڑھا کرتے تھے اور جس وقت اس نے یہ حال بیان کیا تو اس وقت اس کو یاد نہ رہی تھیں۔ اور دوسری طرف ساری جماعت صحابہ کبار کی گواہی ہے کہ ان کے علم میں کسی ایسی سورہ کا وجود کبھی نہیں ہوا۔ جو جو لوگ قرآن خواں تھے اور جن جن کے پاس قرآن شریف موجود تھا ان میں کوئی بھی ایسا نہیں کہ جس نے اتنا بھی کہا ہو کہ ہم نے ایسی سورتوں کی بابت سنا ہی تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ایک ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی گواہی اتنی بڑی معتبر جماعت صحابہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے مقابلہ میں کیا وقعت رکھ سکتی ہے۔ اور خصوصاً جب کہ یہ معاملہ ایسا تھا کہ اگر اس کا کچھ بھی وجود ہوتا تو کثیر جماعت کے علم میں اس کا آنا ضروری تھا۔ ایسی صورت میں اکیلے شخص کی گواہی کو تمام صحابیوں کی گواہی پر کوئی ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ بلکہ ترجیح کا سوال تو الگ رہا شمار اور موازنہ میں

بھی نہیں لائی جاسکتی۔ البتہ اگر اس کے ساتھ بہت نہیں تو دو تین صحابہ رضی اللہ عنہ ہی متفق ہوتے تو کسی ناقد کے دل میں شک پیدا ہونے کی وجہ ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو صرف ایک معمولی درجہ کی خبر رکھنے والے صحابی کی شہادت پر مبنی ہے اور ہزارہا صحابہ رضی اللہ عنہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو اس سے زیادہ خبر اور دخل اور حافظہ رکھنے والے تھے اس کا انکار کرتے ہیں۔ اس پر بھی اس کو پیش کرنا اور اس پر ناز کرنا پرلے درجہ کی نادانی اور نامعقولیت ہے۔ یہی حال باقی ان روایتوں کا ہے جو پیش کی جاتی ہیں۔ ایسی ہر ایک حدیث صرف ایک ہی شخص کی گواہی پر مبنی ہے جس کا کوئی دوسرا مؤید نہیں۔ اکیلے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہی کی روایت پر بیان کیا جاتا ہے کہ دو سورتیں قرآن شریف کی گم ہو گئی تھیں۔ ان کے سوائے ایک بھی ایسا صحابی نہیں جس نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی ہو اور ان کے غلط خیال کی تائید کی ہو۔

❀ آیات قرآنی میں ایک آدمی کی شہادت وزن نہیں رکھتی

ایسے ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک آیت کا گم ہو جانا بیان کرتی ہیں۔ لیکن وہ بھی اپنے بیان کی تائید میں ہزارہا صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک گواہ بھی پیش نہیں کرتیں۔ جہاں ابن مسعود رضی اللہ عنہ ایک امر بیان کرتا ہے تو اُبی رضی اللہ عنہ اور دوسرے تمام صحابہ اس کی تردید کرتے ہیں۔ اور اگر اُبی نے کوئی امر بیان کیا ہے تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور دوسرے سارے صحابہ رضی اللہ عنہم اس کے مخالف ہیں۔ غرض جہاں کہیں اس قسم کی کوئی روایت آئی ہے وہ صرف ایک ہی شخص کا بیان ہے اور کوئی بھی دوسرا اس کے بیان کا مؤید اور گواہ نہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ صرف ایک شخص کا بیان ہے اور کوئی بھی دوسرا اس کے بیان کا مؤید اور گواہ نہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ صرف ایک ہی شخص کی گواہی سے یہ بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ جاتی کہ فلاں آیت قرآن شریف کی تھی۔ کیونکہ یہ امر واقعہ ہے اور کثیر التعداد احادیث اس کی مصدق و مؤید ہیں کہ قرآن شریف کی ہر ایک آیت نازل ہوتے ہی عام طور پر شائع کر دی جاتی تھی اور قراء اور حفاظ اس کو فوراً یاد کر لیا کرتے تھے۔ جس روایت میں زید رضی اللہ عنہ کا بعہد خلافت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ قرآن جمع کرنے کا ذکر ہے اس کے اخیر میں جو روایت لکھی ہے کہ سورۃ توبہ کی ایک آیت گم ہو گئی تھی اور وہ صرف ابو خزیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس دستیاب ہوئی تھی۔ اس روایت سے اس نتیجہ کا انکار لازم نہیں آتا۔ کیونکہ ہم پہلے ثابت کر آئے ہیں کہ وہاں صرف تحریر کا ذکر ہے اور دوسری روایتوں سے ثابت ہے کہ اسی زمانہ میں قرآن شریف کے بہت لوگ حافظ اور قاری موجود تھے جن کو سارا قرآن ازبر تھا اور جو ازبر تلاوت کیا کرتے تھے۔ الغرض کوئی معقول انسان اس بات پر کبھی قائم نہیں رہ سکتا کہ صرف ایک شخص کی شہادت کو تمام صحابہ کی جماعت کی شہادت کے مقابلہ میں ترجیح دے اور ان سب کو غلطی پر سمجھے۔

❀ تعامل اور تواتر قولی ان روایتوں کو غلط ٹھہراتا ہے

پھر ان روایات کی صحت پرکھنے کے لیے تیسرا معیار تواتر عملی یا تعامل ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایسے عاشق تھے کہ جو بات آپ کے دہن مبارک سے سنتے یا جو کام آپ کو کرتے دیکھتے یا آپ کے جو فرمان کانوں سے سن لیتے تو فوراً ان کو عمل میں لے آتے۔ اور اسی طرح ان سے ان کی اولاد اور توابع نے اور ان کی اولاد اور توابع نے لے کر عمل کیا اور نسلاً بعد نسل عمل کرتے چلے آئے۔ یہاں تک کہ وہ سب کچھ ہم تک پہنچ گیا۔ اس کو تعامل کہتے ہیں جو باتیں تعامل میں آچکی تھیں احادیث کی کتابوں میں نہ بھی لکھی جاتیں تو بھی کچھ ہرج نہیں تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ قیمتی چیز مسلمانوں کے ہاتھ میں قرآن شریف تھا اور اس میں شک نہیں کہ ہر ایک مسلمان کے دل میں یہ جوش تھا کہ اس بیش بہا نعمت کو ہر قسم کی آمیزش اور تصرف سے محفوظ رکھ کر آئندہ نسلوں کو پہنچاتا رہے۔

اب اگر بفرض محال مان لیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تحکم سے بعض نسخے قرآن شریف کے معدوم کر دیئے تو یہ امر دیکھنا ضروری ہو گا کہ آیا اکیلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا عمل دخل اتنا بڑھا ہوا تھا اور ان کی طاقت ایسی وسیع ہو گئی ہوئی تھی کہ اتنی بڑی قوم کے قبضہ و حافظہ

سے ہر ایک آیت اور سورت مٹا سکیں۔ اور اگر یہ بھی فرض کر لیں کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے مشہور لوگوں سے انہوں نے قرآن کے نسخے چھین لیے تھے تو کیونکر سمجھا جا سکتا ہے کہ جو نقلیں عام طور پر ان لوگوں کے قرآنوں کی مسلمانوں میں مشتہر اور مروج ہو چکی تھیں وہ بھی انہوں نے لوگوں سے لے لی تھیں؟ اور یہ ثابت شدہ بات ہے کہ قرآن کی بکثرت نقلیں اسی زمانہ میں مسلمانوں میں عام طور پر مروج ہو چکی تھیں۔ اگر ان لوگوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ والے نسخہ قرآن میں کوئی نقص معلوم ہوتا تو وہ حق کے لیے ایسے دلیر تھے کہ فوراً اس کو عیاں کر دیتے اور کسی کے رعب و سیاست سے نہ دبتے۔ لیکن بطور تنزل اگر اتنا بھی مان لیا جائے کہ ان میں سے کسی مسلمان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نسخہ قرآن میں کوئی نقص معلوم ہوا تھا تو اتنا تو کوئی ضرور کرتا اور اس کے کرنے میں اس کو کوئی دقت بھی نہ تھی کہ جو نسخہ صحیح اس کے اپنے پاس یا کسی اور کے پاس معلوم ہوتا اس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں چھپا کر ہی محفوظ رکھ لیتا۔ اگر کوئی ایسا کرتا تو حضرت عثمان کے دور خلافت ختم ہونے کے بعد ایسے قرآن کی نقلیں فوراً جا بجا پھیل جاتیں۔ اور خصوصاً جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تھا تو چونکہ انہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآن شریف کے مختلف نسخوں کو لے کر ایک مکمل نسخہ بنانے کی تدبیر کو اپنے زمانہ میں مروج رکھنے کی کوئی خاص غرض نہ تھی اس لیے ان کے زمانہ میں ایسا نسخہ قرآن شریف کا بہت آسانی اور عمدگی کے ساتھ بلا تکلف وسیع اشاعت حاصل کر سکتا تھا۔ اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بہت سارے ایسے قرآنوں کے نسخے مروج ہو جاتے۔ اگر انہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جمع کردہ نسخہ سے ذرہ بھی اختلاف ہوتا اور اس کی اشاعت و رواج کو روکنے کی جرأت اپنے میں نہ پاتے تو اتنا ضرور ہوتا کہ دوسرے جس کسی نسخہ قرآن کو اس نسخہ سے زیادہ اچھا سمجھتے اسی کو ہی شائع کرتے۔ لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایسی احتیاط اور امانت سے کامل قرآن شریف نقل کرایا تھا کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کی صحت پر صاد تھا۔ بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ وہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا متفقہ طور پر لکھا ہوا قرآن تھا۔ یہ ایسا مقبول کام تھا کہ وہ لوگ جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ایسے ناراض ہوئے تھے اور ان میں آتش غضب ان کے برخلاف اس حد تک بھڑک اٹھی تھی کہ امیر المومنین کے خون سے ہاتھ رنگ لیے تھے ان لوگوں نے بھی اس قرآن میں کوئی نقص نہ پایا اور نہ بیان کیا۔ اور نہ ہی انہوں نے اس سے کوئی جدا نسخہ قرآن پیش کیا۔ اور نہ ہی کسی سورت تو کیا ایک آیت کی کمی بیشی ہی بیان کی۔ بلکہ یہاں تک کہ انہوں نے باوجود اس قدر حرف گیری کے اتنا بھی اشارہ نہ کیا کہ کوئی ایک لفظ بلکہ حرف ہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بدلا ہے۔ غور کی جگہ ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طاقت کا خاتمہ ہو گیا یعنی جب وہ باغیوں کے ہاتھوں سے مقتول ہو گئے تو پھر جن حصص قرآن کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دبا رکھا تھا اور شائع نہ کیا تھا ان کے شائع کرنے میں کونسی رکاوٹ کسی کو مانع ہو سکتی تھی۔ اگر یہ بھی مانا جائے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیاست ایسی غالب آئی تھی کہ انہوں نے تمام ایسے نسخے چنوا کر ضائع کر دیئے تھے تو ان کی شہادت کے بعد ابھی بہت سارے قراء اور حفاظ زندہ تھے جن کے دلوں کی الواح پر قرآن شریف کا حرف حرف زمانۂ نزول سے ہی منقش اور منضبط تھا۔ ان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مٹانے پر کیسے قادر ہو سکتے تھے۔ ان کا تو کسی فانی ہاتھ کی کوشش سے محو ہو جانا ناممکن محض تھا۔ قرآن شریف کے تمام ایسے حصے جن کے دبا رکھنے کا الزام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر بے جا اعتراض کرنے والے لگاتے ہیں وہ سب کے سب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ساتھ ہی رواج عام میں آ جاتے۔ اور قرآن میں شامل کر دیئے جاتے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا تاریخ اس گواہی کے لیے تیار ہے کہ کسی اس قسم کی بات کا پتہ دیوے؟

سچی بات تو یہ ہے کہ تاریخ میں ہرگز ہرگز اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا باوجود یہ کہ مسلمانوں کو اسی ابتدائی زمانہ میں ہی باہمی اختلاف نے علیحدہ علیحدہ کر دیا تھا۔ اور اس کے بعد طرح طرح کے اختلافات ان میں پیدا ہوتے گئے تھے۔ لیکن باوجود ان سب اختلافات کے مختلف لوگوں اور مختلف فرقوں میں صرف یہی ایک قرآن جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لکھوایا تھا بلا کسی قسم کے اختلاف کے ہمیشہ سے مروج اور مسلم چلا آیا ہے۔ اگر واقع میں کوئی اختلاف موجود ہوتا تو ضرور تھا کہ قرآن شریف کے نسخوں میں کسی نہ کسی طرح اس کو دخل ہو جاتا۔

لیکن تمام مسلمان جن میں بعض ایک دوسرے کے خونی دشمن بھی ہوتے رہے ہیں اور تمام اسلامی فرقے جو بعض بعض کے خون آشام حریف ہیں صرف ایک ہی قرآن شریف ہمیشہ سے مانتے چلے آتے ہیں۔ اس جمہوری اتفاق سے یہی امر پایہ ثبوت کو زیادہ وضاحت سے پہنچتا ہے کہ قرآن شریف سب کے موافق جمع کیا گیا تھا۔

❀ بعض شیعوں کا اعتراض اور میور کا جواب

بعض واقف اہل تشیع محض حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر اعتراض کی خاطر حفاظت قرآن کو زیر بحث لے آتے ہیں۔ ان کے لیے ہم میور صاحب کی ''لائف آف محمد'' سے چند فقرات اقتباس کرنے پر کفایت کرتے ہیں۔ اس شخص نے خود ہی اعتراض اٹھایا ہے اور آپ ہی اس کا جواب دیا ہے:

''اس بات کو تسلیم کر کے کہ ہمارے ہاتھوں میں بلا تغیر و تبدل وہی نسخہ موجود ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شائع کرایا تھا۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ نسخہ قرآن شریف کا زید والے قرآن شریف کے ساتھ سوائے خفیف اصلاحات کے بالکل مطابق ہے؟ اس بات کے ماننے کے لیے پورے پورے دلائل موجود ہیں کہ واقع میں ایسا ہی ہے۔ کسی پرانی روایت اور معتبر حدیث سے ذرہ بھر بھی شک کرنے کی وجہ پیدا نہیں ہوتی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی دعوے کی تائید میں قرآن شریف میں ایک ذرہ بھر تصرف کیا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ متاخرین شیعوں نے غلطی سے یہ بات بنا رکھی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بعض سورتیں اور بعض آیتیں عمداً درج قرآن نہ کرنے دی تھیں اور وہ سورتیں اور آیتیں ایسی تھیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دعاوی کی مؤید تھیں۔ لیکن شیعوں کی یہ بات بالکل اعتبار کے قابل نہیں۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نسخہ قرآن تیار ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیروؤں اور بنو امیہ میں کوئی ظاہری اختلاف پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور اخوت و وحدت اسلامی میں کوئی فرق واقع نہ ہوا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دعوے ابھی تک منصہ ظہور میں آئے ہی نہ تھے۔ کوئی ایسی غرض کافی طور پر نظر نہیں آتی کہ جس نے ایسے وقت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ایسے مکروہ اور سیاہ جرم کے ارتکاب پر آمادہ کر دیا ہو جو مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ تاریک گناہ ہے۔ پھر ماسوا اس کے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن جمع کر کے اس کو مستند طور پر شائع کیا تھا تو وہ ایسا زمانہ تھا کہ جب کہ ابھی ہزارہا ایسے آدمی زندہ موجود تھے جنہوں نے وقت نزول سے ہی قرآن شریف کو سن کر حفظ کر لیا ہوا تھا۔ اور اگر کوئی سورت یا آیت ایسی ہوتی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دعوے کی مؤید تھی تو ضرور تھا کہ وہ ہزارہا لوگوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہوتی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص اخلاص اور تعلق رکھتے تھے۔ یہ دونوں ایسی باتیں تھیں کہ ان سے اصل قرآن میں کسی قسم کے تصرف و تغیر کا دخل پانا ممکن ہی نہیں تھا۔ پھر اس کے علاوہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فوت ہوتے ہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خیر خواہوں کی جماعت کا غلبہ ہو گیا اور ایسی آزاد طاقت حاصل کر لی کہ ان کو خلیفہ بنا دینے میں کامیاب ہو گئے۔ کیا یہ گمان صحیح ہو سکتا ہے کہ جب اس طرح ان کو قوت اور دولت مل گئی تھی تو اس وقت وہ اسی ناقص قرآن شریف کے رواج کی اجازت دے رکھتے؟ اور ناقص بھی ایسا کہ ان کے اپنے پیشوا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی کے دعووں کی آیات اور سور کے اندراج سے ناقص۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ بھی اسی قرآن کو بلا قیل و قال ہمیشہ استعمال کرتے رہے اور ان کے مخالف بھی اسی قرآن کو پڑھتے رہے۔ اور خفیف سے خفیف اعتراض بھی اس کے خلاف نہیں کیا''۔

❀ محققین اہل تشیع حفاظت قرآن کے قائل ہیں

اس جگہ یہ بات بھی ذکر کر دینے کے قابل ہے کہ شیعوں کی ساری جماعت ہی ایسا اعتقاد نہیں رکھتی کہ قرآن شریف کے کچھ حصے گم ہو گئے تھے یا وہ سورتیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دعووں کی مؤید تھیں ان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا زید رضی اللہ عنہ نے عمداً چھوڑ دیا تھا۔ ان لوگوں

میں بھی بہت زیادہ ایسے ہوئے ہیں اور ہیں جو مانتے ہیں کہ قرآن شریف ہر قسم کی آلائش اور تصرف سے پاک ہے۔ اور یہی قرآن شریف جو بین الدفتین دنیا میں موجود ہے زمانہ رسول اللہ ﷺ اور زمانہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور زمانہ تابعین میں تھا۔ اور یہی بلا تغیر و تبدل حرفے و حرکتے موجود ہے۔ یہی اعتقاد بڑے بڑے فضلا اور محققین اہل تشیع کا ہے۔ البتہ جاہل لوگ ایسا اعتقاد رکھتے ہیں کہ بعض حصص قرآن شریف گم ہو گئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہم تفسیر صافی میں سے جو اہل شیعہ کی ایک بڑی معتبر تفسیر ہے اور آج کل ان کے مدارس میں بطور درس داخل ہے۔ چند فضلائے اہل تشیع کی آراء لکھتے ہیں جو انہوں نے اس قرآن شریف کی نسبت جو آج کل دنیا میں رائج ہے ظاہر فرمائی ہے۔ اس تفسیر میں ملا محسن جاہل شیعوں کے خیالات کی تردید کرتا ہے اور لکھتا ہے:

((فَقَدْ رَوٰى جَمَاعَةٌ مِنْ اَصْحَابِنَا وَ قَوْمٌ مِنْ حَشْوِيَّةِ الْعَامَّةِ اَنَّ فِي الْقُرْاٰنِ تَغَيُّرًا وَ نُقْصَانًا وَالصَّحِيْحُ مِنْ مَذْهَبِ اَصْحَابِنَا خِلَافُهُ وَ بَلَغَتْ حَدًّا لَمْ تَبْلُغْهُ فِيْمَا ذَكَرْنَاهُ لِاَنَّ الْقُرْاٰنَ مُعْجِزَةُ النَّبُوَّةِ وَمَأْخَذُ الْعُلُوْمِ الشَّرْعِيَّةِ وَالْاَحْكَامِ الدِّيْنِيَّةِ وَعُلَمَاءُ الْمُسْلِمِيْنَ قَدْ بَلَغُوْا فِيْ حِفْظِهِ وَ حِمَايَتِهِ الْغَايَةَ حَتّٰى عَرَفُوْا كُلَّ شَيْءٍ اُخْتُلِفَ فِيْهِ مِنْ اِعْرَابِهِ وَقِرَاءَتِهِ وَحُرُوْفِهِ وَاٰيَاتِهِ فَكَيْفَ يَجُوْزُ اَنْ يَكُوْنَ مُغَيَّرًا اَوْ مَنْقُوْصًا مَعَ الْعِنَايَةِ الصَّادِقَةِ وَ الضَّبْطِ الشَّدِيْدِ.))[1]

یعنی ہمارے دوستوں کی ایک جماعت اور عوام حشویہ نے یہ روایت کی ہے کہ قرآن شریف میں تغیر اور نقصان ہے اور ہمارے اصحاب کا صحیح مذہب اس کے خلاف ہے۔ اور نیز ان لوگوں کی رائے اس حد تک پہنچی ہے کہ ہم اس کو بیان نہیں کر سکتے۔ اور اصل بات یہ ہے کہ قرآن نبوت کا اعجاز اور علوم شرعیہ اور دینی احکام کا ماخذ ہے اور علمائے اسلام نے یہاں تک اس کی حفاظت اور حمایت کی ہے کہ انہوں نے ہر چیز پر جس پر اعراب اور قراءت اور حروف اور آیات کے بارہ میں اختلاف کیا گیا ہے، عرفان تام اور واقفیت پیدا کر لی ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ ایسے ضبط شدید اور حفاظت صحیحہ کی موجودگی میں کسی قسم کا تغیر یا کمی ہونے پائی ہو۔

پھر آگے چل کر مصنف مذکور اسی صفحہ پر لکھتا ہے:

((اِنَّ الْقُرْاٰنَ كَانَ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ مَجْمُوْعًا مُؤَلَّفًا عَلٰى مَا هُوَ عَلَيْهِ الْآنَ وَاسْتَدَلَّ عَلٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ الْقُرْاٰنَ كَانَ يُدَرَّسُ وَيُحْفَظُ جَمِيْعُهُ فِيْ ذٰلِكَ الزَّمَانِ حَتّٰى عُيِّنَ عَلٰى جَمَاعَةٍ مِنَ الصَّحَابَةِ فِيْ حِفْظِهِمْ لَهُ وَ اِنَّهُ كَانَ يُعْرَضُ عَلَى النَّبِيِّ وَ يُتْلٰى عَلَيْهِ وَاِنَّ جَمَاعَةً مِنَ الصَّحَابَةِ مِثْلَ عَبْدِاللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ وَاُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ وَغَيْرِهِمَا خَتَمُوا الْقُرْاٰنَ عَلَى النَّبِيِّ عِدَّةَ خَتَمَاتٍ وَكُلُّ ذٰلِكَ يَدُلُّ بِاَدْنٰى تَاَمُّلٍ عَلٰى اَنَّهُ كَانَ مَجْمُوْعًا غَيْرَ مَبْثُوْرٍ وَمَبْثُوْثٍ وَذَكَرَ اَنَّ مَنْ خَالَفَهُ فِيْ ذٰلِكَ مِنَ الْاِمَامِيَّةِ وَالْحَشْوِيَّةِ لَا يُعْتَدُّ بِخِلَافِهِمْ فَاِنَّ الْخِلَافَ فِيْ ذٰلِكَ مُضَافٌ اِلٰى قَوْمٍ مِنْ اَصْحَابِ الْحَدِيْثِ نَقَلُوْا اَخْبَارًا ضَعِيْفَةً.))[2]

یعنی یہی قرآن رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اسی طرح جمع شدہ اور اکٹھا تھا۔ جس طرح آج کل ہے اور اس پر یہ دلیل ہے کہ قرآن حمید مکمل و مجموعی طور پر اس زمانہ مبارک میں پڑھا جاتا اور حفظ کیا جاتا تھا۔ اور صحابہ کی ایک جماعت مثل عبداللہ بن مسعود و اُبی بن کعب رضی اللہ عنہما وغیرہ نے چند مرتبہ قرآن کو رسول اللہ ﷺ کے سامنے ختم کیا اور ان باتوں پر ادنی تامل و تفکر سے یہ

1- تفسیر صافی، ملا محسن، صفحہ: 14

2- نفس المرجع السابق

نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن مرتب و مدون تھا۔ تتر بتر نہیں تھا۔اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ امامیہ یا حشویہ میں سے جن لوگوں نے اس رائے کی مخالفت کی ہے ان کی اس کے مقابل میں کوئی حقیقت اور شمار نہیں ہے۔ کیونکہ یہ خلاف صرف اصحاب حدیث میں ہوا ہے جنہوں نے ضعیف خبریں نقل کر دی تھیں۔

❀ مابین الدفتین کے اصلی ہونے پر اجماع

پھر مفسر مذکور اپنی تفسیر میں بہت سے بڑے بڑے مسلم اور مستند علماء و فضلاء و محدثین امامیہ کے اعتقاد کا اقتباس کرتا ہے کہ جن کی عظمت اور لیاقت کی شہرت کا سکہ تمام شیعہ دنیا میں بیٹھا ہوا ہے۔اس نے بہت سے حوالے ایسے نقل کیے ہیں جن میں یہ لوگ صاف اور کھلے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ یہ قرآن جو بین الدفتین مسلمانوں میں رائج ہے یہ ٹھیک وہی قرآن ہے جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ پر نازل کیا تھا اور اس میں کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا۔اس کے علاوہ اس نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے جو امامیہ فرقہ میں بہت مستند اور مسلم حدیث ہے اور جس کی اسناد پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔ یہ حدیث بھی اسی بات کی تائید کرتی ہے کہ یہی قرآن شریف جو دنیا میں عام طور پر مروج ہے لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً وہی ہے جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا تھا اور جس طرح آپ نے ترتیب دلائی تھی اور اس میں کسی تبدل و تغیر کو کسی طرح سے دخل نہیں ہوا۔

ان مذکورہ بالا حوالوں سے کافی طور پر ثابت ہے کہ علمائے محققین فرقہ امامیہ کو بھی مسلمانوں کے دوسرے فرقوں کے علماء کے ساتھ اس بات میں اتفاق ہے کہ یہ قرآن شریف جو بین الدفتین مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے ٹھیک وہی ہے جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا تھا اور یہ کہ اس میں کسی قسم کی دسترس کسی غیر کی نہ اس کی ترتیب میں نہ آیت و لفظ و حرف میں بلکہ کسی حرکت کے بدلنے میں بھی ہو سکی۔

اگر یہ نادان معترض قرآن شریف کے اس اعجاز کی طرف نظر غور اٹھا کر دیکھتے کہ جب کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا شائع کردہ قرآن آج تک دنیا میں اس قدر وسیع طور سے مروج اور شائع ہو چکا ہے اور اسلامی اقوام اس قدر دور دور پھیل گئی ہیں مگر مختلف ممالک میں رہنے مختلف زبانوں کے بولنے کے باوجود جہاں کہیں جاؤ تیرہ سو برس سے وہی قرآن موجود ہے۔اور اس میں کسی قسم کا اختلاف اور تغیر واقع نہیں ہو سکا۔ تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ صرف تیرہ برس کے ایسے پاک زمانہ ہی میں اس میں کسی کی دستبرد کو راہ مل جاتی۔ وہ تو ایسا زمانہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد صرف تیرہ سال ہی گزرے تھے اور مسلمانوں میں وحدت موجود تھی۔اور ایک ملک اور قریباً ایک ہی زبان کے سمجھنے والے تھے اور ان میں کثیر التعداد ایسے قراء و حفاظ موجود تھے جنہوں نے آنحضرت ﷺ سے سیکھ کر قرآن حفظ کیا ہوا تھا اور تازہ تازہ زمانہ تھا۔اور اس کے بعد ہمارے زمانہ تک مختلف قوموں میں ہزارہا اختلاف واقع ہوئے، ہزارہا قومیں مختلف ملکوں میں رہنے والی اور مختلف زبانیں بولنے والی اسلام میں داخل ہو گئیں پھر جب کہ اس تیرہ سو برس کے لمبے زمانہ میں ایک حرکت بھی بدل نہیں سکی تو اس پہلے زمانہ کی نسبت کسی تبدیلی یا فروگذاشت کا خیال کرنا ہی سراسر حق کا خون کرنا ہے۔ وہ ابتدائی زمانہ ایسا تھا کہ جس میں وہ اسباب جن سے قرآن شریف ہر آلائش اور تصرف سے محفوظ رکھا جا سکتا تھا۔ بہت کثرت سے موجود تھے اصحاب رسول کریم ﷺ اور تمام مقتدین اس بات کو علی وجہ البصیرت مانتے اور جانتے تھے کہ قرآن شریف میں سے کچھ بھی کم نہیں ہوا۔امام بخاری نے ایک حدیث لکھی ہے اور یہ ایسی حدیث ہے کہ جس کی صحت پر کوئی جرح واقع نہیں ہوئی اور وہ یہ ہے کہ جب ابن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن حنفیہ سے پوچھا گیا کہ آنحضرت ﷺ نے کیا چھوڑا ہے تو دونوں نے متفق للفظ ہو کر جواب دیا:

((مَا تَرَكَ اِلَّا مَا بَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ.))

یعنی ''آپ نے وہی کچھ چھوڑا ہے جو بین الدفتین موجود ہے۔''

واضح رہے کہ بین الدفتین کی اصطلاح وہ ہے جو اس قرآن شریف کے لیے پہلے بولی گئی تھی۔ جو حضرت عثمان □ نے شائع کیا تھا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ یہی قرآن جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شائع کیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے چھوڑا ہے۔

❀ ڈاکٹر منگانا کے تین قدیم قرآنوں کے اوراق

اب ہم ڈاکٹر منگانا کے دریافت کردہ نسخہ ہائے قرآنی کو لیتے ہیں۔ اصل مالکہ ان اوراق کی ایک لیڈی ہیں اور انہوں نے یہ اوراق اشیائے قدیم کے تاجروں سے 1895ء میں بمقام سویز خریدے تھے۔ ان اوراق پر یکے بعد دیگرے تین قدیم تحریریں ایک دوسری کے اوپر لکھی ہوئی تھیں اور سب سے نیچے قرآن کریم کی کچھ عبارتیں تھیں۔ مگر جب اس کے بعد دوسری عبارت انہی اوراق پر لکھی گئی تو پہلی عبارت کو نرم پتھر کے ساتھ رگڑ کر محو کر دیا گیا۔ پھر مرور زمانہ سے وہ پہلی تحریر کچھ دھیمی سی نظر آنے لگی۔ ہوتے ہوتے یہ اوراق ڈاکٹر منگانا کی نظر کے نیچے آ گئے جو اپنی لیڈی دوست کے مہمان تھے۔ اور انہوں نے بڑی محنت کے ساتھ اس محو شدہ تحریر کو پڑھ کر ان اوراق کی عبارات قرآنی کو 1914ء میں ایک کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ جس کا نام انہوں نے ''لیور فرام تھری انشنٹ قرآنز'' یعنی ''تین قدیم قرآنوں کے اوراق'' رکھا اور یہ دعویٰ کیا کہ ان اوراق سے قرآن کریم کے مستند نسخہ میں جو آج ساری اسلامی دنیا میں مروج ہے اور دیگر نسخہ جات میں جو پہلے کسی زمانہ میں مروج تھے اختلاف ثابت ہوتا ہے۔

ڈاکٹر منگانا کی لیڈی دوست جو ان اوراق کی اصل مالکہ ہے بڑی جرأت سے اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ یہ اوراق ان نسخہ جات کے اوراق ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے پہلے مروج تھے اور جن کو حضرت عثمان نے خود چار یا پانچ مستند نسخے تیار کرانے کے بعد جلا دینے کا حکم دیا تھا تاکہ آئندہ جس قدر نسخہ جات قرآنی تیار ہوں وہ ان مستند نسخوں کی نقلیں ہوں۔ ڈاکٹر اگنس سمتھ لوئیس کا جو (ان اوراق کی مالکہ کا نام ہے۔) یہ خیال ہے کہ یہ اوراق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ نہیں لگے اور ان کے مالک نے قرآن کریم کی عبارات کو چمڑے کے کاغذوں پر سے مٹا کر کاغذات کو فروخت کر دیا۔ حضرت عثمان کے زمانہ کے بعد کے یہ کیوں نہیں ہو سکتے۔ اس کی وجہ ڈاکٹر لوئس کو سوائے اس کے کوئی نہیں مل سکی کہ اس قسم کی عبارات کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے وقت کے بعد لکھا جانا ایک بے معنی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر ان کا دوست ڈاکٹر منگانا اس بارہ میں زیادہ محتاط ثابت ہوا ہے۔ وہ صرف اس قدر کہتا ہے کہ ان مسودات کے بعض حصص کا آٹھویں صدی کی ابتدا کا ہونا (جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بہت بعد کا زمانہ ہے) اغلب ہے۔ وہ ان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پہلے کے لکھے ہوئے قبول کرنے کے لیے کسی صورت میں تیار نہیں۔ ہاں یہ کہتا ہے کہ ممکن ہے ان اوراق عثمانی سے جو جلنے سے کسی تدبیر سے بچائے گئے ہوں یہ اوراق نقل کیے گئے ہوں۔ مگر یہ بھی محض بطور ایک خیال کے پیش کیا گیا ہے اور کوئی قطعی فیصلہ اس بات پر دینے سے ڈاکٹر منگانا نے اپنے آپ کو روکا ہے۔

ان اوراق میں ذیل کی عبارات یعنی سورتوں کے ٹکڑے پائے جاتے ہیں:

الاعراف: 160-139، التوبة: 79-18، هود: 39-20، الرعد:43-18، إبراهيم: 8-1، الحجر: 99-85، النحل: 41-1 و128-80، بنی اسرائیل: 57-1، النور: 29-17، القصص:51-41، العنكبوت: 17-30، المؤمن: 85-78، حم:20-1، الدخان: 59-38، الجاثية: 20-1-

یہ حصص سارے کے سارے ایک ہاتھ کے لکھے ہوئے نہیں۔ بلکہ ڈاکٹر منگانا کی رائے میں چار مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ اور ان کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات کا بھی کچھ ذکر کیا گیا ہے۔ ایک مشترکہ خصوصیت سب کی یہ ہے کہ ان میں حرف ہمزہ نہیں پایا جاتا۔ کل اختلافات کو جو ان اوراق میں مستند نسخہ سے جو اسلامی دنیا میں مروج پائے جاتے ہیں ڈاکٹر منگانا نے تین حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ وہ ہے جس میں ایک لفظ کی بجائے دوسرا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں کوئی چھوٹا سا اختلاف واؤ کا ہونا یا نہ ہونا کی

بجائے فاکا ہونا یا اس قسم کے اختلاف دکھائے گئے ہیں۔ تیسرا حصہ وہ ہے جس میں کوئی لفظ زائد پایا جاتا ہے یا کوئی لفظ کم پایا جاتا ہے۔ حصہ اول میں چار اختلاف، حصہ دوئم میں تیس اور حصہ سوئم میں چار اختلاف دکھائے گئے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے میں حصہ دوئم کو لیتا ہوں۔ جس میں اختلافات کی تعداد زیادہ دکھائی گئی ہے۔

❀ کاتبوں کی غلطیاں

قبل اس کے کہ ان اختلافات پر بحث کی جائے ان کل اختلافات کے متعلق میں چند الفاظ یکجائی طور پر کہنا چاہتا ہوں۔ ان میں سے امر اوّل یہ ہے کہ قرآن کریم کے مختلف مسودات میں اختلافات دکھانے کے لیے صرف اس قدر دکھانا کافی نہیں کہ ایک مسودہ میں ایک لفظ اور طرح پر لکھا ہوا ہے۔ اگر اس سے اختلاف ثابت ہو جاتا ہے تو پھر اشیائے قدیم کے تاجروں سے چند اوراق خریدنے اور ان پر محنت اور ذہانت صرف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس قسم کے اختلافات آج چھپے ہوئے نسخہ جات قرآنی میں بھی دکھائے جا سکتے ہیں۔ جو کاتب کی غلطی کا نتیجہ ہیں۔ ہم یہ نہیں مانتے کہ پچھلے زمانہ کے کاتب فرشتے تھے۔ وہ بھی انسان تھے۔ بلکہ ذرائع علم و مقابلہ چونکہ اس قسم کے موجود نہ تھے جیسے ہمارے زمانہ میں ہیں اس لیے ان سے غلطی کا ہو جانا اور پھر اس کا درست نہ ہو سکنا اور بھی زیادہ قرین قیاس ہے۔ یہی تو وہ بات تھی جس کی اصلاح کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مختلف مسودات کو جو لوگوں نے اپنے اپنے طور پر رکھے ہوئے تھے جلوا دیا۔ کیونکہ ان لکھنے والوں سے کافی اہتمام درستی نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے آپ نے چار یا پانچ بڑے بڑے مرکزوں میں مستند نسخے قرآن شریف رکھوا دیئے تاکہ وہاں آسانی سے مقابلہ ہو کر صحیح نسخہ جات عالم اسلام میں شائع ہوں۔

تعجب ہے کہ اس امر پر جو ایک اعلیٰ درجہ کی دور اندیشی پر مبنی تھا آج حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حرف رکھا جاتا ہے۔ وہ زمانہ چھاپے خانوں کا تو تھا نہیں کہ ایک سرکاری ایڈیشن شائع کر دی جاتی اور اس کی کاپیاں کل اطراف عالم میں پہنچا دی جاتیں۔ صحت کا اہتمام جو کچھ ہو سکتا تھا وہ یہی تھا کہ بڑے بڑے مرکزوں میں صحیح نسخہ جات موجود ہوں اور ان کے ساتھ لوگ مقابلہ کر لیں۔ پس اگر کسی نسخہ میں کوئی فرق پایا جاتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ اختلاف قرآن میں ہے ایک احمقانہ حرکت ہے۔ اختلاف دکھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے کم سے کم تین نسخہ جات دکھائے جائیں جن میں ایک لفظ کی بجائے دوسرا لفظ ہے۔ یا کوئی لفظ دوسری طرح پر لکھا گیا ہے یا کسی لفظ کی کمی بیشی ہے۔ مثلاً ایک کاتب ومن کی جگہ فمن لکھ دیتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ قرآن کریم میں جو ومن لکھا ہے وہ غلط ہے بلکہ اس کا فمن لکھنا اس کی غلطی ہو گی۔ ہاں اگر کم سے کم تین مختلف کاتب دکھائے جائیں جنہوں نے ایک دوسرے سے یا ایک ہی نسخہ سے نقل نہ کیا ہو اور وہ تینوں ایک خاص موقعہ پر ومن کی بجائے فمن لکھتے ہوں تو سمجھا جائے گا کہ یہ ایک اختلاف ہے۔ پس سب سے اول اس اصول کا یاد رکھنا ضروری ہے کہ ایک کاتب کے ایک لفظ کو دوسری طرح لکھ دینے سے صرف یہی ثابت ہو گا کہ اس سے غلطی ہو گئی اور اس سے قرآن کریم میں کوئی اختلاف ثابت نہیں ہوتا۔

❀ مسودات منگانا کے متعلق قیاسات

دوسری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ موجودہ نسخہ جسے پیش کیا گیا ہے وہ کیا چیز ہے۔ وہ کوئی پرانی تحریر اس قسم کی نہیں جس کے متعلق یقین سے یہ کہا جا سکے کہ اسے کس نے لکھا اور کب لکھا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی عیسائی نے چند الفاظ میں تغیر و تبدل کر کے اس کو مسلمانوں میں شائع کرنے کی کوشش کی ہو اور کسی مسلمان کے ہاتھ آنے پر اس نے اس تحریر کو بوجہ ان غلطیوں کے ہی محو کر دیا ہو۔ یا خود اس عیسائی نے ہی اپنے آپ کو ناکام پا کر پھر ان حروف کو مٹا دیا ہو۔ ابتدائی زمانہ کے بعض عیسائی بزرگوں نے تو دین کی خاطر جھوٹ بولنے کو بھی جائز رکھا اور پھر جب خود کئی وضعی اناجیل بن سکتی ہیں جن کا وضعی ہونا دنیا کو مسلم ہے تو یہ کیوں ممکن نہیں کہ اسی طرح پر چند

آیات قرآنی میں بھی تغیر و تبدل کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کا اپنا وعدہ اس کلام الٰہی کی حفاظت کا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایسی کوشش کرنے والے کو ناکام کیا ہو۔ اس بات سے کہ یہ صرف چند ٹکڑے سورتوں کے ہیں کوئی کہیں سے اور کوئی کہیں سے۔ اور پھر چار مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے ہیں، اسی بات کی تائید ہوتی ہے یہ کوئی کامل جلد قرآن شریف کی نہیں ہے نہ پوری ایک سورت ہی ہے۔ تیسرا امر ضروری یہ دیکھنا ہے کہ اس مسودہ کی حیثیت کیا ہے۔ اس پر پہلے عربی عبارت لکھی گئی۔ پھر جب کسی دوسری عبارت کے لکھنے کی ضرورت پیش آئی تو اصل عربی عبارت کو نرم پتھر کے ساتھ چمڑے کے کاغذ کو رگڑ کر اس کاغذ کو صاف کیا گیا اور اس پر دوسری عبارت لکھی گئی۔ پھر اس پر کسی تیسرے زمانہ میں کوئی اور ہی عبارت لکھی گئی۔ سو اول تو اس قدر گڈمڈ میں اصل الفاظ کو پہچاننا ایک نہایت دشوار کام ہو جاتا ہے اور ہوشیار سے ہوشیار پڑھنے والے کو بھی غلطی لگ سکتی ہے۔ چہ جائیکہ ایک مخالف گواہ کے ہاتھ میں ایسے مسودہ کو دے کر سارا اعتبار شہادت کا اسی پر رکھا جائے کہ جو کچھ وہ کہہ دے وہ درست ہے۔ یہ کوئی قدیم زمانہ کی صفائی سے لکھی ہوئی تحریر نہیں کہ اس کو آسانی سے پڑھا جا سکے۔ اور اس میں کسی قسم کا شبہ واقع نہ ہو سکے۔ پھر پتھر سے رگڑنے میں یہ ظاہر ہے کہ بعض حروف کی سیاہی پھیل گئی ہو اور ایک حرف کے نقطوں نے اصل حرف کے ساتھ مل کر کوئی اور ہی شکل اختیار کر لی ہو۔ یا بعض حصص ایسے اڑ گئے ہوں کہ وہ دوبارہ نمودار ہونے کے قابل ہی نہ رہے ہوں۔ چنانچہ کئی سطروں کے کئی حصے اس طرح پر محو شدہ ان عبارات کے اندر موجود ہیں مثلاً صفحہ 6 پر سورۃ الاعراف کی آیت 159 اور 160 ڈاکٹر منگانا کے نسخہ میں یوں ہے:

((وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰی اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِاا --- وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ وَقَطَّعْ --- هُمْ --- اَسْبَاطِ --- اُمَمًا وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی اِذِا سْتَسْقَ --- قَوْمُهٗ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ))

اس کے بعد سارے الفاظ محو ہیں۔ اب اصل عبارت یوں ہے:

((وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰی اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰی اِذِا سْتَسْقٰهُ قَوْمُهٗ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ))

ان چند الفاظ میں [بِالْحَقِّ] کا صرف با پڑھا جاتا ہے باقی محو ہو گیا ہے [قَطَّعْنٰهُمْ] میں سے پہلا اور پچھلا حصہ موجود ہیں درمیانی حصہ محو ہے [اَسْبَاطًا] کا آخری الف محو ہے [اسْتَسْقٰهُ] میں آخری حرف محو ہے اور [قَطَّعْنٰهُمْ] کے پہلے جو (و) ہے وہ محو ہے۔ اب یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ اس نسخہ کے لکھنے والے کو قرآن سے اختلاف ہے۔ وہاں [قَطَّعْنٰهُمْ] کے پہلے و ہے اس نسخہ میں نہیں۔ بلکہ جس طرح دوسرے الفاظ کے بعض حصص بالکل محو ہو گئے یہ بھی محو ہو گیا۔ اس کی مثالیں کثرت سے انہیں اوراق سے دی جا سکتی ہیں۔ مگر ہماری غرض کے لیے یہ ایک مثال ہی کافی ہے۔ اسی طرح جب کاغذ صاف کر کے دوسری عبارت لکھی گئی تو بالکل قرین قیاس ہے کہ اس دوسری عبارت کے بعض شوشے یا نقطے (کیونکہ اس میں بھی نقطے ہیں) پہلے پھیکی سیاہی کے ساتھ مخلوط ہو کر کوئی اور شکل اختیار کر چکے ہوں۔ غرض ایک عبارت کو پتھر سے رگڑ کر محو کرنے میں پھر اس پر دوسری عبارت لکھنے میں کسی قسم کے تغیر آجانا قرین قیاس ہے۔ اس لیے ایسا مسودہ قرآن کریم کے مستند نسخہ کے خلاف جس پر تحریر اور حافظہ کل اسلامی دنیا کا متفق ہو بطور شہادت پیش کرنا کسی عقلمند کا کام نہیں۔

❀ پڑھنے والوں کا تعصب

چوتھی بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ اس مسودہ کے جو ایسی گڈمڈ حالت میں ہے پڑھنے والے کون ہیں۔ ایک ڈاکٹر منگانا اور دو ان کی دوست لیڈیاں۔ جو تینوں بوجہ ان خیالات کے جو اسلام کے خلاف ان کے دلوں میں بچپن سے جاگزین ہیں ایک رائی کا پہاڑ بنانے کو تیار ہیں۔ ایسے لوگوں کی نظر ناقدانہ کہاں ہو سکتی ہے۔ چاہیے تھا کہ بے لوث شہادت اپنے اس پڑھنے پر پیش کی جاتی۔ اس کی میں

ابھی مثالیں دوں گا کہ کس طرح پر تعصب نے ان کی نظر کو وہ کام کرنے سے روکا ہے جو ایک منصف کی نگاہ آسانی سے کر سکتی تھی۔ پس جو نسخہ پیش کیا جاتا ہے نہ اس کے لکھنے والے کی شہادت قابل اعتبار ہے نہ خود نسخہ ایسا کہ اس کی بنا پر کسی عدالت میں شہادت قابل اعتبار سمجھی جائے۔ نہ اس نسخہ کا پڑھنے والا ایسا جو بے تعصب ہو کر شہادت دے سکے۔ اس قدر مشکلات کے اندر اس نسخہ کو قرآن کریم میں اختلافات کی شہادت کے طور پر پیش کرنا ایک مجنون کی بڑ سے بڑھ کر کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

❀ ان مسودات کے اختلافات، اختلافات قراءت میں سے نہیں

ایک اور بات جو ان اختلافات پر روشنی ڈالتی ہے یہ ہے کہ جس قدر اختلافات ڈاکٹر منگانا نے دکھائے ہیں وہ ان قرآنوں میں سے نہیں جن کا تحریر میں لانا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منع کر دیا تھا۔ اور جس روک کے لیے انہوں نے مستند نسخوں کے علاوہ دوسرے نسخے جلا دیئے تھے۔ ایک ہی بات تھی جو ڈاکٹر منگانا کی اس دریافت کو کچھ وقعت کے قابل ٹھہرا سکتی تھی اور وہ یہ کہ اس نسخہ میں کچھ مختلف قراءتیں پائی جاتی جن کی اجازت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس نسخہ کے اختلافات مزعومہ ان مختلف قراءتوں میں سے ایک کو بھی اپنے اندر نہیں رکھتے۔ اور اس موقعہ پر وہی بات کہنی پڑتی ہے جس کو میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں کہ جو حملہ قرآن کریم کی حفاظت پر کیا گیا ہے اس کی تردید خود دوسرے معترض ہی کر دیتے ہیں۔ اگر یہ نسخہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پہلے کا ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس میں ان مختلف قراءتوں میں سے کوئی قراءت نہیں پائی جاتی جن کا اس وقت رواج تھا۔

❀ ان مسودات کے کاتبوں کی ناواقفیت

جن ہاتھوں نے یہ نسخے لکھے ہیں ان کے متعلق بھی چند الفاظ ضروری ہیں۔ اصل مسودات تو ہمارے سامنے نہیں اور جو دو صفحات نمونہ کے دیئے گئے ہیں ان سے کافی طور پر اصل تحریر پر روشنی نہیں پڑتی۔ لیکن جس طرح ڈاکٹر منگانا نے ان کو پڑھ کر ہمارے سامنے رکھا ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے کسی قدر ناواقف ضرور ہیں۔ ڈاکٹر منگانا نے بعض باتوں کو اس وقت کی خصوصیات میں داخل کیا ہے مثلاً شئی کی جگہ شای کا لکھنا یا یوحی کی جگہ یوحا لکھنا یا اما کی جگہ ان ما لکھنا۔ قران کی جگہ [قرن] لکھنا [یَنَالُوْا] کی [نَیْلَلُوْا] لکھنا [اذاننا] کی جگہ [اذنا] لکھنا۔ [عِلْم] کی جگہ [عِیْلَمٌ] لکھنا۔ مگر یہی باتیں ناواقفیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اول تو قرآن کریم کے لکھنے کی طرز ابتدا سے ایک ہی چلی آئی ہے اور جو لفظ جس طرح کاتب نے لکھ دیا ہے اسی طرح آج تک قرآن شریف میں لکھا جاتا ہے۔ مثلاً [صَلٰوۃ] کو دو چار مقامات پر [صَلَات]۔ [قَالَ] کو بعض جگہ [قٰلَ]۔ پس کوئی باخبر کاتب ایسی غلطی نہ کر سکتا تھا۔ پھر یہاں معمولی اختلاف نہیں بلکہ صاف طور پر کاتب بے خبر نظر آتا ہے۔ ورنہ [عِلْمَ] کو [عِیْلَمْ] کوئی واقف کاتب نہ لکھ سکتا تھا۔ نہ [قران] کو [قرن] نہ [یَنَالُوْا] کو [نِیْلَلُوْا] وغیرہ۔

اسی طرح بعض وقت دو الفاظ کو جو مل نہیں سکتے ملا دیا ہے۔ مثلاً: [یَوْمَ الْفَصْلِ] کو [یَوْمَلْفَصْلِ- یَھْدِیْھِمْ سَبِیْلَا کو یَھْدِیْھِمْسَبِیْلاَ- ھمْ بِاٰیٰتِنَا کو ھمْبِاٰیٰتِنَا- ذَالِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ فَلَا] کے آخری حصہ میں [الْقَیِّمُ فَلَا] اور [فَلَا] کو ملا کر [الْقَیِّمُفَلاَ لَھُمْ سَو عْمَالَھُمْ کو لَھمْسَوَّاَ عْمَلَھمْ فِیْکُمْ سَمّٰعُوْنَ کو فِیْکُمْسَمّٰعُوْنَ] لکھ دیا ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں۔ اسی طرح وَاتَّبَعُوْہُ کو وَاتَّبِعْہُ لکھ دیا ہے۔ جُنُوْدًا کو جُنْدًا لکھ دیا ہے۔ یُحَادُّوْ کو یَحِیْدُوْ لکھ دیا۔ اَلصَّلٰوۃُ کو الصَّیْلٰوۃ لکھ دیا ہے۔

اسی قسم کی چند مثالیں اوپر بھی آچکی ہیں جن کو ڈاکٹر منگانا نے اس وقت کی طرز تحریر کی خصوصیت قرار دیا ہے۔ مگر یہ بالکل غلط

ہے۔ مثلاً عِلْم کو عِیْلَم لکھنا طرز تحریر نہیں۔ میں نے بطور نمونہ یہ صرف چند مثالیں دی ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ شاید اس وقت قرآن شریف میں یہ الفاظ اسی طرح لکھے جاتے ہوں یہ بالکل غلط ہے۔ قرآن کریم کی طرز تحریر میں آج تک برابر پہلی طرز تحریر کا تتبع کیا جاتا ہے مثلاً کتاب کو کتٰب ہی لکھا جاتا ہے سُبْحَانَ کو سُبْحٰنَ اور اسی قسم کی صدہا مثالیں ہیں۔ بلکہ ایک لفظ جو ایک جگہ ایک طرز پر لکھا گیا ہے اور دوسری جگہ دوسری طرز پر تو اس کا برابر تتبع ہوتا ہے۔ مثلاً صَلٰوۃ کا لفظ قرآن کریم میں عموماً و کے ساتھ ہی لکھا جاتا ہے مگر سورۃ الانعام کے آخر میں صَلَاتِیْ لکھا ہے صَلَوَتِیْ نہیں لکھا۔ حالانکہ ھود آیت 89 میں صَلٰوتُكَ ہے صَلَاتُكَ نہیں۔ اور الانعام 93 میں صَلَاتُھُمْ ہے صَلٰوتُھُمْ نہیں۔ اور النور 41 میں صَلَاتَہٗ ہے صَلٰوتَہٗ نہیں۔ اسی طرح سورۃ البقرہ میں اِبْرَاھِیْمَ کو اِبْرٰھِمَ لکھا ہے۔ لیکن دوسرے مقامات پر اِبْرَاھِیْمَ لکھا ہے یعنی یا کے ساتھ۔ قرآن کریم میں قال کا لفظ عموماً اسی طرح الف کے ساتھ لکھا ہے۔ لیکن بعض موقعہ پر اس کو قٰل لکھا ہے اور اب تک اس خاص موقعہ پر اسی طرح لکھا جاتا ہے۔ اسی قسم کی بیسیوں مثالیں ہیں جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی طرز تحریر محفوظ چلی آتی ہے اور اسی طرز تحریر کو چھوڑنا ناواقفیت کی علامت ہے۔ اس لیے یہ نتیجہ بالکل صحیح ہے کہ اگر ڈاکٹر منگانا نے اصل الفاظ کو پڑھنے میں کوئی تصرف نہیں کیا۔ اگر حروف کے رگڑنے میں سیاہی پھیل کر یا بعض شوشے یا نقطے بالکل محو ہو کر الفاظ کی صورت بدل نہیں گئی۔ اگر اوپر والی تحریروں سے کچھ اصل تحریر میں خلط نہیں ہو گیا تو ان مسودات کے لکھنے والا کوئی جاہل آدمی تھا اور یا یہ کسی عیسائی کی جھوٹی دینداری کا نتیجہ ہیں۔

❀ قسم دوئم کے اختلافات

اب میں ان اختلافات کو الگ الگ لیتا ہوں اور سب پہلے قسم دوم کے اختلافات پر بحث کرتا ہوں جن کی تعداد 30 بتائی گئی ہے۔ اس میں اول تو وہ الفاظ ہیں جن میں محض ڈاکٹر منگانا کو غلطی لگی ہے بلکہ میں کہوں گا کہ جن میں ڈاکٹر منگانا نے مغالطہ دینے کی کوشش عمداً کی ہے۔ مثلاً اس کا سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں لفظ برکنا کا اختلاف دکھانا۔ حالانکہ یہ اختلاف کوئی نہیں۔ ڈاکٹر منگانا کہتا ہے قرآن کریم میں بارکنا ہے اور اس کے دریافت کردہ اوراق میں برکنا اور پھر برکنا کے معنی وہ گھٹنے ٹیکنے کے کرتا ہے۔ یہ محض حماقت ہے قرآن کریم کی طرز تحریر میں بارکنا نہیں لکھا جاتا۔ بلکہ اسی لفظ کو اب تک بٰرکنا لکھا جاتا ہے۔ پرانی طرز تحریر میں اوپر کا الف نہیں لکھا جاتا تھا۔ مگر پڑھنے میں آتا تھا۔ کیونکہ قرآن کریم صرف تحریر میں محفوظ نہ تھا۔ بلکہ ابتدا سے ہی تحریر کے ساتھ حافظوں میں بھی محفوظ تھا۔ اگر اسی قسم کے اختلاف نکالنے تھے تو ڈاکٹر منگانا کو اور بھی بہت سے اختلاف مل سکتے تھے۔ مثلاً التوبہ 70 میں گو ہمارے قرآنوں میں طرز تحریر خَلَاقَھِمْ اور خَلَاقَكُمْ ہے مگر ان اوراق میں خلقھم لکھا ہے۔ اس کو کیوں ڈاکٹر منگانا بجائے خلاق کے خلق پڑھ کر پیدائش معنی نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ معنی تو کچھ بن بھی جاتے ہیں۔ مگر الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَہٗ کے معنی کچھ بھی نہیں بنتے۔ کیونکہ اگر اس کو بٰرکنا نہ پڑھیں برکنا پڑھیں تو گویا خدا کہتا ہے کہ مسجد حرام جس کے گرد ہم نے گھٹنے ٹیکے تھے جو بالکل بے معنی فقرہ ہے۔ حالانکہ بٰرکنا کے معنی صاف ہیں کہ ہم نے برکت دی تھی۔

اسی قسم کا ایک اور فرق ہے یعنی سورہ نحل آیت 22 میں ڈاکٹر منگانا کہتا ہے کہ ایّان کی بجائے این لکھا ہے حالانکہ وہ درحقیقت ایّن ہے۔ تعجب ہے کہ وہی ڈاکٹر منگانا جو اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اس لکھنے والے کی طرز تحریر بھی ایسی ہے کہ وہ قراٰن کو قرن لکھتا ہے وہ اس قدر موٹی بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ ایّان دوسری طرح پر بھی لکھا جا سکتا ہے یعنی ایّن۔ اس کی بیسیوں مثالیں اسی تحریر میں موجود ہیں۔ مثلاً تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ کو تَصْرِیْفِ الرِّیْحِ لکھا ہے۔ حالانکہ مراد الرِّیٰحِ ہی ہے۔ اور کلماتہ کو کلمتہ لکھا ہے حالانکہ مراد

کلمٰتہ ہے اور الاعراف 141 میں بِکَلَامِی کو بکلمی لکھا ہے اور وہیں 142 اور 149 میں اَلْاَلْوَاح کو اَلْاَلَوْح لکھا ہے اور لِمِیْقَاتِنَا کو لِمَقْتِنَا لکھا ہے۔ وہاں ڈاکٹر منگانا نے یہ معنی کیوں نہ کر لیے کہ موسیٰ ہماری بیزاری کے لیے آئے؟ صرف اس لیے کہ یہ معنی بن نہ سکتے تھے۔ پھر جب اس لکھنے والے کی طرز تحریر ہی یہ ہے اور ڈاکٹر منگانا خود اس بات کو اس کی خصوصیات میں سے بتاتا ہے۔ تو اسی طرز تحریر کی بیسیوں مثالوں میں سے ایک دو کو اختلاف کے رنگ میں پیش کر دینا محض شرارت نہیں تو اور کیا ہے۔

بہت سی مثالیں اس قسم کی دی گئی ہیں کہ و کی جگہ ف یا ف کہ جگہ ز ہے یا ویاء کو بڑھا دیا یا چھوڑ دیا گیا ہے۔ یا یوں ہی کوئی اور چھوٹا سا فرق ہے۔ مثلاً یہ کہ سورہ الرعد 26 میں اللہ کی جگہ واللہ ہے۔ لکھنے والے کو معمولی غلطی لگ گئی ہے۔ النحل 17 میں افلا کی جگہ اولا ہے پتھر سے رگڑنے میں نقطہ اڑ گیا ہے اور فا۔ل سے الگ ہو گیا ہے۔ یا یہ بھی محض غلطی ہے جو پورا یاد نہ ہونے سے لگ سکتی ہے۔ ابراہیم 6 میں ضلال کی جگہ ضل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو شخص اذاننا کو اذنا لکھ سکتا ہے جیسا کہ ڈاکٹر منگانا نے خود مثال دی ہے اور جنوداً کو جنداً لکھ سکتا ہے اور وَاتَّبَعُوْا کو وَاتَّبَعَهُ لکھ سکتا ہے کیا ضَلَالٌ کی جگہ ضَلٌ لکھ دینا اس سے کچھ بعید ہے۔ ایسا ہی الحجر 94 میں وَاَعْرَضَ کی جگہ وَاَعْرَضْنَ ہے جہاں ممکن ہے کہ نقطہ کسی اوپر کی تحریر سے زائد پڑ گیا ہے۔ پھر الرعد 33 میں زَيَّنَ کی جگہ فَزَيَّنَ ہے جو صریح غلطی ہے کیونکہ فزین پڑھ کر وہاں عبارت ہی نہیں بن سکتی۔ اصل عبارت ہے بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ اس کی بجائے اگر یوں پڑھیں بَلْ فَزُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا تو یہ عربی ترکیب نہیں۔ بل اور ف دونوں میں سے ایک ہی رہ سکتا ہے۔ پھر ایک اختلاف یہ دکھایا گیا ہے کہ ہود 24 میں الاخسرون کو لخسرون لکھا ہے۔ حالانکہ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ الأخسرون کو لکھنے والے نے حسب معمول اَخْسَرُوْنَ کا الف چھوڑ کر لَخْسِرُوْنَ لکھا ہے۔ اس میں سے پہلا الف چونکہ پچھلی سطر کے اخیر پر آیا ہے وہ ادھر رہ گیا اور لَخْسِرُوْنَ سطر کی ابتدا میں آ گیا ہے۔ پھر وہ سطر کے آخر کا الف اڑ گیا ہے۔ اس کی مثال اس سے دو سطر اوپر ہی موجود ہے جہاں الظٰلِمِيْنَ کا الف پہلی سطر کے آخر پر ہے اور اگلی سطر کی ابتدا میں صرف لَظٰلِمِيْنَ ہے۔ یہی حال اس سے اگلے اختلاف اَخْبَتُوْا اور خَبَتُوْا کا ہے۔ یہاں پہلا الف ہمزہ کی بجائے سمجھ کر لکھنے میں ترک کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس ساری طرز تحریر میں ہمزہ کہیں بھی نہیں لکھا گیا۔ یا پتھر کی رگڑ سے محو ہو گیا ہے۔ پھر ایک اختلاف النحل 38 میں فَانْظُرُوْا کی جگہ وَانْظُرُوْا لکھا ہے جو اگر غلطی نہیں تو محض ف کا نقطہ بالکل محو ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد کی دو مثالیں جیسی التوبہ 36 میں فِيْهِنَّ کی جگہ فِيْهَا ہونا اور فَاَصَابَهُمْ کی جگہ فَاَصَابَتْهُمْ ہونا محض کاتب کی غلطیاں ہیں۔

بارہواں اختلاف اور انیسواں پھر ڈاکٹر منگانا کی تعصب کے یرقان سے بیمار آنکھ کا نتیجہ ہے۔ سورہ توبہ آیت 24 ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ اور آیت 37 وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ۔ اب پڑھنے میں يَهْدِىْ کی یا دونوں جگہ نہیں پڑھی جاتی۔ کیونکہ وہ اَلْقَوْمَ کے ساتھ مل جاتی ہے۔ یا تو اس خیال سے لکھنے والے نے اسے نہیں لکھا اور یا یا ویسے ی اڑ گئی ہے۔ بہر حال بجائے يَهْدِى الْقَوْمَ کے يَهْدِ الْقَوْمَ ہے۔ مگر ڈاکٹر منگانا نے ناواقف پبلک کی آنکھوں میں خاک ڈالتے ہوئے اسے ایک اختلاف عظیم ٹھہرایا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ وہ اسے لَا يَهْدَا ایک لفظ لِقَوْمٍ دوسرا لفظ بناتا ہے۔ جہاں ل حرف جر قرار دیا ہے ھدء یھدء کے معنی ہیں حالت سکون میں ہونا۔ اور اس لیے معنی یوں کرتا ہے کہ خدا فاسق لوگوں کی طرح (اور دوسری جگہ کافر لوگوں کی طرف) حالت سکون میں نہیں ہو گا۔ الگ اس سے کہ یہ عبارت بے معنی ہو جاتی ہے جس سے شاید ڈاکٹر منگانا کو کچھ غرض نہیں کیونکہ کوئی لفظ بامعنی بن جائے سہی خواہ وہ سیاق سباق عبارت کے لحاظ سے کچھ معنی نہ دے۔ ڈاکٹر منگانا کے لیے یہی کافی ہے۔ ڈاکٹر منگانا پر

بقول کسے حافظ نباشد کی مثال صادق آتی ہے۔ کیونکہ یھدء میں ہمزہ تو آخر میں آتا ہے اور ہمزہ کے متعلق وہ تسلیم کر چکا ہے کہ اس طرز تحریر میں ہمزہ نہیں لکھا گیا۔ پھر اب ایک اختلاف بنانے کے لیے ہمزہ بھی لکھ لیا گیا ہے۔ لیکن چلویوں بھی مان لیں تو غالباً ڈاکٹر منگانا کے اہل زبان ہونے نے اسے اتنی مدد بھی نہ دی کہ اسے یہ خیال رہتا کہ دونوں صورتوں میں قوم کی صفت الْكٰفِرِيْن اور الْفَاسِقِيْن پڑی ہوئی ہے۔ اور اگر صفت پر ال ہے تو موصوف ال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ پس القوم میں ایھد کا حصہ نہیں بن سکتا اور نہ ل حرف جر بن سکتا ہے۔ بلکہ ال تعریفی جس طرح الْفَاسِقِيْن اور الْكٰفِرِيْن کے ساتھ ہے اسی طرح موصوف القوم میں بھی ہونا ضروری ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر منگانا نے کس قدر اپنے مسلمات کے خلاف، قواعد کے خلاف اختلاف بنانے کی کوشش کی ہے۔ جس شخص کے دل کی حالت ایسی ہو وہ الفاظ اور حروف کو ایک ایسے مختلف مسودہ میں درست کس طرح پڑھ سکتا ہے اور اس کی شہادت کس طرح قابل اعتبار ہو سکتی ہے۔

اس سے آگے جو اختلاف دکھایا ہے وہ بھی محض ایک مغالطہ ہے۔ بنی اسرائیل 49 میں ڈاکٹر منگانا کہتا ہے ءانا کی بجائے انا لکھا ہے۔ مغالطہ کے لیے ڈاکٹر منگانا ءانا کا اانا لکھتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ خود کہہ چکا ہے کہ ہمزہ اس طرز تحریر میں بالکل نہیں لکھا گیا۔ اس لیے اگر وہ قرآن شریف کے لفظ کو درست طور پر ء انا لکھتا تو اس کی یہ تحریر ہی اس کے اعتراض کا جواب ہو جاتی۔ پس اس نے محض دھوکا دینے کے لیے ء انا کی بجائے اانا لکھ دیا ہے اور پھر اعتراض کر دیا ہے۔ ﴿الا تعتدوا﴾ کی جگہ ﴿فلا تعتدوا﴾ (بنی اسرائیل: 24)، ومن کی جگہ فمن (التوبہ: 23) معمولی اختلاف سہو کاتب سے ہے یا ڈاکٹر منگانا کے پڑھنے میں غلطی ہے۔ مثلاً اول الذکر مثال کو لے لو۔ اصل الفاظ یوں ہیں: ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ﴾ اب اگر الا کی جگہ فَلَا پڑھیں تو عبارت درست نہیں رہتی۔ ہود 31 میں اَرَاكُمْ کی جگہ اَرَكُمْ کو اختلاف بتانا بھی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ارا کم لکھا جاتا ہے۔ کاتب نے حسب معمول اوپر کا الف نہیں لکھا۔ ڈاکٹر منگانا نے اسے اختلاف ٹھہرا کر الٹ پلٹ معنے کر دیئے۔ ہود: 34 جادلتنا کی جگہ جادلت ممکن ہے محض آخری نا کے محو ہو جانے سے رہ گیا ہو یا کاتب کی غلطی ہو۔ المومن: 5 میں فلم يك ينفعهم کی جگہ فَلَمْ يَكُنْ نَفَعَهُمْ بھی اسی قبیل سے ہے۔ السجدہ: 11 میں فقال کی جگہ فقیل اختلاف نہیں محض دوسری طرز تحریر ہے۔ اگر يُحَآدُّوْ کی جگہ يَحِيْدُوْا اختلاف نہیں (التوبہ: 6-4) تو قال کی جگہ قیل بھی اختلاف نہیں۔ خصوصاً اس لیے کہ قرآن کریم میں بعض جگہ قال کی بجائے قل بھی لکھا ہے۔ ممکن ہے لکھنے والے کو اس سے غلطی لگی ہو۔ السجدہ: 5 میں وہ اننا کی جگہ انما صرف ننا کے دوسرے نقطہ کے نون کے دندانہ کے ساتھ مل جانے سے نما کی شکل ہو گئی ہے ورنہ اصل عبارت میں فاعمل اننا عملون تو ایک معنی رکھتا ہے کہ تو عمل کر ہم بھی عمل کرنے والے ہیں۔ مگر فَاعْمَلْ اِنَّمَا عٰمِلُوْنَ کے کوئی معنی نہیں بنتے۔ و قال کی جگہ قال (العنکبوت: 24) يَجْعَلْكُمْ کی جگہ جَعَلْكُمْ (النحل: 95) وما کی جگہ ما (التوبہ: 54) واذا کی جگہ واذ (النحل: 87)۔ یہ سب اول حرف اور آخری سطر میں آخری حرف کے بکلی محو ہو جانے کا یا محض سہو کاتب کا نتیجہ ہے۔ اثیم کی جگہ اثم (الدخان: 44) طرز تحریر کا اختلاف ہے۔ کیونکہ اَثِيْمٌ کو اِثْمٌ بھی لکھا جا سکتا ہے۔ جیسے اِبْرَاهِيْمَ کو ابراھم لکھا جا سکتا ہے۔ النحل: 12 میں عملت کی جگہ عملته یا اوپر کی تحریر کے خلط سے بن گیا ہے یا صریح غلطی ہے۔ اور النحل: 30 میں بلیٰ کی جگہ بل بالکل بے معنی ہے۔ اس لیے یا تو کاتب کی نرالی طرز تحریر کا نتیجہ ہے اور یا بلی میں لام اور یا کا درمیانی دندانہ محو ہو گیا ہے۔ ایک انکار پر بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ تو جواب ہو سکتا ہے لیکن بل إن الله عليم ترکیب کے لحاظ سے بھی درست نہیں۔ کیونکہ بل کے بعد ان نہیں چاہیے۔

❀ قسم اوّل کے اختلافات

قسم اول کے اختلافات چار ہیں جن میں دو اختلاف ایک آیت میں تجویز کیے گئے ہیں اور بڑی چالاکی سے ایک اختلاف بنانے کے لیے دوسرا اختلاف خود تجویز کر لیا گیا ہے۔ الجاثیہ میں انیسویں آیت یوں ہے اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنَوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اس کی بجائے ڈاکٹر منگانا تجویز کرتے ہیں اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنَوْا عَنْكِ مِنَ اللكم هكما اس تحریر میں ڈاکٹر منگانا کا یہ دعویٰ ہے کہ شیئا کی بجائے واقعی هكما لکھا ہوا ہے۔ مگر کیا اللہ کی بجائے اللكم لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر منگانا کے مسودہ کو پڑھنے سے اس سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ کیونکہ اصل مسودہ میں یہ صاف اعتراض ہے کہ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ کے بعد کا لفظ پورا پڑھا نہیں جاتا بلکہ اس کا صرف ایک حصہ اور پڑھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ کم ڈاکٹر منگانا نے اپنے دماغ موجد سے تجویز کر لیا ہے۔ حالانکہ جس قدر حصہ لفظ کا پڑھا جاتا ہے وہ صاف بتاتا ہے کہ یہ لفظ اللہ ہے صرف آخری دندانہ کا اڑا ہوا ہے۔ یہ صریح بے ایمانی نہیں تو اور کیا ہے۔ جب اصل عبارت میں اللہ کا لفظ موجود ہے اور ایک مخلوط اور دہلے ہوئے مسودہ میں اللہ کا پہلا حصہ الل صاف پڑھا جاتا ہے تو ایک منصف مزاج پڑھنے والا مجبور ہو گا کہ اسے اللہ ہی مانے۔ مگر چونکہ ایک بے ربط لفظ هكما کے کچھ معنی بنانے تھے اس لیے صریح تحریف کر کے یہ کہہ دیا کہ اللہ کی بجائے اللكم ہے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ اس تحریف سے بھی ڈاکٹر منگانا کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللكم هكما جس کے معنی ڈاکٹر منگانا نے یہ کیے ہیں کہ تمسخر کرتے ہوئے وہ تیرے لیے ایک مکے کی جگہ نہیں لیں گے۔ خود ایک بے معنی فقرہ ہے۔

ممکن ہے پہاڑی تعلیم کی دائیں گال کا تھپڑ ڈاکٹر صاحب کو یاد آ گیا ہو۔ ورنہ عبارت اس صورت میں بے معنی ہے۔ بات صرف اس قدر ہے کہ شیئا کا لفظ کچھ نقطوں اور دندانوں کی سیاہی پھیل جانے اور کچھ اوپر کی تحریر سے گڈمڈ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر منگانا نے خدا جانے کتنی لغت کی کتابیں تلاش کر کے اس کو ایک بامعنی لفظ بنایا یعنی هكم جس کے معنے تمسخر کے ہیں۔ مگر چونکہ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنَوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ هكما کے کچھ معنے نہ بنتے تھے اس لیے کچھ تحریف سے مدد لی اور اللہ کی بجائے اللكم لکھ دیا۔ یہ ہے ان لوگوں کی تحقیق کی حالت۔ حالانکہ اسی قسم کا محاورہ جہاں شیء کا لفظ آخر میں آتا ہے قرآن کریم میں کئی جگہ موجود ہے۔

تیسرا اختلاف قسم اول میں التوبہ کی آیت 43 میں دکھایا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ وتعلم کی جگہ ومنهم ہے۔ وہاں بھی تحریف ہی ڈاکٹر صاحب کی معاون ہوئی۔ الفاظ قرآنی یوں ہیں و تعلم الكاذبين۔ ڈاکٹر منگانا اپنے مسودہ میں بتاتا ہے کہ الكاذب تک تو پڑھا جاتا ہے مگر آخری ین محو ہو چکے ہیں۔ اب تَعْلَمُ کو مِنْهُمْ بنانے میں ایک دقت پیش آتی تھی یعنی اگر الكاذبين ہی پڑھا جائے تو وَمِنْهُمُ الْكَاذِبِيْنَ درست عبارت نہیں بنتی۔ اس لیے ڈاکٹر منگانا نے جھٹ بجائے الكاذبين کے الكاذبون بنا دیا۔ پس ان کا کذب تو خود اَلْكَاذِبُوْنَ کے بنانے سے ظاہر ہو گیا۔

صرف ایک مثال ایسی دی گئی ہے جہاں واقعی لفظ کی تبدیلی بتائی گئی ہے یعنی یہ کہ الاعراف: 154 میں بجائے وَفِيْ نُسْخَتِهَا هدًى وَّرَحْمَةٌ کے وَفِيْ نُسْخَتِهَا هدًى وسَلَمٌ ہے۔ سو اگر ڈاکٹر منگانا نے اس لفظ کو تعصب کی پٹی کھول کر پڑھا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ کاتب کی صریح غلطی ہے۔ کوئی قراءت هدًى وَسَلَمٌ کی ہمیں نہیں ملتی۔ اور قرآن کریم میں هدى و نور یا هدى و رحمة تو آیا ہے مگر هدى وسلم کسی جگہ نہیں آیا۔

❀ اختلافات کی قسم سوم

اب تیسری قسم کے اختلافات کو لیتے ہیں۔ سب سے پہلے کہا جاتا ہے کہ النحل: 93 میں قرآن کریم میں ہے يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ مگر

ڈاکٹر منگانا کے نسخہ میں ہے یُضِلُّ اللّٰہُ مَنْ یَشَاءُ اگر ہمارے پاس کوئی اور قرینہ نہ ہوتا تو بھی ہم کہتے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے۔ جب تک کہ اس کی تائید کرنے والا کوئی اور نہ ہو۔ مگر یہاں تو قرینہ بھی صاف ہے کیونکہ یہاں عبارت یوں ہے وَّلٰکِنْ یُّضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ۔ پس اگر یضل کے بعد اللہ کا لفظ بڑھایں تو دونوں فقروں کی موزونیت باقی نہیں رہتی۔ بہر حال کسی کاتب کے ایک لفظ زائد لکھ دینے سے یہ ثابت نہیں ہوا کرتا کہ اصل غلط ہے اور نقل درست۔ اور نہ آج تک کسی عدالت میں اس طرح پر اصل کو غلط تسلیم کیا گیا ہے۔ غلطی نقل کی سمجھی جائے گی اور اصل کی غلطی کے لیے کوئی اور واقعات تائیدی ہونے چاہئیں جن سے غلطی کا ثبوت ملے۔

ایسا ہی التوبہ:38 میں ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَالَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ﴾ میں ڈاکٹر منگانا کے نسخہ کے کاتب نے الفاظ مَالَکُمْ سہواً چھوڑ دیئے ہیں۔ اس پر ڈاکٹر منگانا اچھل پڑے کہ دیکھو ثابت ہو گیا کہ اصل قرآن میں الفاظ مَالَکُمْ زائد ہیں۔ یہ ان لوگوں کی منطق اور یہ ان کا استدلال ہے۔ اس بات کا قطعی ثبوت خود اسی نسخہ سے ہمیں مل جاتا ہے۔ کیونکہ اسی سورت کی آیت 33 میں ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ﴾ میں لفظ ھوَ کاتب نے چھوڑ دیا۔ اور پھر جیسا کہ ڈاکٹر منگانا کو اعتراف ہے کہ یہ لفظ ''حاشیہ'' پر بڑھایا گیا۔ حالانکہ اصل بات صرف اس قدر ہے کہ ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ﴾ سے چونکہ سطر شروع ہوتی ہے اس لیے جو لفظ ھو ابتدا سے رہ گیا تھا وہ مجبوراً حاشیہ پر ہی جانا تھا اور ہے، در حقیقت وہ ابتدائے سطر میں ہونا چاہیے۔ اب یہ بات کہ یہ مختلف ہاتھ کا ہے اگر محض اسی تعصب کا نتیجہ نہیں جس کی ہم کئی مثالیں دیکھ چکے ہیں تو بھی اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ غلطی دیکھ کر کسی نے درست کر دیا۔ خود کاتب نے درست نہ کیا۔ کسی دوسرے نے کر دیا۔ بہر حال معلوم ہوا کہ غلطی کو تسلیم کر لیا۔ پس اسی طرح اگر مَالَکُمْ کے لفظ رہ گئے تو کیا اندھیر آ گیا۔ سہو کاتب کو اختلاف بتانا خود اس بات پر شاہد ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت پر حملہ کرنے کے لیے کن کوتاہ ہتھیاروں سے ان لوگوں کو کام لینا پڑتا ہے۔

ایک تیسرا لفظ اسی طرح رہا ہوا اسی سورت کی آیت 36 میں ہے جہاں بجائے ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِکِیْنَ کَآفَّۃً کَمَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ کَآفَّۃً﴾ کے یوں لکھ دیا ہے وَقَاتِلُوا الْمُشْرِکِیْنَ کَمَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ کَآفَّۃً یہاں بھی کما کا لفظ چاہتا ہے کہ جس طرح پر آخر میں کافۃ آیا ہے کما سے پہلے بھی کافۃ ہو۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ تینوں آیتیں جن میں یہ تین لفظ رہ گئے ہیں ایک ہی جگہ واقع ہیں۔ یعنی سورہ توبہ کی آیت 33 سے لے کر 38 میں ہی ہیں۔ اور ان تینوں میں سے ایک غلطی کا درست کر دینا بھی ڈاکٹر منگانا کے اعتراض کا کافی جواب ہے۔ اب اس پہلو کو ترک کر کے ہم دوسرے پہلو کو لیتے ہیں کہ ان مسودات سے قرآن کریم کی حفاظت پر کس قدر مثبت نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ سوائے ان اختلافات کے جن کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی نسخہ میں قرآن شریف سے کوئی اہم اختلاف نہیں پایا جاتا۔ تمام سورتوں میں آیتوں کی ترتیب وہی ہے جو مستند نسخہ قرآن کریم میں ہے۔ کہیں کسی آیت کی کمی بیشی نہیں کسی لفظ کی کمی بیشی نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر کہ یہ سورتوں کی موجودہ ترتیب کی درستی پر بھی اس سے شہادت ملتی ہے۔ کیونکہ سورتیں اسی ترتیب سے لکھی ہوئی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر منگانا کے مسودہ میں صفحہ 69 پر سورۃ المومن ختم ہو کر اسی صفحہ پر بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کے ساتھ سورہ فُصِّلتْ یا حم السجدہ شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہی ترتیب قرآن کریم میں ہے۔ ایسا ہی صفحہ 72 پر سورۃ الدخان ختم ہو کر فوراً الجاثیۃ شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہی ترتیب ہمارے قرآن کریم میں ہے۔ پس یہ ایک مزید شہادت اس بات پر ہے کہ سارے قرآن کریم میں سورتوں کی ترتیب میں اور ہر ایک سورہ میں آیتوں کی ترتیب میں یا کسی کمی بیشی کے لحاظ قطعاً کوئی اختلاف کبھی نہیں ہوا۔

سبعہ احرف اور اختلاف قراءت

❀ اختلاف قرات سے حفاظت قرآن پر دو اعتراض

اختلافِ قراءت کے متعلق یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس سے دو طرح پر قرآن شریف کی حفاظت میں نقص کا ثبوت ملتا ہے۔ اول اس طرح پر کہ آنحضرت ﷺ نے بعض قراءتوں کی اجازت دی تھی مگر چونکہ ان کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ اس لیے ان کے ضائع ہونے سے گویا قرآن شریف کا ایک بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ کیونکہ یہ قراءتیں بھی آنحضرت ﷺ نے بذریعہ وحی بتائیں تھیں اور دوسرے اس طرح پر کہ اب جو مختلف قراءتیں موجود ہیں ان کو سامنے رکھ کر ایک شخص کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا کہ کون سی قراءتیں اصلی اور حقیقی طور پر کلام الٰہی ہیں اور کہ موجودہ قرآن کریم میں یونہی ایک قراءت کو اختیار کر لیا ہے۔ یہ اعتراض ایک حد تک اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ سبعة احرف مذکورہ احادیث سے مراد قراءت مختلفہ لی جاتی ہیں اور حرف اور قراءت کے معنوں میں امتیاز نہیں کیا جاتا۔ اس لیے سب سے پہلے سبعة احرف کی تشریح صفائی بیان کے لیے ضروری ہے۔

❀ سبعہ احرف سے مراد

جاننا چاہیے کہ جو اجازت آنحضرت ﷺ نے بذریعہ وحی دی تھی وہ قرآن شریف کو سبعة احرف یعنی سات حروف پر پڑھنے کی اجازت تھی۔ اور احادیث صحیحہ میں آنحضرت ﷺ نے لفظ احرف یا حرف کا ہی فرمایا ہے۔ سب سے پہلے اس لفظ کو لغوی معنوں پر غور کرنا ضروری ہے۔ حرف کے معنی عربی لغاتوں میں یہ دیئے گئے ہیں۔ زبان یا محاورہ یا طرز ادا جو بعض عرب اقوام کے ساتھ مخصوص ہو۔ تاج العروس میں مشہور حدیث کے اس ٹکڑے کو [نُزِّلَ الْقُرْاٰنَ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرَفٍ] بیان کر کے اس کے معنوں کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ [اَیْ عَلٰی سَبْعِ لُغَاتٍ مِنْ لُّغَاتِ الْعَرَبِ] یعنی قرآن شریف نازل ہوا سات لغتوں پر عرب کی لغتوں سے۔ یا اس کے معنی ہیں جیسا کہ بعض دوسری لغت کی معتبر کتابوں میں دیئے گئے ہیں۔ سات طرزوں پر جو الفاظ کے ادا کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ جیسا کہ یہ کہا جائے کہ [قُلَانٌ یَقْرَاُ بِحَرْفِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ] تو مراد ہوتی ہے کہ فلاں شخص ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرز ادا پر پڑھتا ہے۔ لفظ حرف کے ان معنوں سے یہ ظاہر ہے کہ جن اختلافات حروف کا ذکر بعض حدیثوں میں ہے وہ اختلاف اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ عرب کی مختلف قومیں بعض وقت ایک ہی لفظ کو مختلف طور پر ادا کرتی تھیں اور اس کی مثالیں ہر زبان میں موجود ہیں۔ کہ ایک قوم ایک لفظ کو ایک طرح پر ادا کرتی ہے۔ اور اسی ملک کی دوسری قوم اسی لفظ کو دوسری طرح پر ادا کرتی ہے۔

❀ اختلاف حروف والی احادیث

اب ہم ان تمام احادیث کو جن میں اختلاف حروف کا ذکر آیا ہے بیان کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آیا واقعی طور پر احادیث کا بھی یہی منشا ہے۔ اس کے متعلق مندرجہ ذیل احادیث معتبر کتب احادیث سے لی گئی ہیں:

① ((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: «أَقْرَأَنِي جِبْرِيلُ عَلَى حَرْفٍ، فَلَمْ أَزَلْ أَسْتَزِيدُهُ حَتَّى

انْتَهَىٰ إِلَىٰ سَبْعَةِ أَحْرُفٍ».))[1]

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جبریل علیہ السلام نے مجھے قرآن شریف ایک حرف کے مطابق پڑھایا۔ میں نے اس سے مراجعت کی یعنی بار بار اس بات کو دہرایا کہ زیادہ حروف میں پڑھے۔ پس وہ تعداد کو بڑھاتا گیا یہاں تک کہ سات پر پہنچ گیا۔''

یہی حدیث انہی الفاظ کے ساتھ مسلم نے بیان کی ہے۔ مگر اس میں اتنے الفاظ ابن شہاب کی روایت سے اور زیادہ ہیں:

((قَالَ ابْنُ شِهَابٍ: بَلَغَنِي أَنَّ تِلْكَ السَّبْعَةَ الأَحْرُفَ إِنَّمَا هِيَ فِي الأَمْرِ الَّذِي يَكُونُ وَاحِدًا لاَ يَخْتَلِفُ فِي حَلاَلٍ وَلاَ حَرَامٍ.))

''یعنی ابن شہاب نے کہا کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ یہ سات حروف ایسے امر میں ہیں جو ایک ہی ہے (یعنی مختلف حروف میں پڑھنے سے معنوں میں کوئی تغیر نہیں آتا) اور اس سے حلال اور حرام میں کوئی فرق نہیں آتا۔''

② ((عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ يَقُولُ: سَمِعْتُ هِشَامَ بْنَ حَكِيمٍ يَقْرَأُ سُورَةَ الْفُرْقَانِ فِي حَيَاةِ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَاسْتَمَعْتُ لِقِرَاءَتِهِ فَإِذَا هُوَ يَقْرَأُ عَلَىٰ حُرُوفٍ كَثِيرَةٍ لَمْ يُقْرِئْنِيهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فَكِدْتُ أُسَاوِرُهُ فِي الصَّلاَةِ فَتَصَبَّرْتُ حَتَّى سَلَّمَ، فَلَبَّبْتُهُ بِرِدَائِهِ فَقُلْتُ: مَنْ أَقْرَأَكَ هٰذِهِ السُّورَةَ الَّتِي سَمِعْتُكَ تَقْرَأُ. قَالَ: أَقْرَأَنِيهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ. فَقُلْتُ: كَذَبْتَ فَإِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَدْ أَقْرَأَنِيهَا عَلَىٰ غَيْرِ مَا قَرَأْتَ، فَانْطَلَقْتُ بِهِ أَقُودُهُ إِلَىٰ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقُلْتُ: إِنِّي سَمِعْتُ هٰذَا يَقْرَأُ بِسُورَةِ الْفُرْقَانِ عَلَىٰ حُرُوفٍ لَمْ تُقْرِئْنِيهَا. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «أَرْسِلْهُ اقْرَأْ يَا هِشَامُ». فَقَرَأَ عَلَيْهِ الْقِرَاءَةَ الَّتِي سَمِعْتُهُ يَقْرَأُ. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «كَذٰلِكَ أُنْزِلَتْ». ثُمَّ قَالَ: «اقْرَأْ يَا عُمَرُ!». فَقَرَأْتُ الْقِرَاءَةَ الَّتِي أَقْرَأَنِي، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «كَذٰلِكَ أُنْزِلَتْ، إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلَىٰ سَبْعَةِ أَحْرُفٍ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ».))[2]

قریباً انہی الفاظ میں یہ روایت صحیح مسلم میں بھی آئی ہے۔ ماحصل اس حدیث شریف کا یہ ہے کہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں میں نے ہشام بن حکیم کو سورہ فرقان پڑھتے سنا۔ جب میں اس کے پڑھنے کو غور سے سننے لگا تو میں نے معلوم کیا کہ وہ بہت سے ایسے حروف پر پڑھتا ہے جن پر رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو نہیں پڑھایا۔ قریب تھا کہ میں نماز ہی میں اس پر حملہ کر دیتا۔ مگر میں نے اپنے آپ کو روکے رکھا۔ یہاں تک کہ ہشام رضی اللہ عنہ نے سلام پھیرا۔ پھر میں نے ان کی چادر ان کے گلے میں ڈالی اور کہا کہ یہ سورہ جو میں نے تمہیں پڑھتے سنا ہے کس نے تم کو پڑھائی۔ انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو پڑھائی۔ میں نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ان حروف کے غیر پر پڑھایا جن پر تم پڑھتے ہو۔ پھر میں ان کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر چلا گیا۔ اور عرض کی کہ میں نے ان کو یعنی ہشام کو ایسے حروف پر سورۂ فرقان پڑھتے سنا ہے۔ جن پر آپ نے مجھ کو نہیں پڑھایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انہیں چھوڑ دو۔ اور فرمایا: ہشام تم پڑھو۔'' انہوں نے وہی قراءت پڑھی جو میں نے انہیں پڑھتے سنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسی طرح پر یہ نازل ہوئی۔'' پھر فرمایا: ''اے عمر رضی اللہ عنہ تم پڑھو۔'' میں نے اسی طرح پڑھا جس طرح آپ ﷺ نے مجھے پڑھایا

1- صحيح البخاري: 3219، 4991؛ صحيح مسلم: 1939

2- صحيح البخاري: 4992، 5041؛ صحيح مسلم: 1936

تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسی طرح یہ نازل ہوئی ہے۔ یہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔ پس جو تم پر آسان ہو پڑھو۔''

③ ((عَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَجُلاً قَرَأَ، وَسَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقْرَأُ خِلاَفَهَا فَجِئْتُ بِهِ النَّبِيَّ ﷺ فَأَخْبَرْتُهُ فَعَرَفْتُ فِي وَجْهِهِ الْكَرَاهِيَةَ، وَقَالَ: «كِلاَكُمَا مُحْسِنٌ، وَلاَ تَخْتَلِفُوا، فَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ اخْتَلَفُوا فَهَلَكُوا».))[1]

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو قرآن شریف پڑھتے سنا اور میں نے نبی ﷺ کو اور طرح پڑھتے سنا تھا۔ پس میں اس کو نبی ﷺ کے پاس لے آیا اور آپ ﷺ کو اس بات کی خبر دی۔ میں نے دیکھا کہ آپ کے چہرہ پر ناراضگی کے آثار ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم دونوں ٹھیک پڑھتے ہو۔ پس اختلاف مت کرو۔ کیونکہ جو تم سے پہلے گزرے ہیں انہوں نے اختلاف کیا تو ہلاک ہو گئے۔''

④ ((عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ: كُنْتُ فِي الْمَسْجِدِ فَدَخَلَ رَجُلٌ يُصَلِّي فَقَرَأَ قِرَاءَةً أَنْكَرْتُهَا عَلَيْهِ ثُمَّ دَخَلَ آخَرُ فَقَرَأَ قِرَاءَةً سِوَىٰ قِرَاءَةِ صَاحِبِهِ فَلَمَّا قَضَيْنَا الصَّلاَةَ دَخَلْنَا جَمِيعًا عَلَىٰ رَسُولِ اللهِ ﷺ فَقُلْتُ إِنَّ هٰذَا قَرَأَ قِرَاءَةً أَنْكَرْتُهَا عَلَيْهِ وَدَخَلَ آخَرُ فَقَرَأَ سِوَىٰ قِرَاءَةِ صَاحِبِهِ فَأَمَرَهُمَا رَسُولُ اللهِ ﷺ فَقَرَءَا فَحَسَّنَ النَّبِيُّ ﷺ شَأْنَهُمَا فَسُقِطَ فِي نَفْسِي مِنَ التَّكْذِيبِ وَلاَ إِذْ كُنْتُ فِي الْجَاهِلِيَّةِ فَلَمَّا رَأَىٰ رَسُولُ اللهِ ﷺ مَا قَدْ غَشِيَنِي ضَرَبَ فِي صَدْرِي فَفِضْتُ عَرَقًا وَكَأَنَّمَا أَنْظُرُ إِلَىٰ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ فَرَقًا فَقَالَ لِي: «يَا أُبَيُّ أُرْسِلَ إِلَيَّ أَنِ اقْرَإِ الْقُرْآنَ عَلَىٰ حَرْفٍ فَرَدَدْتُ إِلَيْهِ أَنْ هَوِّنْ عَلَىٰ أُمَّتِي. فَرَدَّ إِلَيَّ الثَّانِيَةَ اقْرَأْهُ عَلَىٰ حَرْفَيْنِ. فَرَدَدْتُ إِلَيْهِ أَنْ هَوِّنْ عَلَىٰ أُمَّتِي. فَرَدَّ إِلَيَّ الثَّالِثَةَ اقْرَأْهُ عَلَىٰ سَبْعَةِ أَحْرُفٍ))[2]

ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں مسجد میں تھا تو ایک آدمی آیا اور نماز پڑھنے لگا اور اس نے قراءت پڑھی جس پر میں نے اعتراض کیا۔ پھر ایک اور آدمی آیا اور اس نے پہلے سے بھی اختلاف کے ساتھ قراءت پڑھی۔ جب ہم نماز سے فارغ ہو چکے تو ہم سب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میں نے عرض کیا کہ اس شخص نے ایک قراءت پڑھی جس کے متعلق میں نے اس پر اعتراض کیا پھر دوسرا شخص آیا تو اس نے اس سے بھی مختلف قراءت پڑھی۔ آنحضرت ﷺ نے ان دونوں کو حکم دیا اور انہوں نے پڑھ کر سنایا۔ تو آنحضرت ﷺ نے دونوں کی قراءت کو پسند فرمایا۔ اس پر میرے دل میں ایک ایسا تکذیب کا خیال یکایک گزرا کہ جاہلیت میں بھی ایسا خیال نہ گزرا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ کیسا وسوسہ میرے دل میں گزرا ہے تو آپ ﷺ نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور میرا پسینہ چلنے لگا۔ گویا مارے خوف کے میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابی مجھے یہی حکم دیا گیا تھا کہ ایک ہی حرف پر قرآن کو پڑھوں۔ پھر میں نے اس بات کو لوٹایا اور عرض کیا کہ میری امت پر آسانی کی جاوے۔ پھر دوبارہ مجھے یہ فرمایا گیا کہ دو حرفوں پر پڑھو۔ میں نے پھر اس بات کو لوٹایا اور عرض کیا کہ میری امت پر آسانی کی جاوے۔ پھر تیسری مرتبہ مجھے اجازت دی گئی کہ سات حرفوں پر پڑھ لو۔''

⑤ ((عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ قَالَ: لَقِيَ رَسُولُ اللهِ ﷺ جِبْرِيلَ فَقَالَ: «يَا جِبْرِيلُ! إِنِّي بُعِثْتُ إِلَىٰ أُمَّةٍ أُمِّيِّينَ

1- صحيح البخاري: 2410، 3476

2- صحيح مسلم: 1941

مِنْهُمُ الْعَجُوزُ وَالشَّيْخُ الْكَبِيرُ وَالْغُلاَمُ وَالْجَارِيَةُ وَالرَّجُلُ الَّذِى لَمْ يَقْرَأْ كِتَابًا قَطُّ». قَالَ: يَا مُحَمَّدُ! إِنَّ الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلَىٰ سَبْعَةِ أَحْرُفٍ.))[1]

اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جبریل سے ملے اور فرمایا: ''اے جبریل میں اُمی لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں جن میں بوڑھی عورتیں اور بوڑھے مرد اور لڑکے اور لونڈیاں اور ایسے آدمی ہیں جنہوں نے کبھی کتاب نہیں پڑھی۔'' جبریل علیہ السلام نے کہا: ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے۔''

⑥ ((عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ عِنْدَ أَضَاةِ بَنِي غِفَارٍ فَأَتَاهُ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلاَمُ فَقَالَ: إِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ يَأْمُرُكَ أَنْ تُقْرِئَ أُمَّتَكَ الْقُرْآنَ عَلَىٰ حَرْفٍ.... الْحَدِيْثَ))[2]

مسلم کی اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سات حروف پر پڑھنے کی اجازت ملی تو آپ اضاۃ بنی غفار کے پاس تھے۔ باقی حدیث کا وہی مطلب ہے جو پہلے بیان ہوا۔

⑦ ((عَنْ جَابِرٍ قَالَ: خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ وَنَحْنُ نَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَفِينَا الأَعْرَابِيُّ وَالأَعْجَمِيُّ، فَقَالَ: «اقْرَءُوا فَكُلٌّ حَسَنٌ وَسَيَجِيءُ أَقْوَامٌ يُقِيمُونَهُ كَمَا يُقَامُ الْقِدْحُ يَتَعَجَّلُونَهُ وَلاَ يَتَأَجَّلُونَهُ».))[3]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم پر آنکلے اور ہم قرآن پڑھ رہے تھے۔ اور ہمارے درمیان اعرابی اور عجمی لوگ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پڑھتے جاؤ سبھی ٹھیک پڑھ رہے ہیں۔ اس کے بعد ایسی قومیں آئیں گی جو قرآن کو بڑی صفائی سے پڑھیں گی ایسی صفائی سے جیسا کہ تیر سیدھا کیا جاتا ہے۔ مگر وہ اس کا اجر اسی زندگی میں تلاش کریں گی اور عاقبت کی پروا نہیں کریں گی۔''

❀ سات حروف پر قرآن پڑھنے کی اجازت کب ہوئی

یہ چند احادیث ہیں جو قراءت مختلفہ کے متعلق آئی ہیں۔ ایک بات جس پر ان ساتوں حدیثوں سے متفقہ شہادت ملتی ہے یہ ہے کہ جو کچھ اختلاف تھے وہ قرآن کریم کی عبارت کے اختلاف نہ تھے بلکہ بعض الفاظ کو مختلف طور پر پڑھنے یا ادا کرنے کے اختلاف تھے۔ اس بات کو صاف کرنے کے لیے ان چند امور کو جو ان احادیث سے پیدا ہوتے ہیں ایک ایک کر کے زیر بحث لانا ضروری ہے۔ سب سے پہلے جو اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور جس سے قطعی شہادت ان اختلافات کی حقیقت کے متعلق ملتی ہے وہ وقت کا سوال ہے یعنی اس امر کی تحقیق کرنا کہ سات حروف میں قرآن شریف کو پڑھنے کی اجازت کس وقت دی گئی۔ پس ان احادیث کو آگے رکھ کر ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ آیا سات حروف میں قرآن شریف کا نزول ابتدا سے ہی تھا یا کسی خاص وقت کسی خاص ضرورت کے لحاظ سے اجازت حروف مختلفہ میں ادا کرنے کے بعد دی گئی۔ کیونکہ اگر جب سے نزول قرآن شریف کا شروع ہوا اسی وقت سے سات حروف میں اس کا نزول تھا تو اس میں ایک معترض کو اس اعتراض کی گنجائش نکل سکتی کہ وہی سات حروف ہمیشہ کے لیے چلے آنے چاہئیں تھے۔ اور اگر وہ ساتوں حروف ہم تک نہیں پہنچے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ کچھ قرآن شریف کا حصہ ضائع ہو گیا۔ لیکن اگر سات حروف کا نزول بعد میں ہوا اور ابتداءً قرآن شریف کا نزول ایک ہی حرف میں تھا تو ایسا اعتراض کسی صورت میں ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سات حروف میں نزول کسی خاص ضرورت کی وجہ سے ہوا اور ان سات حروف کو اصل قرآن شریف سے جیسا کہ وہ ابتدا سے نازل ہو رہا تھا کچھ تعلق نہیں۔

1- جامع الترمذي: 2944؛ كنز العمال: 4852؛ قال الشيخ الألباني: صحيح.
2- صحيح مسلم: 1943؛ سنن أبي داود: 1478؛ سنن النسائي: 939؛ وقال الشيخ الألباني: صحيح.
3- شعب الإيمان للبيهقي: 2403؛ مسند الإمام أحمد: 15273؛ سنن أبي داود: 830؛ وقال الشيخ الألباني: صحيح.

بلکہ بعض ضرورتوں کی وجہ سے ایک وقت کے لیے بعض لوگوں کو ایسی اجازت دی گئی۔

استدلال اول زمانہ اجازت حروف کے متعلق چھٹی حدیث سے پیدا ہوتا ہے جس میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اضاۃ بنی غفار کے قریب تھے جب آپ کو سات حروف پر قرآن پڑھنے کی اجازت دی گئی۔ اضاۃ بنی غفار مدینہ میں ایک مشہور مقام ہے۔ پس زمانہ کے متعلق اس قدر تو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مختلف حروف کی اجازت آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے بعد ہوئی۔ اس طرح سے مکہ میں جس قدر قرآن شریف آنحضرت پر نازل ہوا وہ ایک ہی حرف پر نازل ہوا۔ اور یہ ایسا قطعی اور یقینی نتیجہ ہے کہ کوئی دلیل اسے توڑ نہیں سکتی۔ مگر یہ امر کہ مدینہ میں کس وقت یہ اجازت ملی اس کی اس حدیث سے کچھ تعیین نہیں ہو سکتی۔ لیکن ایک اور حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دراصل اجازت اس وقت دی گئی جب فتح مکہ کے بعد کثرت سے عرب لوگ اسلام میں داخل ہونے شروع ہوئے اور مختلف قوموں کو قرآن کریم کے سکھانے کی ضرورت پیش آئی۔ جس سے اس اجازت کا زمانہ ہجرت نبوی کا نواں سال قرار پاتا ہے۔ یہ حدیث وہ ہے جس کو بخاری اور مسلم نے قریباً یکساں لفظوں میں بیان کیا ہے اور جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ کے اختلاف کا ذکر ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہشام کو قرآن شریف کی ایک سورۃ پڑھتے سنا اور آپ اس کے پڑھنے سے بہت حیران ہوئے کیونکہ اس میں ان کی قراءت سے جو ہمیشہ سے حضرت عمر پڑھتے اور سنتے چلے آئے تھے بعض اختلافات تھے۔ جس تعجب سے حضرت عمر نے حضرت ہشام کی اس قراءت کو سنا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ پہلا ہی موقعہ جو حضرت عمر کو قراءت میں ایسے اختلاف کے سننے کا موقعہ ہوا۔ اب تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ حضرت ہشام فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے۔ پس ان کا سورۃ فرقان جیسی لمبی سورت پڑھنا اس کے بھی کچھ عرصہ بعد کا واقعہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ مسلمان ہوتے ہی وہ ایک آدھ دن میں اتنی اتنی لمبی سورتیں یاد نہ کر سکتے تھے کہ نماز میں انہیں پڑھنا شروع کر دیں۔ پس اس قدر تو یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ یہ واقعہ جس کا حدیث میں ذکر ہے فتح مکہ کے بعد کا ہے اور اس کا زمانہ نویں سال ہجرت سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔ اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ سات حروف پر پڑھنے کی اجازت برسوں پہلے مل چکی ہو مثلاً: آنحضرت ﷺ کی مدنی زندگی کے ابتدا میں ہی ہو چکی ہو؟ یہ بات ظاہر ہے کہ جب ایسی اجازت ملی ہو اس وقت سے اس پر عمل بھی شروع ہو گیا ہو۔ اور اگر مثلاً: اجازت ابتدائے مدنی زندگی میں ہی مل گئی ہو اور اس پر عمل نو سال بعد تک نہ ہوا ہو تو اس میں اور اس صورت میں کہ اجازت ہی نویں سال ہجری میں ملی ہو کچھ فرق نہیں۔ پس اب تحقیق طلب یہ امر ہے کہ آیا یہ ممکن ہے کہ قرآن شریف سات حروف پر تو ابتدائی زندگی مدنی سے ہی پڑھا جاتا ہو؟ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر نہ ہوئی ہو؟ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرب کے کنارے کی قوموں میں سے ایک شخص ہوتے اور ایک آدھ دفعہ آنحضرت کے پاس تشریف لا کر پھر اپنے گھر میں چلے گئے ہوتے تو یہ ممکن تھا کہ اجازت سات حروف کی مدت سے مل چکی ہو اور ان کو اطلاع نہ ہوئی ہو۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ دن رات آنحضرت ﷺ کی صحبت میں رہنے والے تھے۔ اور اگر کبھی اپنے کاروبار بھی کرتے تھے اور غیر حاضری کا اتفاق بھی ہو جاتا تو آپ نے یہ انتظام کیا ہوا تھا کہ اپنے ایک ہمسائے کو اس وقت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیج دیتے جو آپ کو تازہ وحی اور نئے امور سے اطلاع دے دیتے۔ پس ایسے شخص کے متعلق یہ کسی صورت میں خیال نہیں کیا جا سکتا کہ اگر سات حروف میں پڑھنے کی اجازت مل گئی ہو اور اس پر عمل بھی شروع ہو گیا ہو تو وہ برسوں یا مہینوں اس سے بے خبر رہے ہوں۔

ان تمام واقعات پر غور کر کے ہم اس یقینی اور قطعی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ سات حروف میں پڑھنے کی اجازت نویں سال ہجرت کے قریب ہوئی۔ جب عرب کی مختلف قومیں کثرت کے ساتھ اسلام میں داخل ہونی شروع ہوئیں۔ اور اس سے پہلے یہ اجازت نہ تھی۔ یا اگر اجازت تھی تو اس پر قطعاً عمل نہیں ہوا۔ یعنی فی الواقع قرآن شریف کا مختلف حروف پر پڑھا جانا فتح مکہ سے پہلے ثابت نہیں ہے اور جس قدر حدیثیں اس کے متعلق آئی ہیں ان سے اشارۃً اور کنایتہ بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ فتح مکہ سے پہلے قرآن شریف سات حروف پر پڑھا گیا

ہو۔ چنانچہ جن لوگوں نے سبعۃ احرف پر بحث کی ہے خواہ وہ کسی نتیجہ پر پہنچے ہوں مگر وہ اس امر کے قائل ہیں کہ یہ اجازت اس وقت ملی جب عرب کثرت کے ساتھ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اور یہ فتح مکہ سے بعد کا زمانہ ہے۔

❀ اکیس سال تک قرآن شریف ایک ہی حرف پر لکھا اور پڑھا جاتا رہا

اس ساری بحث سے ایک اہم نتیجہ یہ پیدا ہوتا ہے جس سے سبعۃ احرف کی حقیقت پر ایک ایسی روشنی پڑتی ہے کہ کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تیرہ سال مکہ میں اور آٹھ سال سے زیادہ مدینہ منورہ میں یعنی اکیس سال تک قرآن شریف ایک ہی حرف پر نازل ہوا اور ایک ہی طرز پر پڑھا جاتا رہا اور ایک ہی طرح پر لکھا جاتا رہا۔ نہ کوئی اختلاف تھا اور نہ قرآن شریف کی کسی عبارت میں مختلف حروف کا وجود تھا۔ یہی اصل قرآن شریف ہے جسے آنحضرت ﷺ ساری عمر پڑھتے رہے پڑھاتے رہے۔ یہی وہ قرآن شریف ہے جسے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تحریر میں جمع کرایا۔ یہی وہ قرآن شریف ہے جس کی نقلیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اطراف میں بھیجیں۔ اور یہی وہ قرآن شریف ہے جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ جس طرح اکیس سال تک کسی دوسرے حرف یا قراءت کا وجود نہ تھا اسی طرح اس قرآن شریف میں جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے اور وہ ایک ہی قرآن شریف ہے جو ساری اسلامی دنیا میں شائع ہو رہا ہے۔ اس میں بھی نہ کوئی اختلاف قراءت ہے نہ اختلاف حروف ہے۔ بالفاظ دیگر اس کی عبارت وہی عبارت ہے جو اکیس سال تک آنحضرت ﷺ کے مبارک زمانہ میں پڑھی جاتی تھی۔ پس جو قراءتیں چھوڑی گئیں وہ اصل میں قرآن شریف کا جزو نہ تھیں۔ بلکہ ایک خاص وقت اور ایک خاص ضرورت کے لیے یہ اجازت دی گئی تھی۔

اس کے متعلق میں اور شہادتیں بھی پیش کروں گا۔ مگر جہاں تک زمانہ اجازت کے سوال سے کوئی نتیجہ پیدا ہو سکتا ہے اس سے صاف اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ اکیس سال تک مختلف حروف اور قراءتوں کا سوال ہرگز نہیں اٹھا۔ ایک ہی حرف پر قرآن شریف نازل ہوتا تھا اور ایک ہی قراءت تھی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اس اکیس سال کے زمانہ میں قرآن شریف کا بہت بڑا حصہ نازل ہو چکا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قریباً قریباً سارا ہی قرآن شریف نازل ہو چکا تھا۔ پس ایک ایسے وقت میں جبکہ مختلف اقوام کثرت کے ساتھ دین اسلام میں داخل ہونی شروع ہوئیں۔ مختلف حروف میں قرآن شریف پڑھنے کی اجازت دینا صاف بتا رہا ہے کہ یہ اجازت صرف انہی قوموں کی وجہ سے تھی۔ اور اس سے اصل عبارات قرآنی میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔

❀ بعد کا اختلاف صرف طرز ادا میں تھا

اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ اختلافات حروف عبارتوں یا جملوں کے اختلاف نہ تھے بلکہ ایسے اختلاف تھے جو ایک ہی لفظ کے بولنے میں مختلف قوموں کے درمیان پیدا ہونے لازمی ہیں۔ یہ قومیں زبان تو عربی ہی بولتی تھیں مگر جیسا کہ ہر ایک زبان کا قاعدہ ہے خصوصاً جہاں علم کا عام رواج نہ ہو اور لوگ پڑھے ہوئے نہ ہو۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر اصل محاورہ سے کچھ فرق پڑ جاتا ہے۔ ایسا ہی ان قوموں کے محاورہ میں یعنی بعض الفاظ کو ادا کرنے کے طریق میں تھوڑا تھوڑا فرق تھا۔ ایسے اختلافات کی بعض مثالیں پہلے بھی بیان ہو چکی ہیں۔ مثلاً: حتّٰی جو اصل لفظ ہے اور محاورہ قریش کے مطابق ہے اسے ثقیف اور ہذیل عتّٰی پڑھتے تھے۔ ایسے ہی اور بعض اختلافات کی مثالیں دی گئی ہیں۔

مثلاً: اسدی تِعْلَمُوْنَ ت کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ بعض قومیں مآء غَيْرِ اٰسِنٍ کی جگہ مآء غَيْرِ يَاسِنٍ پڑھتی تھیں۔ اور ایسا ہی بعض قومیں ایسے الفاظ میں ہمزہ پڑھتی تھیں جہاں دوسری نہ پڑھتی تھیں۔ یہ سارے ایسے فرق ہیں جو ہر جگہ اور ہر زبان میں اختلاف محاورہ سے پیدا ہو جاتے ہیں۔

اسی کی تائید میں بعض اور شہادتیں بھی ہیں۔ جیسا کہ فتح الباری میں یہ مذکور ہے:

((وَنَقَلَ اَبُوْشَامَةَ عَنْ بَعْضَ الشُّيُوْخِ اَنَّهُ قَالَ: اُنْزِلَ الْقُرْآنُ اَوَّلًا بِلِسَانِ قُرَيْشٍ وَمَنْ جَاوَرَهُمْ مِنْ بَعْضِ الْعَرَبِ الْفُصَحَاءِ ثُمَّ اُبِيْحَ لِلْعَرَبِ اَنْ يَقْرَءُوْهُ بِلُغَاتِهِمُ الَّتِيْ جَرَتْ عَادَتُهُمْ بِاسْتِعْمَالِهَا عَلَى اخْتِلَافِهِمْ فِي الْاَلْفَاظِ وَالْاِعْرَابِ وَلَمْ يُكَلَّفْ اَحَدٌ مِنْهُمُ الْاِنْتِقَالَ مِنْ لُغَةٍ اِلَى لُغَةٍ اُخْرَىٰ لِلْمُشَقَّةِ وَلِمَا كَانَ فِيْهِمْ مِنَ الْحَمِيَّةِ وَلِطَلَبِ تَسْهِيْلِ فَهْمِ الْمُرَادِ كُلُّ ذٰلِكَ مَعَ اتِّفَاقِ الْمَعْنٰى.))[1]

یعنی ابو شامہ نے ایک بزرگ سے یہ نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ اول نزول قرآن کریم کا زبان قریش میں اور ان فصیح عربوں کی زبان میں تھا جو ان کی ہمسائیگی میں رہتے تھے۔ پھر دوسری عرب قوموں کے لیے یہ اجازت دی گئی کہ اسے اپنی لغات یعنی محاورہ میں جس کے استعمال کے وہ شروع سے عادی تھے پڑھ لیا کریں۔ ان کے الفاظ اور اعراب میں اختلاف کی وجہ سے اور ان میں سے کسی کو اس بات پر مجبور نہ کیا گیا کہ وہ اپنے محاورہ کو چھوڑ کر دوسروں کا محاورہ اختیار کرے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا ان کے لیے بہت دشوار تھا۔ اور ان میں اپنے اپنے محاوروں کے لیے حمیت بھی تھی اور اس سے معنوں کے سمجھنے میں ان کے لیے آسانی تھی۔ اور یہ سب کچھ اتفاق معنی کے ساتھ تھا۔ یعنی یہ اختلاف محاورہ ان کے ایسے نہ تھے جن سے معنوں میں کچھ بھی فرق پڑتا ہو۔ یہ حوالہ بھی ہمارے اس نتیجہ کا مؤید ہے جو زمانہ اجازت قراءت حروف مختلفہ سے پیدا ہوتا ہے۔''

❀ اجازت کی غرض سہولت دینا تھا

اگر ان احادیث پر جو اوپر سبعة احرف کے متعلق نقل کی گئی ہیں غور سے نظر کی جائے تو ان سے بھی اس بات کا پتہ لگتا ہے کہ اس اجازت کے دینے کی غرض کیا تھی۔ ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: [هُوِّنْ عَلٰى اُمَّتِيْ] ''میری امت پر آسانی کر دی گئی۔'' جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ آپ محسوس کرتے تھے کہ بعض لوگوں کو قریش کے محاورہ میں سارے الفاظ ادا کرنے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ ان کے لیے آسانی کی درخواست کی کہ وہ اپنے محاورہ میں ہی ان الفاظ کو ادا کر لیں۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: [اُمَّتِيْ لَا تَطِيْقُ ذٰلِكَ] یعنی ''میرے لوگ اس بات کی برداشت نہیں کر سکتے۔ (کہ وہ سب ایک ہی حرف میں قرآن شریف کو پڑھ سکیں۔)''

ایک تیسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ان لوگوں میں بعض بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں اور بچے اور ناخواندہ لوگ ہیں۔ غرض یہ تھی کہ لوگ ایسے اپنے محاورہ کے عادی ہو گئے ہیں کہ دوسرے محاورہ میں الفاظ ادا نہیں کر سکتے۔ جس طرح ایک لفظ بولنے کی عادت ہو گئی ہے اسی طرح پر اسے بول سکتے ہیں۔ اگر وہ تعلیم یافتہ ہوتے تو قریش کی فصیح اور علمی زبان میں ہر ایک لفظ کو آسانی سے ادا کر سکتے۔ مگر چونکہ امی لوگ تھے ایسا نہ کر سکتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو تکلیف میں نہ ڈالا۔ بلکہ یہ اجازت دی کہ جس طرح وہ کسی لفظ کو بولنے کے عادی ہو گئے ہیں اسی طرح پڑھ لیا کریں۔ اور بخاری کی حدیث کے آخری الفاظ ہیں: ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ یعنی ''جس طرح پر تمہارے لیے آسانی ہو اسی طرح پڑھ لیا کرو۔''

اس سے بھی وہی نتیجہ نکلتا ہے۔ پھر ایک پانچویں حدیث میں ہے اعرابی اور عجمی سب لوگ قرآن پڑھ رہے تھے اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''سب ہی خوب پڑھ رہے ہیں۔'' اور ایک ایسی قوم کی مذمت کی جو لفظوں کو تو بہت سنوار سنوار کر ادا کر دیں گے مگر معنوں تک نہیں پہنچیں گے۔

1- فتح الباري: 27/9

ایک اور بات جس سے سبعۃ احرف کی بحث پر روشنی پڑتی ہے یہ ہے کہ جو لوگ ابتدائے اسلام میں مشرف باسلام ہوئے تھے ان میں اس قسم کے اختلافات کا کچھ تذکرہ نہیں پایا جاتا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں کوئی اختلاف قراءت نہیں دکھایا جاسکتا۔ مسلمانوں میں سے سابقین کے اندر ایسے اختلافات کا نہ پایا جانا بھی صاف طور پر یہی بتا رہا ہے کہ اجازت مختلف حروف میں پڑھنے کی خاص اغراض کے لیے تھی۔ اور اس سے اصل عبارت قرآنی میں کوئی تغیر تبدل نہیں ہوا۔ قرآن کریم کا نزول لسان قریش میں ہوا کیونکہ انہی کی زبان علمی اور پر از فصاحت و بلاغت سمجھی جاتی تھی۔

دوسری قوموں کے محاورے محض اس اصل زبان کا کسی کسی لفظ میں بگاڑ تھا۔ مگر ان لوگوں کے لیے جو ایسے الفاظ کو اپنی قوم کے محاورہ کے مطابق ادا کرنے کے عادی ہو گئے تھے ان الفاظ کو زبان قرشی کے محاورہ میں ادا کرنا بہت مشکل تھا اور چونکہ ہر ایک مسلمان کے لیے کچھ نہ کچھ حصہ قرآن کریم کا جاننا ضروری تھا۔ خواہ وہ خواندہ ہو یا ناخواندہ اور خواہ بوڑھا ہو یا بچہ۔ کیونکہ نماز ہر ایک مسلمان پر فرض تھی اور نماز میں قرآن شریف لازمی طور پر پڑھا جاتا تھا۔ اس لیے ان لوگوں کو جو یکایک اپنے محاوروں میں اس قسم کا تغیر پیدا کرنے کے ناقابل تھے کہ ہر ایک لفظ کو صحیح طور سے قریش کے محاورہ پر ادا کر سکیں، یہ اجازت دی گئی تھی جس کی بنا وحی الٰہی پر تھی کہ وہ بعض الفاظ کو اسی طور پر ادا کر لیں جس طرح اپنے محاورہ میں کرتے تھے۔

❀ اختلافات حروف نہایت خفیف تھے

یہ سوال کہ مختلف محاورات یا لغتیں محاورۂ قریش سے اور آپس میں کس قدر مختلف تھیں۔ اب اس پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن جیسا کہ کئی مثالیں دے کر پہلے بھی بیان کیا گیا ہے یہ اختلاف نہایت خفیف تھے۔ تاریخی شہادت جہاں تک میسر آسکتی ہے وہ بھی اس نتیجہ کی مؤید ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے ہم اس سے بھی انکار نہیں کرتے کہ جیسا کہ ایسے محاورات میں بعض اوقات ہو جاتا ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا قائمقام دوسرے محاورہ میں کوئی اور لفظ ہوتا ہے۔ اس لیے جب قرآن کریم کو دوسرے حروف پر یعنی دوسرے محاوروں کے مطابق پڑھنے کی اجازت دی گئی ہو گی تو اس طرح سے کسی لفظ کو دوسرے محاورہ میں اس کے ہم معنی لفظ سے ادا کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی ہو گی۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ مختلف حروف سے مراد ایک معنی کو مختلف الفاظ سے ادا کرنا ہے۔ اگرچہ یہ انہوں نے محض قیاس سے لکھا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ہشام والی حدیث سے دھوکا کھایا ہے لیکن ممکن ہے کہ ایسی کوئی مثال بھی ان کے ذہن میں ہو کہ ایک محاورہ میں ایک لفظ کو دوسرے محاورہ میں اس کے ہم معنی لفظ سے جہاں پہلا لفظ اس دوسرے محاورہ میں موجود نہ ہو ادا کرنے کی اجازت دی گئی۔ اور اس سے انہوں نے ایک عام قاعدہ بنالیا۔ علاوہ ان مثالوں کے جو اوپر بیان ہوئی اور ظاہر کر رہی ہیں کہ اختلاف احرف عموماً نہایت خفیف اختلاف تھے جو بعض الفاظ کو خاص طرز پر ادا کرنے کی وجہ سے یا اعراب میں کسی قدر فرق کی وجہ سے پیدا ہوتے تھے خود قیاس بھی اس بات کو چاہتا ہے کہ یہ اختلاف ایسے ہی معمولی اختلاف تھے۔ جیسے ایک ہی ملک کے رہنے والے اور ایک ہی زبان کے بولنے والے لوگوں میں بعض وقت پائے جاتے ہیں۔ آخر ان سب قوموں کی زبان عربی ہی تھی اور اسی زبان میں وہ شعر کہتے تھے۔ جن میں باہم ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے تھے اور باہمی ان کا میل جول بھی بہت ہوتا تھا اور میلے لگا کرتے تھے۔ جہاں وہ سب اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ یہ سب باتیں اسی نتیجہ کی مؤید ہیں کہ اختلاف احرف نہایت خفیف قسم کے اختلافات تھے۔

اعتراض اس پر یہ کیا گیا ہے کہ اگر واقعی یہ اختلاف ایسے ہی خفیف ہوتے تو صحابہ ان اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ اس قدر سختی کیوں کرتے۔ جیسا کہ مثلاً: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق حدیث میں مذکور ہے کہ انہوں نے اول تو نماز میں ہی ہشام کو روکنا چاہا اور پھر آخر ان کی گردن میں چادر ڈال کر ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں لے گئے اور جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم نہیں دیا

تب تک انہیں چھوڑا نہیں۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ عمرؓ اور ہشام کی قراءت میں کوئی بہت بھاری اختلاف ہو گا جس سے معنوں میں بھی تغیر آتا ہو گا۔ جو حضرت عمرؓ نے ہشام کے ساتھ اس قدر سختی کا برتاؤ کیا۔ جیسے کسی بڑے مجرم کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بلکہ بعض نادان یا مجنون معترض تو یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں کہ ہشام کی قراءت حضرت عمرؓ کی قراءت سے اس قدر اختلاف رکھتی تھی کہ دونوں گویا الگ الگ عبارتیں تھیں۔

اگر در حقیقت ایسا ہوتا تو حضرت عمرؓ کو یہ کیونکر پتہ لگ گیا کہ حضرت ہشام سورۂ فرقان پڑھ رہے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے ان کی قراءت کو سنتے ہی پہچان لیا۔ رہی یہ بات کہ اس قدر اختلاف تھا جس سے معنوں میں بھی اختلاف ہوا ہو گا ورنہ حضرت عمر سختی نہ کرتے۔ یہ قیاس بھی غلط ہے۔ کیونکہ احادیث میں صریح طور پر یہ الفاظ موجود ہیں کہ یہ اختلاف قراءت ایسا نہ تھا جس سے معنوں میں بھی کچھ اختلاف ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ قرآن شریف کے ایک ایک لفظ اور حرف اور حرکت کے لیے ایسے محتاط تھے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ فرق کو بھی وہ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے ایک لحہ کے لیے بھی کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ قرآن شریف کے معنی سمجھ لینے ہی کافی ہیں۔ بلکہ وہ اس کے الفاظ اور حروف اور حرکات کو منجانب اللہ سمجھ کر اور خدا کا کلام یقین کر کے محافظت کرتے تھے۔ پس وہ اس قدر ادنیٰ اختلاف کو بھی جو اختلاف حروف سے پیدا ہوا برداشت نہ کر سکتے تھے۔ جب تک کہ آنحضرت ﷺ سے انہوں نے سن نہیں لیا کہ یہ اجازت محض ایک ضرورت کے لیے دی گئی ہے۔ انہوں نے صبر نہ کیا جب تک کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو یہ نہ سمجھا دیا کہ ان قوموں کے لیے جو الگ محاورہ بولتی ہیں بعض الفاظ کا قریش کے محاورہ پر ادا کرنا سخت مشکل ہے۔ اس لیے خود اللہ تعالیٰ نے یہ اجازت دی ہے کہ وہ دوسرے حروف یعنی محاوروں میں بعض الفاظ کو پڑھ لیں۔ غرض کہ حضرت عمرؓ کی ناراضگی کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس وقت تک ان کو یہ علم نہیں تھا کہ آنحضرت ﷺ نے بعض دوسرے حروف پر قرآن شریف کو پڑھنے کی اجازت بھی دی ہے۔ اس لیے وہ کسی تھوڑے سے تغیر و تبدل کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔

❀ حضرت عمر اور ہشام کا اختلاف

ایک اور اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ اور ہشام دونوں ایک ہی قبیلہ کے تھے۔ پس اگر اختلاف حروف محض اختلاف محاورہ ہی سے پیدا ہوتے تو حضرت عمرؓ اور ہشام کی قراءت میں کچھ فرق نہیں ہونا چاہیے۔ حالانکہ حدیث سے ثابت ہے کہ ان میں اختلاف ہوا اس سے ہمارے بعض علماء نے یہ دلیل پکڑی ہے کہ اختلاف حروف سے مراد ایک ہی معنی کا مختلف الفاظ سے ادا کرنا تھا۔ اور بعض معترضین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اختلاف حروف قرآن شریف کی عبارتوں کا اختلاف تھا۔ مگر محض عمرؓ اور ہشام کے ہم قبیلہ ہونے اور پھر اختلاف قراءت کے ہو جانے سے ایسے نتائج نکالنا بڑی بھاری غلطی ہے۔ اول تو اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ جب بذریعہ وحی سات حروف پر قرآن شریف کو پڑھنے کی اجازت ہو گئی تو یہ اجازت خاص خاص اقوام سے مخصوص نہ رہ سکتی تھی۔ قرآن کریم ایک رسول اللہ ﷺ ہی تمام صحابیوں کو نہ سکھاتے تھے۔ بلکہ بعض صحابی بھی بعض کو سکھاتے تھے۔ اور اس طرح ایک قوم کی خصوصیات دوسری قوم میں جا سکتی تھیں۔ دوئم یہ امر قابل لحاظ ہے کہ اگر ایک قوم ایک لفظ کو ایک خاص طرز پر جو دوسری قوم میں مروج ہے ادا نہ کر سکے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ دوسری قوم بھی پہلی قوم کی طرز پر اس لفظ کو ادا نہیں کر سکتی۔ یہ بات مثال سے آسانی کے ساتھ سمجھ میں آ جائے گی۔ ہذیل اور ثقیف حتی کی بجائے عَتّٰی پڑھتے تھے۔ حتی قریش کے محاورہ میں تھا اور اس کی بجائے ان کے محاورہ میں عتی تھا۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ قریش عتی نہ بول سکتے تھے۔ اگرچہ عام طور پر وہ حَتّٰی ہی بولتے تھے اور یہی اصل لفظ تھا۔ مگر وہ اگر چاہتے تو عتی بھی پڑھ سکتے تھے۔ چنانچہ ایک حدیث سے ثابت ہے کہ ابن مسعود حتی حین کی بجائے بموجب محاورہ

ہذیل و ثقیف عَتّی عِیْن پڑھتے تھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو منع بھی کیا تھا کہ ہذیل کی لغت میں لوگوں کو قرآن شریف مت پڑھاؤ۔ اصل بات یہ تھی کہ قریش دوسری اقوام کے محاورات کے مطابق الفاظ کو ادا کرنے کے عادی ہو گئے تھے کیونکہ مکہ معظمہ میں جو ان کا صدر مقام تھا مختلف قوموں کے لوگ ہر سال موسم حج میں اور میلوں وغیرہ پر جمع ہوا کرتے تھے اور قریش کو چونکہ ہر ایک قوم اور قبیلہ سے لین دین اور تجارت کا واسطہ پڑتا تھا اور علاوہ ازیں علمی مناظرے اور مقابلے بھی باہمی ہوتے رہتے تھے اس لیے قریش کو ہر ایک قوم کے محاورہ سے واقفیت پیدا کرنی لازمی ہو گئی تھی۔

اب ہشام جب مسلمان ہوئے تو یہ وہ وقت تھا جب فتح مکہ کے بعد فوج در فوج عرب کی قومیں اسلام میں داخل ہو رہی تھیں۔ اور غالباً حضرت ہشام رضی اللہ عنہ نے سورۂ فرقان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسے وقت سنا جب آپ کسی قوم کو پڑھا رہے تھے۔ اور اسی طرح پر انہوں نے یاد کر لیا اور چونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اجازت تھی کہ ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ یعنی ''جس طرح آسان ہو اسی طرح پڑھ لو۔'' اس لیے حضرت ہشام رضی اللہ عنہ نے قریش کے محاورہ کے مطابق ادا کرنے کی کوشش نہ کی اور نہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اس طرح پڑھنے پر منع فرمایا جس طرح وہ پڑھ رہے تھے۔ ان واقعات سے ناظرین آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ہشام اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں باوجودیکہ دونوں ایک ہی قبیلہ کے تھے اختلاف کیوں ہوا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس زمانہ میں قرآن شریف کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پڑھ چکے تھے جب ایک ہی حرف پر قرآن شریف پڑھا جاتا تھا اور ہشام نے ایسے وقت میں سیکھا جب دوسری قوموں کے اسلام میں کثرت کے ساتھ داخل ہونے سے اُن کو ان کے اپنے محاورہ کے مطابق ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن شریف پڑھانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ پس یہی وجہ اختلاف کی تھی۔

❀ سات حروف سے کیا مراد ہے؟

سات حروف میں پڑھنے سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن شریف کا ہر ایک لفظ سات طرز پر پڑھا جاتا تھا۔ بلکہ مطلب قرآن شریف کا سات حروف پر اتارا جانے کا صرف یہ ہے کہ جن محاورات میں پڑھنے کی اجازت تھی وہ سات تھے یا یوں کہو کہ ایک لفظ کی مختلف قراءتیں جو اختلاف محاورہ سے پیدا ہوتی تھیں وہ سات لغتوں میں سے ایک میں ہوتی تھیں۔ یہ اختلاف تعداد میں بھی کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتے۔ کیونکہ حدیث میں جس قدر اختلافات کا ذکر کیا گیا ہے وہ تعداد بہت تھوڑی ہے۔ اگر اختلاف بہت سے ہوتے تو احادیث میں ضرور ان کا ذکر زیادہ ہوتا۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ بہت سی قراءتیں بعض مفسرین اس وقت بھی بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ قراءتیں اور سبعة احرف ایک چیز نہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ سبعة احرف والی قراءتیں بہت تھوڑی اس لیے ہم تک پہنچی ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کا قرآن شریف میں لکھنا بند کر دیا تھا تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ جو چیزیں احادیث میں محفوظ ہو کر آئی ہیں ان میں سے کوئی بھی لکھی ہوئی نہ تھی۔ اور ہزارہا واقعات بنا معرض تحریف میں آنے کے احادیث میں پوری طرح سے محفوظ رہے۔ اختلاف کے کم ہونے کی وجہ ان قوموں کا باہمی میل جول تھا۔ جو اکثر میلوں، مجلسوں، مشاعروں اور تجارت وغیرہ کے ذریعہ سے ہوتا رہتا تھا۔ اور انہی تعلقات کا یہ نتیجہ تھا کہ ان کے اختلاف نہ بڑھنے پاتے تھے۔ سات لغات جن میں قرآن شریف کے بعض الفاظ کو ادا کرنے کی اجازت دی گئی تھی وہ تھیں جو عرب میں افصح ترین تھیں۔ مگر بعض کا خیال یہ ہے کہ سات سے انحصار تعداد مقصود نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ علاوہ محاورہ قریش کے جس میں قرآن شریف کا نزول ہو رہا تھا کچھ اور محاورات بھی ایسے تھے جن میں بعض الفاظ قرآنی کو ادا کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ سات اور ستر وغیرہ اعداد عام طور پر کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔

❀ آنحضرت ﷺ نمازوں میں قرآن شریف کو نزول اوّل کے مطابق ہی پڑھتے رہے اور ایک ہی حرف پر لکھواتے رہے

جس قدر بحث اوپر ہو چکی ہے اس سے ایک بے تعصب انسان کے دل کو تسکین دینے والی شہادت اس امر سے ملتی ہے کہ وہ اختلافات قراءت جو آنحضرت ﷺ کے وقت میں سبعة احرف سے پیدا ہوئے تھے وہ قرآن کریم کا جزو نہ تھے۔ نہ اس کی اصل عبارتوں میں داخل تھے۔ بلکہ جو ضرورت ان کی اجازت کے لیے پیدا ہوئی تھی وہ ایک مقامی ضرورت تھی اور تھی بھی عارضی۔ قریباً کل کا کل قرآن شریف اس اجازت سے پہلے نازل ہو چکا تھا۔ جس قدر زیادہ غور ان قراءتوں پر ہم کرتے ہیں اسی قدر زیادہ اطمینان اس نتیجہ کے متعلق حاصل ہوتا ہے کہ سات حروف میں پڑھنے کی اجازت محض بعض قوموں کی آسانی کے لیے تھی اور اس سے اصل قرآن کریم میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں آیا۔ بلکہ قرآن شریف وہی تھا اور ہمیشہ وہی رہا ہے جو ابتدا سے نازل ہوا تھا۔ یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ خود جب نماز جماعت میں قرآن شریف پڑھتے تھے تو آپ بھی ان حروف میں نہ پڑھتے تھے جن میں بعض دوسرے لوگ پڑھ لیتے تھے۔ بلکہ آپ ہمیشہ قرآن شریف کو اسی طرح نمازوں میں پڑھتے رہے جس طرح یہ اصل میں نازل ہو چکا تھا۔ اس نتیجہ کو ان واقعات سے بھی تائید ملتی ہے کہ حضرت ابی اور ابن مسعود اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم جیسے صحابیوں نے جب کسی دوسرے حرف پر قرآن شریف کسی کو پڑھتے سنا تو وہ بہت متعجب ہوئے اور گھبرائے کیونکہ اگر رسول اللہ ﷺ نماز میں ان دوسرے حروف میں کسی پر قرآن شریف پڑھتے تو ان جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم کو جو اکثر پانچوں نمازیں آنحضرت ﷺ کے پیچھے پڑھتے تھے خود اطلاع مل جاتی اور پھر دوسرے لوگوں کو پڑھتے سن کر انہیں تعجب نہ آتا۔ پس آنحضرت ﷺ کے اس فعل سے کہ نمازوں میں آپ قرآن شریف کو اسی طرح پڑھتے رہے جس طرح وہ کلام پاک ابتدا میں نازل ہو چکا تھا۔ یہ ثبوت ملتا ہے کہ دوسرے حروف کی غرض محض ایک خاص غرض تھی اور اس سے اصل عبارت قرآنی میں نہ کوئی کمی بیشی ہوئی اور نہ کوئی تغیر و تبدل ہوا۔

آنحضرت ﷺ کے عمل سے ایک اور شہادت بھی اسی کی مؤید ہمیں ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ قرآن شریف کو جب لکھواتے تھے تو تب بھی اسی نزول کے مطابق لکھواتے تھے۔ جو قرآن کریم کا پہلا اور اصلی نزول تھا اور جو حصص قرآن کریم کے سبعة احرف کی اجازت کے بعد بھی نازل ہوئے تو وہ بھی آپ ﷺ نے لسان قریش کے مطابق ہی لکھائے کیونکہ اصل نزول قرآن شریف کا اسی زبان میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب حضرت زید رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کریم پر مامور کیا تو ان کو یہ ارشاد فرمایا کہ اصلی تحریریں جو آنحضرت ﷺ کے سامنے لکھی گئیں ہیں انہیں اکٹھا کریں۔ کیونکہ وہ مطمئن تھے کہ ان تحریروں میں قرآن شریف کسی دوسرے حرف کے مطابق نہیں لکھا گیا بلکہ جس طرح پر قرآن کریم کو محفوظ رکھنے کا منشا وحی الٰہی کا تھا اسی طرح پر لکھا گیا ہے اور دوسرے حروف کو آپ نے تحریروں میں کوئی دخل نہیں دیا۔ قراء سے تو ایسا ممکن تھا کہ باوجود قریش ہونے کے ان میں سے کسی نے دوسرا حرف کسی موقع پر اختیار کر لیا ہو۔ جیسا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے حال سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر تحریر میں یہ بات ممکن نہ تھی۔ پس ایک طرف تحریر میں قرآن شریف کو اسی طرح محفوظ رکھنا جو اس کا پہلا نزول تھا اور دوسری طرف خود نمازوں میں اسی قراءت کو پڑھنا۔ جو پہلے نزول کے مطابق تھی یعنی لسان قریش میں۔ یہ دو اور نہایت زبردست شہادتیں اس بات پر ہیں کہ مختلف حروف کی اجازت دینے سے آپ کا یہ منشا کبھی نہ تھا اور نہ ہی وحی الٰہی کا یہ منشا تھا کہ وہ دوسری قراءتیں بھی ہمیشہ کے لیے جزو قرآن سمجھی جاویں۔ بلکہ وہ ایک خاص ضرورت تھی اور اصل الفاظ قرآنی وہی تھے جن میں شروع سے یہ پاک کلام نازل ہو رہا تھا۔

❀ قرآن مجید باوجود اختلاف حروف کے ایک ہی تھا اور ایک ہی رہا

اس قدر بحث کے بعد اب ہم اعتراض اول پر غور کرتے ہیں جس کا ذکر شروع مضمون میں کیا گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے جن مختلف حروف یا قراءتوں کی اجازت دی ان کی حقیقت ہم کھول کر بیان کر چکے ہیں کہ یہ صرف ایک وقتی ضرورت کے لیے تھیں اور آنحضرت ﷺ نے کبھی یہ حکم نہیں دیا کہ ان کو تحریر میں لایا جاوے۔ نہ ہی کبھی خود جماعت کراتے وقت ان قراءتوں کو اختیار کیا۔ حالانکہ آپ پر وہ نازل ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں باوجود یکہ قرآن کو سات حروف پر پڑھنے کی اجازت وحی الٰہی سے تھی اور ان سب قراءتوں کو نازل شدہ ہی بیان کیا گیا ہے۔ مگر پھر بھی قرآن شریف کے متعلق عام طور پر یہی کہا جاتا تھا کہ قرآن شریف لسان قریش میں نازل ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا کہ قرآن شریف کو لغت ہذیل میں مت پڑھاؤ۔ کیونکہ قرآن کریم کا نزول لسان قریش پر ہوا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بات سے بخوبی مطلع تھے کہ سات حروف پر قرآن شریف کا نزول تو ہے کیونکہ خود انہی کو حضرت ہشام کے ساتھ اختلاف کا واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ پھر اس کے باوجود یہ لکھنا کہ قرآن شریف لسان قریش میں نازل ہوا ہے اس کو لغت ہذیل میں مت پڑھاؤ کیا معنی رکھتا ہے؟ ہر ایک عقلمند سوچ سکتا ہے کہ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسے ایسے جلیل القدر صحابہ خوب جانتے تھے کہ دیگر حروف میں نزول سے کیا مراد ہے اور یہ کہ وہ ایک خاص وقت اور خاص ضرورت کے لحاظ سے ہے اور اس سے اصل نزول قرآنی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ اسی طرح جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے نسخے بغرض اشاعت بہ بلاد متفرقہ لکھوانے شروع کیے تو آپ نے بھی کاتبوں کو یہی ہدایت دی کہ جب کسی لفظ کے طرز تحریر میں اختلاف ہو (کیونکہ کتابت پر کئی شخص مامور تھے) تو اسے لسان قریش میں لکھا جائے، کیونکہ قرآن شریف لسان قریش میں نازل ہوا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ زید رضی اللہ عنہ مدینہ کے رہنے والے تھے اور ان کی طرز تحریر ممکن تھا کہ کہیں قریش سے اختلاف رکھتی ہو جیسا کہ ان نسخوں کے لکھتے وقت بھی تابوت کی طرز تحریر پر اختلاف ہوا۔ اور آخر اسی طرز پر یہ لفظ لکھا گیا جیسا کہ قریش لکھتے تھے اور فیصلہ کرتے وقت پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہی فرمایا کہ قرآن شریف لسان قریش میں نازل ہوا ہے اور تمام صحابی اس میں ان کے ساتھ متفق تھے۔ کیا یہ گمان ہو سکتا ہے کہ ان تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ پتہ نہ تھا کہ قرآن شریف کا نزول بعض دیگر حروف پر بھی ہوا ہے؟ ہر گز نہیں۔ اصل بات یہ تھی کہ جس طرح آنحضرت ﷺ اس بات کو جانتے تھے کہ دیگر حروف میں قرآن شریف کے کسی لفظ کو پڑھے جانے سے کیا مطلب ہے؟ اور اس کی کیا ضرورت ہے؟ اور اسی لیے آپ نے نہ عام نمازوں میں کسی دوسرے حرف کی قراءت کو اختیار کیا نہ تحریر میں اس کو آنے دیا۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی ان اختلافات حروف کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ قرآن شریف جس طرح دیگر حروف کی اجازت سے پہلے ایک ہی تھا اسی طرح اس اجازت کے بعد بھی ایک ہی رہا اور اس میں کوئی فرق کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ ایک لمحہ کے لیے بھی کسی صحابی نے خیال نہیں کیا کہ دیگر حروف میں قرآن شریف کے نزول سے نزول اول میں، جو لسان قریش میں تھا، کچھ زیادتی ہو گئی ہو یا کچھ تغیر و تبدل ہو گیا ہے۔ پس وہی قرآن شریف آج ہمارے ہاتھوں میں ہے جو دیگر حروف کی اجازت سے پہلے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم پڑھتے اور لکھتے تھے اور جو دیگر حروف کی اجازت کے بعد آنحضرت ﷺ نے نمازوں میں پڑھا اور لکھوایا۔ اسی قرآن شریف کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جمع کرایا اور دوسرے حروف کی کوئی قراءت اس میں درج نہیں کی گئی نہ ہی کسی صحابی نے اس وقت یہ اعتراض کیا۔ پھر اسی سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نقلیں کرائیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ والے صحف میں دوسرے حروف کی کوئی قراءت نہ تھی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ حکم کیوں دیا کہ جب جماعت قریش اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کسی بات میں اختلاف کریں تو اسے لسان قریش میں لکھیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں طرز تحریر کا ذکر ہے نہ قراءت کا۔ چونکہ اول لکھنے والے زید رضی اللہ عنہ تھے اور وہ مدنی تھے قریشی نہ تھے اس لیے اب جو قرآن شریف لکھا گیا جس

کی اشاعت تمام بلاد میں ہونی تھی تو اس میں یہ احتیاط بھی کرلی گئی کہ قرآن کریم کا طرز تحریر بھی بالکل قریشی طرز پر ہو۔ چنانچہ ایک ہی اختلاف جو اس وقت زید بن ثابت اور قریشیوں میں ہوا (وہ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے) لفظ تابوت کے طرز تحریر کے متعلق تھا۔ لفظ تابوت اس سورت میں واقع ہوا ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی اور یہ وہ وقت تھا جب حضرت زید رضی اللہ عنہ کاتب الوحی کا کام کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسے اپنی طرز پر لکھ لیا۔ مکی سورتوں میں کسی ایسے اختلاف طرز تحریر کا ذکر نہیں، کیونکہ وہاں لکھنے والے سب وہی لوگ تھے جو قریش میں سے تھے۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے تمام اصلی تحریریں اکٹھی کی تھیں۔ اس قدر دوبارہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ یہ اختلاف جو لفظ تابوت کے طرز تحریر کے متعلق پیدا ہوا صرف اس قدر تھا کہ یہ لفظ لمبی ت کے ساتھ لکھا جاوے یا گول ۃ کے ساتھ۔ اس سے قراءت کا اختلاف ہر گز ثابت نہیں ہوتا۔

❀ سیدنا عثمان کی کارروائی مطابق منشائے نبی کریم ﷺ اور حفاظت قرآن کے لیے تھی

اب ہم قطعی اور یقینی شہادت کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان ٹکڑوں کو جلانے کا حکم دینے سے، جو بے احتیاطی سے کسی صحابی نے کسی دوسرے حرف پر لکھ لیے ہوں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن شریف کا کوئی حصہ جلایا یا ضائع نہیں کیا۔ اگر انہوں نے اختلافِ حروف کو قطعی طور پر نیست و نابود بھی کر دیا تو بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے قرآن شریف کے ایک حصہ کو ضائع کر دیا، کیونکہ یہ حروف قرآن شریف کا جزو کبھی نہیں تھے اور اس لیے کسی ایسے لفظ کے مروج نہ رہنے سے جو قرآن شریف کا جزو کبھی نہ تھا یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن شریف کا ایک حصہ گم ہو گیا یا تاویل القرآن کے مجنون معترض کی طرح یہ بڑھانکنا کہ قرآن شریف کا ایک بہت بڑا حصہ ساقط ہو گیا اور جو کچھ رہ گیا وہ اس کی یادگار ہے، پرلے درجہ کی نادانی اور حماقت ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کون سی نئی کارروائی کی؟ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ خود آنحضرت ﷺ نے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی کیا تھا۔ اگر دیگر حروف کی قراءتیں قرآن شریف کا جزو تھیں تو آنحضرت ﷺ نے خود یہ حکم کیوں نہ دیا کہ جس طرح کاتب اصل نزول قرآن کریم کو لکھتے ہیں اسی طرح دیگر حروف کی قراءتوں کو لکھیں؟ کیوں نمازوں میں جماعت کراتے وقت کبھی کسی حرف کی قراءت اور کبھی کسی کی قراءت نہ پڑھی؟ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جب تحریری جمع قرآن کا حکم دیا تو کیوں انہوں نے یا کسی صحابی نے یہ تجویز پیش نہ کی کہ ساتوں حروف پر الگ الگ قرآن شریف جمع ہونے چاہئیں۔ یا ساتوں حروف کی قراءتیں ایک ہی مجموعہ میں داخل کی جاویں۔ کیوں اصل تحریریں جمع کرنے کا حکم دیا گیا۔ جس سے یہ غرض تھی کہ مجموعہ صحف میں دیگر حروف کی قراءت داخل نہ ہو جائے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا جاتا ہے تو وہ بھی ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو لکھتے ہیں کہ ہذیل کی لغت پر قرآن شریف لوگوں کو مت پڑھایئے، کیونکہ قرآن شریف لسان قریش میں نازل ہوا ہے۔ پس انہی کے نقش قدم پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چلے اور انہوں نے بھی حروف مختلفہ کی قراءت کو قرآن شریف میں داخل نہ ہونے دیا۔ ہاں ساتھ یہ بھی اہتمام کیا کہ جو ایسے نسخے لوگوں نے خود لکھ لیے تھے، جن میں بعض دیگر حروف کی قراءتیں لکھ لی تھیں یا کوئی اور غلطی ہو گئی تھی کیونکہ کافی احتیاط نہ کی تھی، ان تمام نسخوں کو جلا دینے کا حکم دیا، اور اس طرح کرنے میں بھی انہوں نے آنحضرت ﷺ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منشا کو پورا کیا۔ جو واقعات اس وقت پیش آئے اور جن کی وجہ سے حضرت عثمان نے یہ کارروائی کی وہ تفصیلاً دوسری جگہ بیان ہو چکے ہیں۔ اسلام اس وقت عرب سے باہر دور دراز ملکوں میں پھیل چکا تھا۔ اور بلاد متفرقہ کے لوگ کثرت سے اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور ہو رہے تھے۔ ان لوگوں کو قرآن کریم سکھانا عرب کی اقوام کو ابتدائے اسلام میں قرآن کریم سکھانے سے ایک الگ رنگ رکھتا تھا۔ عرب کے لوگوں کی تو بولی ہی عربی تھی اور ان کے لیے قرآن کریم سیکھنا ایک آسان امر تھا۔ مگر اس آسانی کے ساتھ ابتدا میں ایک مشکل بھی ملی ہوئی تھی اور وہ یہ کہ بعض اقوام کے لہجے الگ تھے اور وہ

لوگ بچپن سے بعض الفاظ کو خاص طرح پر پڑھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اور یکایک اپنے لہجہ اور طرز ادا میں تبدیلی کرنا ان کے لیے سخت مشکل تھی۔ مگر جو عجمی لوگ اسلام میں داخل ہوتے تھے ان کے لیے نہ تو عربوں والی آسانی تھی اور نہ ہی ان جیسی مشکل تھی۔ ان کے لیے قرآن کریم پڑھنے کے لیے عربی زبان کا سیکھنا بھی ضروری تھا۔ مگر اس طرح پر سیکھنے میں ان کے لیے یہ برابر تھا کہ لسان قریش پر پڑھنا سیکھیں یا کسی دوسرے حرف پر۔ اب بعض صحابی جو بعض الفاظ کو کسی دوسرے حرف پر ادا کر لیتے تھے انہی دوسرے حروف پر ان عجمیوں کو بھی قرآن شریف سکھانے لگے۔ اور چونکہ عجمی لوگ اس بات سے تو ناواقف تھے کہ ان اختلافات کی اصل وجہ کیا ہے اور کس ضرورت کے لیے یہ اجازت دی گئی تھی۔ چنانچہ ان کے درمیان قراءتوں پر اختلاف ہونے لگے۔ یہاں تک کہ یہ اختلاف بہت بڑے اور بعض بعض کی تکفیر اسی وجہ پر کرنے لگے۔ یہ وہ حالت تھی جسے دیکھ کر حذیفہ رضی اللہ عنہ گھبرائے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آکر ذکر کیا کہ اختلاف کی کیا حالت ہو گئی ہے اور اس سے کیا کیا بد نتائج پیدا ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا اور یہی قرار پایا کہ جو ایسے نسخے خود لوگوں نے لکھ لیے ہیں، جن میں کہیں دوسرے حرف کی قراءت بھی داخل ہو گئی ہے ان کی اشاعت بند کر دی جاوے تاکہ ان اختلافات کا سرے سے ہی قلع قمع ہو جاوے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود بھی یہ منشا کبھی نہ تھا کہ دوسرے حروف کی قراءتیں ہمیشہ مروج رہیں۔ وہ ایک خاص ضرورت تھی جو اس وقت رفع بھی ہو چکی تھی، کیونکہ ان قوموں کے اسلام پر قریب چودہ پندرہ سال گزر چکے تھے اور وہ اس قابل تھے کہ لسان قریش کے مطابق، جس میں قرآن کریم کا اصل نزول تھا، کلام الٰہی کو پڑھ سکیں۔ اور نئی نسل تو شروع سے جس طرح عادی کی جاوے ہو سکتی تھی۔ سو واقعات پیش آمدہ پر غور کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دیا کہ قرآن شریف کے نسخے بڑی احتیاط کے ساتھ اجلہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی نگرانی میں لکھوائے جائیں اور سوائے صحف ابی بکر رضی اللہ عنہ کے، جس سے نقلیں کرائی گئی تھیں، باقی تمام نسخے جلا دیئے جائیں۔ پس دوسرے نسخوں کے جلانے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اصل غرض قرآن کریم کی حفاظت تھی، تاکہ وہ غلطیاں جن کا بے احتیاطی سے لکھے ہوئے نسخوں میں راہ پا جانا ممکن تھا اور ایسا ہی بعض دوسری قراءتیں جو کسی صحابی نے غلطی سے قرآن کریم کے اندر داخل کر دی ہوں قرآن کریم میں نہ مل جائیں۔ پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فعل حفاظت قرآن کریم میں ممد تھا۔ جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر حروف کی قراءتوں کو قرآن کریم کے اندر داخل کرنے اور لکھنے کا حکم دیا تھا اس وقت تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فعل پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

❀ ایک ہی قرآن پر سب کا اتفاق

اب ہم دوسرے اعتراض کو لیتے ہیں۔ اس اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض قراءتیں جو مفسرین اپنی تفسیروں میں لکھتے ہیں ان کی موجودگی میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اصل الفاظ قرآن کریم کے کون سے ہیں اور دوسری قراءتیں کون سی۔ قبل اس کے کہ ان قراءتوں کی اصلیت پر بحث کی جاوے ایک فیصلہ کن امر ایسا موجود ہے کہ جس سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ قرآن شریف جو بین الدفتین موجود ہے وہی کتاب پاک ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے درمیان چھوڑی۔ اور وہ یہ ہے کہ اتنی وسیع اسلامی دنیا میں اس قدر طویل عرصہ کے درمیان ہر ایک قسم کے اختلاف کے باوجود، یہی ایک ہی قرآن کریم موجود رہا اور موجود ہے اور کوئی نسخہ قرآن شریف کا ایسا نہیں دکھایا جا سکتا جو اس کے ساتھ کسی حرکت یا حرف یا لفظ کا اختلاف رکھتا ہو۔ اور نہ ہی مزعومہ قراءتوں میں سے کوئی قراءت بجائے اصل الفاظ کے کبھی قرآن شریف میں لکھی گئی ہے۔ ایک بھی نسخہ قرآن شریف کا ایسا نہیں دکھایا جا سکتا جس میں اس قرآن کریم کے، جو ہمارے ہاتھوں میں ہے، کسی لفظ کو چھوڑ کر کوئی دوسری قراءت اس کی بجائے لکھ دی گئی ہو۔ کیا یہ اس بات کی کافی شہادت نہیں ہے کہ قرآن شریف محفوظ اور بلا تغیر و تبدل چلا آیا ہے؟ غور کریں کہ تیرہ سو سال کا عرصہ ایک کتاب پر گزرتا ہے اور اس کے بعض نسخے تو مشرق میں پائے جاتے ہیں اور بعض مغرب میں۔ ایسے ایسے ممالک میں جن میں باہمی کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر ایسی ایسی مسلمان اقوام

کے اندر اس کے نسخے پائے جاتے ہیں جن کو بچھڑے ہوئے ایک عرصہ بعید گزر گیا ہے۔ پھر ان کے درمیان کسی قسم کے تعلقات موجود نہیں رہے۔ اور پھر ایسے ایسے مسلمان فرقوں کے ہاتھوں میں اس کے نسخے موجود ہیں جو ایک دوسرے کی جان کے دشمن رہے ہیں مگر باوجود اختلاف زمانہ، اختلاف ممالک، اختلاف زبان اور اختلاف فرقہ کے قرآن شریف ایک ہی رہا ہے۔ خارجی شیعہ کی جان کا دشمن، شیعہ خارجی کی جان کا دشمن۔ باتیں تو ایک شخص کا اختیار ہے جتنی چاہے بنالے، مگر کیا قرآن کا کوئی بھی نسخہ ایسا ہے جو اس قرآن کریم سے اختلاف رکھتا ہو جو ہمارے ہاتھوں میں ہے؟ اب غور کرو کہ اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ دوسری قراءتوں کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ کوئی بڑا آدمی قرآن شریف کے بعض الفاظ کو دوسری طرح بھی پڑھ لیا کرتا تھا۔ ان روایتوں کو صحیح تسلیم کر کے بھی یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ قراءتیں امر واقع میں کلام الٰہی میں تھیں یا قرآن شریف کا جزو تھیں۔ نہیں بلکہ اس سے اس قدر نتیجہ بھی نہیں نکلتا کہ جو لوگ ان قراءتوں کو پڑھتے تھے وہ درحقیقت انہیں قرآن کریم کا جزو سمجھتے تھے۔ یا یہ کہ جس لفظ کی بجائے وہ کوئی دوسری قراءت اختیار کرتے تھے۔ اس لفظ کو کلام الٰہی کا جزو نہ مانتے تھے اور اس کی بجائے اپنی قراءت کو قرآن شریف کے اصل لفظ مانتے تھے۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ اگر درحقیقت وہ اپنی قراءتوں کو ایسا سمجھتے تھے تو پھر کون شخص مانع تھا کہ وہ اپنے نسخہ جات قرآن میں انہی قراءتوں کو لکھ بھی لیتے اور جو الفاظ اصل نسخوں میں موجود تھے ان کو نکال ڈالتے اور اس طرح سینکڑوں متفرق نسخے قرآن شریف کے تیار ہو جاتے جن کی اشاعت ہو کر آج اگر ایک اسلامی شہر میں ایک نسخہ ملتا تو دوسرے میں کوئی اور ہی نسخہ ملتا۔ مگر چونکہ ایسے نسخوں کا وجود دنیا میں نہیں پایا جاتا۔ معلوم ہوا کہ ایسا اختلافی نسخہ کبھی کوئی موجود ہی نہ تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کو اسلامی حکومت کا ڈر تھا اس لیے وہ ان قراءتوں کو نہ لکھ سکتے تھے اور نہ کسی لفظ میں تغیر و تبدل کر سکتے تھے تو یہ جھوٹ ثابت ہوگا کیونکہ جب وہ کھلے طور سے دوسری قراءتوں کو پڑھ لیتے تھے اور اس وقت حکومت کا ڈر نہ تھا تو لکھتے وقت کہاں سے ڈر آگیا۔ بلکہ پڑھنے سے تو زیادہ تشہیر ہوتی تھی۔ اور نسخہ میں لکھا ہونے سے سوائے چند رازداروں کے اور کسی کو اطلاع نہ ہو سکتی تھی۔ پس یا تو یہ بھی جھوٹ ہے کہ وہ دوسری قراءتوں کو پڑھتے تھے اور اعتراض دور ہو گیا۔ یا اگر یہ صحیح ہے کہ وہ پڑھ لیتے تھے تو معلوم ہوا کہ ان قراءتوں کو اس قدر وقعت نہ دیتے تھے کہ انہیں جزو قرآن کریم خیال کرتے ہوں۔ اور اسی وجہ سے ان کو تحریر کے اندر نہ لاتے تھے اور نہ قرآن کریم کے نسخوں میں، جو ان کے پاس تھے، کوئی تغیر و تبدل کرتے تھے۔ بہر حال معلوم ہوا کہ قراءت کے اختلاف سے خواہ اس کی کچھ حقیقت ہو یہ مراد لینا کہ قرآن شریف کی اصل عبارتیں محفوظ نہیں رہیں اور بعض لوگ ایک لفظ کو قرآن کریم کا جزو سمجھتے ہیں تو بعض دوسرے کو، بالکل غلط خیال ہے۔ بلکہ ایسا خیال کرنا سراسر نادانی ہے۔

❀ دوسری قراءتوں سے مراد

اب قراءتوں کی اصل حقیقت پر ہم غور کرتے ہیں۔ اس بات کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ جن قراءتوں کا ذکر بعض روایتوں اور تفاسیر میں پایا جاتا ہے وہ اور سبعة احرف والی قراءتیں ایک نہیں۔ اگرچہ ان میں کوئی سبعة احرف والی قراءت موجود ہو۔ مگر دونوں کو بعینہٖ ایک سمجھنا اور سبعة احرف سے مشہور سات قراءتیں مراد لینا سخت غلطی ہے اور اس غلطی کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک تو حرف لفظ قراءت کی جگہ مستعمل ہونے لگا۔ اور دوسرے قراءتوں کی تعداد بھی سات ہی مشہور ہو گئی۔ اور یہی تعداد احرف کی تھی جس کا ذکر حدیث میں تھا۔ اس لیے بعض لوگوں نے کم فہمی سے سبعة احرف اور سات قراءتوں کو ایک سمجھ لیا۔ موجودہ قراءتوں کو جہاں تک میں سمجھتا ہوں مفصلہ ذیل عنوانوں کے نیچے رکھا جا سکتا ہے:

اول وہ قراءتیں جو سبعة احرف سے پیدا ہوئیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو منع فرمایا وہ صرف یہ تھا کہ دیگر حروف کی قراءتوں کو

قرآن شریف میں نہ لکھا جائے۔ لیکن بعد میں اگر کسی شخص نے ان کو پڑھ لیا ہو تو ایسا ممکن تھا اور خصوصاً احادیث میں ان کا تذکرہ رہ گیا۔ لیکن موجودہ قراءتوں میں سے سبعۃ احرف والی قراءتوں کو الگ کرنا مشکل کام ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔ بعض لوگوں نے یہ قاعدہ تجویز کیا ہے کہ جو قراءتیں اپنے طرز تحریر میں قرآن شریف سے نہیں ملتیں وہ سبعۃ احرف والی قراءتیں ہیں۔ مگر یہ محض اٹکل ہے اور اس کی شہادت یا ثبوت ہمارے پاس نہیں۔ اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ان قراءتوں کی اجازت ایک وقتی ضرورت کے لیے تھی اور ان کا پڑھنا یا جاننا کسی مسلمان کے لیے ضروری نہ تھا اور نہ اب ضروری ہے۔ پس ہمیں ان تحقیقات کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

دوم بعض اس قسم کے اختلاف جیسے واؤں کی گنتی میں جو نہایت خفیف اختلاف ہے۔

سوم ایسا ہو سکتا ہے کہ اختلاف محاورہ کی ضرورت کے علاوہ بعض جگہ وحی الٰہی سے کسی دوسری قراءت کی اجازت بھی دے دی گئی ہو۔ اصل عبارت تو اسی وقت لکھی گئی اور محفوظ رہی اور آج تک اسی طرح مصاحف میں لکھی جاتی ہے۔ اور ایسی قراءت ایک وقت کے لیے کسی نے پڑھ لی یا پڑھا دی، کیونکہ یہ بھی محض اجازت تھی اور اس کا قرآن شریف میں پڑھنا لازمی نہ تھا بلکہ رخصت کے طور پر تھا۔ مگر ایسی قراءت کی صحت اس وقت تک تسلیم نہیں کی جا سکتی جب تک اعلیٰ درجہ کی معتبر اور صحیح احادیث سے ثبوت نہ ملے اور اگر ایسا ثبوت مل جائے تو اس سے بعض وقت بعض الفاظ کے معنوں پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ یعنی دوسری قراءت کو ایک لفظ کے معنی کے لیے بطور تشریح کے سمجھا جا سکتا ہے۔

چہارم بعض قراءتیں اس طرح پیدا ہو گئیں کہ ایک لفظ کی تشریح یا تفسیر کو قراءت سمجھ لیا گیا۔ مثلاً: ایک صحابی نے قرآن شریف پڑھتے وقت ایک لفظ کی کسی دوسرے لفظ سے تشریح کر دی یا اپنے نسخہ قرآن میں کسی لفظ کے معنی کو حاشیہ پر لکھ دیا تو سننے والے یا دیکھنے والوں نے اسے بھی ایک قراءت سمجھ لیا۔ ایسی غلطیوں کے ازالہ کے لیے حضرت ابو بکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو کوششیں کیں وہ کافی سے زیادہ تھیں اور کوئی ایسی غلط فہمی قرآن میں راہ نہیں پا سکی۔

❀ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد کی قراءتیں

سب سے آخر اب ہم ان قراءتوں کا ذکر کرتے ہیں جو تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ ان قراءتوں کے پیدا ہونے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف لکھوا کر مختلف دیار و امصار میں بھجوائے تو ایسے مصاحف نقطوں اور اعراب سے خالی تھے۔ اس لیے مختلف مقامات میں بعض الفاظ مختلف طور پر پڑھے جانے لگے۔ اگر اس اختلاف قراءت کے یہ معنی لیے جاویں کہ ہر ایک شخص ایک خاص طرز پر پڑھتا تھا اور اسی کو صحیح اور قرآن شریف کی اصل قراءت سمجھتا تھا اور اپنے شاگردوں کو اسی طرح پڑھاتا تھا۔ اور ایک دوسرا شخص اس کے برخلاف پڑھتا اور پڑھاتا تھا۔ تو یہ دعویٰ دو طرح سے باطل ثابت ہوتا ہے۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر قرآن شریف کو فی الواقع مختلف بلاد میں مختلف قاری مختلف طرز پر پڑھتے اور پڑھاتے تھے، اور ہر جگہ وہی قراءت صحیح سمجھی جاتی تھی اور دوسروں کی قراءت کو غلط سمجھا جاتا تھا تو پھر کیا وجہ ہوئی کہ ایسی قراءت نے قرآن شریف کی اصلی قراءت کو بدل نہ دیا۔ اور اصل کی بجائے وہی قراءت مروج نہ ہو گئی؟ یعنی کیوں ایسی قراءتیں قرآن شریف کے نسخوں میں لکھ نہ لی گئیں؟ قراءتوں کے پیدا ہونے کا وقت تو وہ بتایا جاتا ہے جب زبر، زیر اور نقطے قرآن شریف کے الفاظ پر موجود تھے، کیونکہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں ان قراءتوں کا نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ بلکہ یہ قراء کی جماعت بعد میں پیدا ہوئی۔ اب یہ عجیب بات ہے کہ جو نسخے قرآن شریف کے لکھے ہوئے ایسے مقامات پر موجود تھے وہ کچھ اور تھے اور یہ قاری کسی اور طرح پڑھاتے تھے۔ ایک سمجھدار انسان ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو مان نہیں سکتا کہ ایک

مقام پر عام رواج تو کسی اور قراءت کا ہو اور قرآن شریف میں جو وہاں عام طور پر شائع ہو رہا ہو کوئی اور قراءت موجود ہو۔ یعنی قرآن شریف میں لکھا ہوا کچھ ہو اور پڑھایا کچھ جاتا ہوں۔ مثلاً: سوال یہ ہے کہ جب یہ لوگ بچوں کو قرآن شریف پڑھانا شروع کرتے تھے تو کون سے نسخے ان کے سامنے کھول کر رکھتے تھے۔ تاریخ بلند آواز سے شہادت دے رہی ہے کہ قرآن شریف کا کوئی نسخہ کسی اور قراءت والا مسلمانوں میں کسی مقام پر بھی رائج نہیں ہوا۔ پس اگر پڑھانے کے لیے وہی قرآن شریف تھا جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے اور اسی کے مطابق پڑھایا جاتا تھا تو دوسری قراءتوں کی کیا وقعت رہی اور وہ کیا کام دیتی تھیں؟ اگر یہ کہو کہ پڑھاتے وقت کوئی اور قراءت اختیار کی جاتی تھی تو کوئی عقلمند انسان اس بات کو باور نہیں کر سکتا کہ بچے کے سامنے لکھی ہوئی عبارت تو کچھ اور ہو اور اس کو پڑھایا کچھ اور جاتا ہو۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ دوسری قراءتوں کے مطابق ہی قرآن شریف لکھا بھی جاتا تھا تو ہم کہتے ہیں کہ اس کا ثبوت تاریخ سے دو کہ کبھی اختلاف والے نسخے قرآن شریف کے مروج تھے۔ اور ان نسخوں کو دکھانا بھی چاہیے کہ آخر وہ کیا ہوئے۔ سینکڑوں برسوں کے پرانے نسخے جس قدر ملتے ہیں وہ تو وہی ہیں جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔ اگر ایسے کوئی نسخے ہر مقام پر الگ الگ رکھے ہوئے موجود تھے تو بتاؤ کہ ان کو کس نے جلایا اور کس طرح ساری اسلامی دنیا سے اور سارے اسلامی فرقوں سے یکایک نابود ہو گئے؟ پس ثابت ہوا کہ دوسری قراءتوں کو اگر کبھی کسی نے پڑھا بھی تو اس نے خود بھی ان کو اس قدر وقعت نہیں دی کہ وہی قراءتیں دوسروں کو بھی پڑھاتا اور ان کو رواج دیتا، یا اس قابل سمجھا کہ وہ لکھی جائیں تاکہ آئندہ نسلوں تک پہنچ سکیں۔

دوسری دلیل جو اس خیال کو باطل ٹھہراتی ہے یہ ہے کہ اگر مختلف مقامات میں مختلف قراءتیں پڑھی اور پڑھائی جاتی تو کم از کم اتنا تو ہوتا کہ پڑھنے میں ہی یہ قراءتیں ایسا رواج پا جاتیں کہ ایسے مقام پر نسلاً بعد نسل یہی قراءتیں اختیار کر لی جاتیں، کیونکہ جیسا کہ کہا جاتا ہے ان قراءتوں کو یا ان میں سے بعض کو اختیار کرنے والے بڑے بڑے آدمی تھی۔ پس دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو ان لوگوں نے جو قراءتیں مشہور کیں ان میں سے کسی کو مسلمانوں نے عام طور پر اختیار نہیں کیا۔ اس صورت میں یہ قراءتیں کچھ وقعت نہیں رکھتیں، کیونکہ نہ صرف وہ تحریر کے مخالف ہی پائی گئیں بلکہ جمہور نے بھی ان کو قبول نہیں کیا۔ اور یا جمہور نے ان کو صحیح تسلیم کر کے اختیار کر لیا، مگر یہ اس وجہ سے باطل ٹھہرتا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو اب بھی ضرور اسی اختلاف قراءت میں باقی رہے ہوتے، مگر ایس کچھ نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح ایک ہی قرآن شریف تحریر میں موجود ہے اسی طرح ایک ہی قرآن شریف حافظوں میں موجود ہے۔ اور اگر تجربتاً ایک قرآن مجید پڑھنے والا اسلامی دنیا کے ایک سرے سے اور ایک دوسرے سرے سے لیا جاوے تو معلوم ہو گا کہ دونوں ایک ہی طرح پڑھتے ہیں اور ان کی قراءتوں میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس سے ہم یقیناً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ پہلے بھی کبھی کسی زمانہ میں قرآن شریف کے پڑھنے میں قراءتوں کا اس طرح اختلاف نہیں ہوا، جس طرح کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی اختلاف ہوتا تو چاہیے تھا کہ اس کا دائرہ دن بدن وسیع ہوتا چلا جاتا۔ نہ ہی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک زمانہ تک ایسے اختلاف رہے اور پھر یکایک وہ سب کے سب خود ہی رفع ہو گئے۔ اسلام ایک خاص دائرہ کے اندر محدود نہیں رہا بلکہ دور دور ملکوں میں پھیل گیا تھا اور کوئی انسانی طاقت ایسی نہ تھی جو کافہ مسلمین کو باوجود اختلاف کے ایک ہی قراءت پر جمع کر دیتی۔ ہاں ایک طاقت تھی اور وہ وہی تھی جس نے پہلے ہی یہ فرمایا تھا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾ [الحجر: 9] پس جس طاقت کی طرف سے پہلے یہ لفظ بولے گئے تھے اسی طاقت نے وہ کام بھی کر دکھایا جو انسانی طاقتوں سے ممکن نہ تھا۔

❀ نقطوں اور حرکات کا وجود حافظہ میں

اب ہم اصل بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس بات کو فرض کر کے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو مصحف لکھوائے تھے ان پر نقطے اور حرکات نہ تھے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آیا نقاط اور حرکات کے نہ ہونے سے اختلاف قراءت کا پیدا ہونا ممکن تھا۔ یہ ثابت ہو چکا

ہے کہ شروع سے حفاظت قرآن کریم کے دو سامان آنحضرت ﷺ نے اختیار کیے اور یہی دو سامان آپ کے بعد بھی ہر وقت اور ہر زمانے میں اپنا کام کرتے چلے آئے۔ ایک قرآن کریم کے ہر لفظ کا ضبطِ تحریر میں لایا جانا اور دوسرا اس کا سینوں میں محفوظ کیا جانا۔ یعنی تحریر اور حافظہ میں۔ جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جمع قرآن کا کام کیا گیا تو اس وقت بھی اس دوہری شہادت سے کام لیا گیا۔ اور جس طرح قرآن کریم کے لکھے ہوئے نسخے دن بدن پھیلتے چلے جاتے تھے اسی طرح، بلکہ اس سے بھی زیادہ کثرت کے ساتھ قرآن شریف کے حفظ کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں قرآن شریف کے ہزاروں حافظ موجود تھے۔ جن میں سے بعض تو وہ تھے جو آنحضرت ﷺ کی زندگی میں قرآن کریم کو حفظ کر چکے تھے اور بعض وہ تھے جنہوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے سیکھ کر حفظ کیا۔ اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب لکھے ہوئے نسخے باہر بھیجے تو یہ نسخے بھی حافظہ کی شہادت کو ساتھ رکھتے تھے، کیونکہ قرآن کریم کے حافظ اسلامی دنیا میں ہر جگہ موجود تھے۔ پس بالفرض اگر ان نسخوں پر نقطے اور حرکتیں نہ بھی تھیں تو اس سے کوئی حرج لازم نہیں آتا، کیونکہ قرآن کریم کی حفاظت جیسی تحریر میں تھی اسی طرح حافظہ میں بھی تھی۔ اگر کسی جگہ قرآن شریف کا لکھا ہوا ایک نسخہ پہنچا تو ہزاروں حافظ بھی موجود تھے اور حفاظت کے ان دونوں سامانوں کے ہوتے ہوئے کسی تغیر و تبدل کا واقع ہونا ناممکن تھا۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جیسا کہ فتح الباری میں لکھا ہے کہ ابتدائی زمانۂ اسلام میں قراءتوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور بہت بڑی تعداد قراءتوں کی بعد میں پیدا ہو گئی۔ ان قراءتوں کا بعینہ وہی حال ہے جو حدیثوں کا ہے، یعنی دن بدن ان کی کثرت ہوتی چلی گئی۔ امام بخاری نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے دو اڑھائی ہزار احادیث کو لیا۔ اسی نسبت سے قراءتوں کو جانچ لینا چاہیے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے درمیان قراءت کی روایت کرنے والے بہت ہی کم لوگ پائے جاتے ہیں۔ مگر بعد میں ایک ایسی قوم پیدا ہو گئی جنہوں نے قراءت کو اپنا پیشہ بنالیا اور بہت سی قراءتیں جاننے کو فخر سمجھا۔ اسی سے قراءت کی کثرت شروع ہوئی۔ اس لیے کسی قراءت کو قبول کرنے کے لیے اعلیٰ درجہ کی معتبر اور یقینی شہادت چاہیے۔ صرف مفسرین کے اقوال یا بعض قراء کے اقوال سے ایسی معتبر اور یقینی شہادت نہیں ملتی۔ بلکہ صحیح احادیث سے ہی صرف ایسی شہادت مل سکتی ہے۔ مگر یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کسی قراءت کو صحیح حدیث سے کسی صحابی تک پہنچا دیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ قراءت واقعی قرآن شریف میں بھی داخل ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان جو کچھ اختلاف مختلف حروف کی قراءت کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اس کی حقیقت ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس ساری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔ بلکہ جس طرح اس کلام پاک کو خدا نے اتارا اسی طرح آنحضرت ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اور ان مقدس بزرگوں نے بعد کی نسلوں کو پہنچایا۔ اور بلاشک وشبہ اس کا ایک ایک حرف بغیر کسی کمی زیادتی یا تغیر و تبدل کے وہی ہے جو آنحضرت ﷺ نے سکھایا تھا۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جس صورت میں مختلف قراءتوں کا کسی زمانہ میں بھی رائج ہونا ثابت نہیں تو آخر ان قراءتوں سے مراد کیا ہے۔ سو جہاں تک میں نے غور کیا ہے بات صرف اس قدر معلوم ہوتی ہے کہ جہاں معنوں میں کوئی اہم تغیر پیدا ہونے کے بغیر ایک لفظ کسی اور طرح پر بھی پڑھا جا سکتا تھا اسی کو قراءت کہہ دیا گیا ہے۔ نہ کہنے والے کا یہ منشا تھا کہ وہ لفظ اس طرح نازل نہیں ہوا۔ جس طرح قرآن میں لکھا ہوا موجود ہے۔ اور نہ ہی کبھی یہ مطلب تھا کہ وہ لفظ دونوں طرح پر نازل ہوا ہے۔ اسلامی دنیا میں کسی شخص نے ایک لمحہ کے لیے بھی کسی قراءت کو یہ وقعت نہیں دی کہ قرآن کریم کے اصل لفظ کو نکال کر وہ قراءت داخل کر دیتا۔ مثال سے یہ بات اور بھی واضح ہو سکتی ہے۔ فاتحہ جیسی سورت جسے آنحضرت ﷺ ہر نماز میں کئی دفعہ پڑھتے تھے۔ اس کے اصل الفاظ کے متعلق کب کسی کو کوئی شک پیدا ہو سکتا تھا۔ مگر اس سورہ میں بھی بعض قراءتیں دی گئی ہیں۔ مثلاً [مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ] میں دو اور قراءتیں [مَلَكِ يَوْمِ الدِّيْنِ] اور [مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ] بتائی جاتی ہیں۔ ان قراءتوں کا مطلب صاف ظاہر ہے، یعنی لفظ کی صورت کو بدلے بغیر دو طرح پر یہ لفظ پڑھا جا سکتا

ہے۔ جس سے معنوں میں بھی کچھ فرق نہیں آتا۔ اب اس کے یہ معنی نہیں کہ کبھی اس بارے میں شک ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ اس لفظ کو کس طرح پڑھتے تھے۔ بلکہ لفظ اور معنی کے تغیر کے بغیر ایک صورت اسی لفظ کے ادا کرنے کی تھی۔ زیادہ سے زیادہ کسی قرات کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی اجازت خود آنحضرت ﷺ نے دی۔ مگر کسی قراءت کو یہ مرتبہ دینے کے لیے مضبوط سے مضبوط شہادت درکار ہے جو اعلیٰ درجہ کی صحیح احادیث پر مبنی ہو۔ اور ایسی قراءت سے، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، قرآن کریم کی اصل عبارتوں کی حفاظت میں کچھ فرق نہیں پڑتا، کیونکہ یہ اختیاری قراءتیں تھیں۔ جن کی اجازت دی گئی اور ان کو واجب نہیں کیا گیا۔

اس تمام بحث سے یہ معلوم ہوا کہ جن معنوں میں اختلاف قراءت کا لفظ عام طور پر بولا جاتا ہے اس مفہوم کی رو سے قرآن کریم میں دراصل کوئی اختلاف قراءت نہیں۔ عام طور پر جب ہم کسی نسخہ یا کتاب کے اختلاف قراءت کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ امر مشتبہ ہے کہ اصل میں اس نسخہ یا کتاب میں فلاں عبارت تھی جو اس میں موجود ہے یا دوسری عبارت میں تھی جو بطور قراءت ثانی پیش کی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں ایسا اشتباہ ہر گز نہیں۔ بلکہ یقین کامل کے ساتھ ہم کہہ سکتے ہیں، جس کے متعلق قطعی شہادت اور بین ثبوت پیش کر دیا گیا ہے، کہ قرآن کریم کی اصل عبارت وہی تھی جو آج بین الدفتین موجود ہے۔ ایسے ہی اختلاف قراءت سے بعض وقت مراد غلطی بھی ہوتی ہے، یعنی مروجہ نسخہ میں کسی طرح سے کوئی غلطی راہ پا گئی ہے یا کوئی نقص رہ گیا ہے۔ چنانچہ بائبل وغیرہ کی کتابوں کے متعلق جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد انہی معنوں میں کوئی معنی ہوتے ہیں جن کا ذکر ہم نے یہاں کیا ہے۔ مگر قرآن کریم کے متعلق اس لفظ کا استعمال ان معنوں میں ہر گز درست نہیں، کیونکہ قرآن کریم کے تمام نسخے جنہیں اسلامی دنیا نے قبول کیا ہے ابتدا سے لے کر آج تک ایسی غلطیوں سے محفوظ رہے ہیں اور تیرہ صدیوں سے ایک ہی نسخہ چلا آتا ہے جس کی حفاظت یقینی دلائل اور روشن شہادت سے ثابت ہے۔